بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
اپریل 2021
www.pklibrary.com
www.pklibrary.com/

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیرِ اعلیٰ محمود ریاض
مدیرہ ـــــ رخسانہ جلیل
مدیرِ منتظم ـــــ آذر ریاض
مدیرِ اعزازی ـــــ امت الصبور
فوٹو ایڈیٹر ـــــ شاہین رشید
اشتہارات ـــــ خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ـــــ نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار، کراچی

واٹس اپ
03172266944

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
MEMBER
APNS
CPNE

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... 840/- روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ .... 18,000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .. 20,500 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

اپریل 2021
جلد 35 شمارہ 08
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - [illegible]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ جمیل

پہلی بات

اپریل کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اپریل کے مہینے میں رمضان المبارک کا مقدس مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ اپنے بندوں کی آخرت اور عاقبت سنوارنے کے لیے انہیں رمضان المبارک کا مہینہ عطا فرماتا ہے۔ اس مہینہ میں ایک نیکی کا ثواب دس سے ستر گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ نفلوں کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر گنا کر دیا جاتا ہے اور روزوں کے اجر کے تو کیا ہی کہنے۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان کو اپنا مہینہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''روزہ میرے لیے ہے اور اس کا اجر میں ہی دوں گا۔''

ماہ صیام درحقیقت تزکیہ نفس اور تربیت کا مہینہ ہے۔ اس ماہ میں ہمارے معمولات زندگی یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں سحر و افطار میں ایک مخصوص نظام الاوقات کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اس سے زندگی میں توازن اور ترتیب آتی ہے۔ عبادات کے خصوصی اہتمام سے روحانی بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا جبکہ ہم عمومی طور پر بسیار خوری کے عادی ہو چکے ہیں۔ تقریبات سے ہٹ کر بھی دسترخوان پر ایک سے زیادہ ڈشیں ہوتی ہیں۔ رمضان المبارک میں یہ عادت اور بڑھ جاتی ہے۔ ساری توجہ افطار اور سحری کے مینیو پر ہوتی ہے جبکہ روزہ کا حقیقی مقصد نفس کو کنٹرول کرنے کی تربیت ہے۔ ماہ رمضان ہمیں بھوکا رکھ کر ہماری روحانی طاقت کو بڑھاتا ہے۔ شکم سیری کے بعد عبادات کا اہتمام مشکل ہو جاتا ہے۔ طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے جہاں تک ممکن ہو، سحر و افطار میں سادہ غذا لیں۔ افطار کا وقت تو خاص طور پر قبولیت دعا کا وقت ہے۔ اس وقت کو صرف زبان کے ذائقہ کے لیے ضائع نہ کیا جائے۔

رمضان المبارک میں ایک رات ایسی ہے جس کی عبادت کا اجر ہزار مہینوں کی عبادات سے زیادہ ہے۔ اس رات میں اللہ تعالیٰ کا سب سے قیمتی تحفہ قرآن پاک نازل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس رات کی قدر و منزلت اور مقام و مرتبے کی بنا پر اسے لیلۃ القدر کہا ہے۔ اس رات میں ایمان و احتساب کے ساتھ اللہ کی عبادت اور استغفار بڑی سعادت ہے۔

رمضان المبارک کے فیوض و برکات بے شمار ہیں جس قدر ممکن ہو سمیٹ لیں۔ یہ مہینہ اور اس مہینہ میں عبادت کی توفیق خوش بختوں کو نصیب ہوتی ہے۔

اس شمارے میں

☆ گل ارباب کا مکمل ناول...... سپنوں کی شہزادی۔

☆ حسنہ حسین کا مکمل ناول...... عسر یسرا۔

☆ سمیرا عثمان گل کا ناولٹ...... دھوپ کے بعد۔

☆ نفیسہ سعید، قرۃ العین خرم ہاشمی، زارا ابجرا، مریم شہزاد اور نصرت یوسف کے افسانے۔

☆ رخسانہ نگار عدنان اور تنزیلہ ریاض کے ناول۔

☆ ڈاکٹر فرح خان...... بندھن۔

☆ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ...... دستک۔

☆ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

حمد و ثنا سے بھی کہیں اعلیٰ ہے تیری ذات
انسان کیا بیان کرے تیری کُل صفات

ہر برگِ گل میں تُو نے سموئی الوہیت
انسان کیسے سمجھے بھلا رنگِ درسیات

تیرا عطا کیا ہوا ہر دکھ بھی اے کریم!
واللہ اہلِ عشق کو ہے جانِ مُحسنات

قطروں میں بحرِ نور مسلسل ہے موجزن
ذروں کے قلب مشعلِ روحِ تجلیات

وہ بحر و بر ہوں، آتش و گل ہوں کہ برق و باد
بخشی سبھی کو تو نے عبادت کی کیفیات

حق بندگی کا کیسے ادا ہو صبیح سے
انساں سے ماورا ہے ترا حسنِ التفات

صبیح رحمانی

درِ نبیؐ پہ جو سب سر جھکائے بیٹھے تھے
اُنہی میں ہم بھی تھے، ہم منہ چھپائے بیٹھے تھے

ہر اک گناہ ہمیں اپنا آ رہا تھا یاد
ندامتوں کے ہم آنسو بہائے بیٹھے تھے

ہماری بد عملی نے ہمیں تباہ کیا
ہم اپنی زیست کا دامن جلائے بیٹھے تھے

کرم کے پھول طلب کر رہی تھی اک خلقت
اور ایک ہم تھے کہ ہم گل کھلائے بیٹھے تھے

ہماری دیدہ دلیری تو دیکھیے، پھر بھی
پئے نگاہِ کرم ہاتھ اٹھائے بیٹھے تھے

مگر وہ در تھا شفیع الوریٰؐ کا درِ اختر
ہم ایک پل میں مقدر بنائے بیٹھے تھے

اختر لکھنوی

بیاض کی پیاس

صلوٰۃ التسبیح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے عباس رضی اللہ عنہ! کیا میں تمہیں ایسی عبادت کے بارے میں بتاؤں کہ جس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے، نئے اور پرانے، قصداً اور سہواً چھوٹے اور بڑے، چھپے اور ظاہر تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ تم روزانہ چار رکعت نماز تسبیح پڑھا کرو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو جمعہ میں ایک بار (سات دنوں میں ایک بار) یہ بھی نہ کر سکتے ہو تو سال میں ایک دفعہ پڑھ لیا کرو۔ اگر یہ بھی نہ کر سکتے ہو تو مہینے میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو اور اگر ایسا بھی نہ کر سکو تو پھر ساری عمر میں کم از کم ایک دفعہ یہ نماز پڑھ لو تو اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہ معاف کر دے گا۔"

فوائد: آج کل کی بے پناہ مصروفیات میں نماز تسبیح کا روزانہ پڑھنا مشکل کام ہے حتیٰ کہ مہینے میں بھی ایک دفعہ اس کا اہتمام کرنے کا موقع شاید چند ہی خوش نصیب لوگوں کو ملتا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تسبیح کی اتنی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اگر اسے سال میں ایک دفعہ بھی ادا کیا جائے تو اس کے بے پناہ اجر و ثواب سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس بابرکت نماز کی ادائیگی کے لیے رمضان المبارک سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہو سکتا۔ ذرا سی توجہ اور کوشش سے رمضان المبارک میں جمعۃ المبارک سے قبل یا اس کے بعد چار رکعت نماز تسبیح با آسانی ادا کی جا سکتی ہے۔ اس طرح بابرکت اور بے پناہ اجر و ثواب کی حامل نماز کا اہتمام ممکن ہے۔

آپ چار رکعت نفل اس طرح ادا کریں کہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی دوسری سورۃ پڑھیں۔ اس کے بعد قیام کی ہی حالت میں کلمہ تمجید پندرہ بار پڑھیں۔

"سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر"

پھر رکوع میں جائیں۔ رکوع کی تسبیحات پڑھیں۔ پھر ان ہی کلمات کو دس بار دہرائیں۔ پھر رکوع سے اٹھ جائیں اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد دس بار یہی کلمات پڑھیں۔

پھر سجدے میں جائیں (سجدے کی تسبیحات اور دعائیں) پڑھنے کے بعد یہی کلمات دس بار پڑھیں۔ پھر سجدہ سے سر اٹھا کر جلسہ میں اور (جلسے کی دعائیں پڑھنے کے بعد) یہی کلمات دس بار پڑھیں۔

پھر دوسرے سجدے میں چلے جائیں اور سجدے کی تسبیح کے بعد دس بار یہی کلمات دہرائیں (پہلے سجدے کی طرح) پھر سجدہ سے سر اٹھائیں اور جلسہ استراحت میں کچھ اور پڑھے بغیر دس بار اس تسبیح کو دہرائیں۔

یوں ایک رکعت میں 75 تسبیحات ہو جائیں گی۔ اس طرح چار رکعت پڑھی جائیں گی۔

تشہد میں تسبیحات التحیات سے پہلے پڑھیں۔

اعتکاف

اعتکاف کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ انسان چند دنوں کے لیے دنیا کی مشغولیات اور مصروفیات سے قطع تعلق کر کے مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار

کرتے ہوئے اس کا رنگ اپنے اوپر چڑھا لے۔
رمضان المبارک کے آخری دس دنوں میں مسجد میں معتکف ہونا مسنون عمل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری زندگی باقاعدگی سے اعتکاف میں بیٹھنے کا اہتمام فرماتے رہے۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔
"جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر کس لیتے، راتوں کو جاگتے، اپنے گھر والوں کو جگاتے اور اتنی محنت کرتے، جتنی کسی اور عشرے میں نہ کرتے۔" (بخاری ومسلم)
"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی۔ پھر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بھی اعتکاف کرتی رہیں۔" (بخاری ومسلم)
فوائد: 1۔ اعتکاف تزکیہ نفس اور تقویٰ اختیار کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ سال کے 365 دنوں میں انسان دنیا کے مسائل اور دیگر مصروفیات میں ڈوبا رہتا ہے۔ اگر ان 365 دنوں میں صرف دس دن اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اپنے سال بھر کے گناہوں اور خطاؤں کی بخشش کے لیے وقف کردیے جائیں تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔
2۔ اعتکاف کے دس دنوں کے لیے الگ سے ایک خصوصی ٹائم ٹیبل ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ جس میں چند گھنٹے آرام کے سوا زیادہ تر وقت تلاوت، مطالعہ قرآن پاک، مطالعہ حدیث، مطالعہ اسلامی کتب، حفظ اور ذکر واذکار اور دیگر عبادات الٰہی میں گزارا جاسکتا ہے۔

شب قدر

رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں ایک رات ایسی ہے جسے ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔
"ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔" (القدر)
یہ مبارک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس رات کی فضیلت کو پانے کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں عبادت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
ایک سال رمضان المبارک آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم لوگوں پر ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا، وہ سارے کے سارے خیر سے محروم رہ گیا۔ اس رات کو خیر وبرکت سے وہی محروم رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔" (ابن ماجہ)
فائدہ: 1۔ چونکہ آخری عشرہ شروع ہونے تک روزہ داروں کی کافی تربیت ہوچکی ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کو سونے سے کندن بنانے کے لیے رمضان المبارک کے آخری عشرے اور بالخصوص طاق راتوں میں لیلۃ القدر تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔
2۔ اس حکم کا مقصد روزہ داروں کو زیادہ سے زیادہ عبادت الٰہی اور ذکر الٰہی کی ترغیب دینا ہے۔ چونکہ رمضان المبارک اپنی بھرپور رفعتوں کے ساتھ اختتام کی جانب بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے قیام اللیل اور اعتکاف کے ذریعے تربیت دینا چاہتا ہے۔
3۔ انسان کی تعلیم وتربیت کے لیے آسان سے مشکل کا اصول ایک کارگر نسخہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں پر یک لخت کوئی بوجھ ڈالنے کے بجائے ان کی تعلیم وتربیت ماہ

رمضان المبارک میں اسی اصول یعنی آسان سے مشکل کے تحت کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے دو عشروں کی نسبت آخری عشرے میں زیادہ ریاضت اور عبادت کی تاکید فرمائی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ......

''میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شب قدر کون سی ہے تو میں اس میں کیا پڑھوں؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللّٰهم انک عفو تحب العفوا فاعف عني''

ترجمہ۔ ''اے اللہ! بے شک تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے، پس تو مجھے معاف کر دے۔''

فائدہ۔ انسان سال کی 365 راتیں سو کر گزارتا ہے۔ اگر ان 365 راتوں میں ایک رات اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر عبادت میں جاگ کر گزاری جائے تو اس کے اجر و ثواب کا وعدہ ہزاروں راتوں کے برابر کیا گیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اس سے بھی بڑھ کر اجر و ثواب دیتا ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

نماز، روزہ اور حج کا تعلق زیادہ تر بدن سے ہے۔ لیکن زکوٰۃ اور صدقات کا براہ راست تعلق مال و دولت سے ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے۔

''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجیے جو کہ اس روز واقع ہو گی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں کو اور ان کی کروٹوں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا یہ ہے وہ مال جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اپنے جمع کرنے کا مزا چکھو۔'' (التوبہ)

اسی طرح ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''تم ہرگز نیکی حاصل نہ کر سکو گے، جب تک وہ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمہیں بہت عزیز ہے۔'' (آل عمران)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے انسانوں میں سب سے زیادہ فیاض اور سخی تھے، لیکن جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت اور فیاضی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فیاضی میں بارش لانے والی ہوا کی مانند ہو جایا کرتے تھے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل

1۔ راہ خدا میں صدقہ و خیرات سے جہاں مال کی پاکیزگی کا فریضہ ادا ہوتا ہے، وہیں اس سے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نعمتیں بارش کی مانند خرچ کرنے والوں پر برستی ہیں بلکہ اس سے معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم اور عدم مساوات کی خلیج کو بھی پاٹنے کا موقع ملتا ہے۔ غریبوں اور ناداروں کی مشکلات میں کمی لانے اور ان کی مالی اعانت کے لیے اللہ تعالیٰ نے معاشرے کے صاحب ثروت اور مال دار افراد پر ان کے مال و دولت کی پاکیزگی کی خاطر سال میں ایک دفعہ زکوٰۃ کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے۔

2۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکیزگی کے ہیں جبکہ شریعت کی رو سے زکوٰۃ مال کے اس حصے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں بتائے ہوئے طریقے یعنی نصاب کے مطابق معاشرے کے صاحب ثروت افراد معاشرے کے غریب، نادار، مساکین اور ضرورت مند افراد میں تقسیم کرتے ہیں۔

3۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے ماہ رمضان المبارک بہترین مہینہ ہے۔ ایک تو اس ماہ مبارک میں کسی بھی فرض اور نفل عبادت کا اجر اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھا کر دیتا ہے اور دوم چونکہ معاشرے کے صاحب ثروت اور مال دار افراد تو اپنی مال داری اور ثروت کی

وجہ سے افطاری میں انواع واقسام کی نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں، لیکن معاشرے کے غریب اور مفلوک الحال افراد جو روزے کی شدت کے باوجود اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے دن بھر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان کو کھانے پینے اور پہننے کی وہ سہولیات نصیب نہیں ہوتیں جو کسی بھی انسان کا بنیادی حق ہیں۔ اس لیے اگر اس ماہ مبارک میں مال دار اور صاحب ثروت افراد معاشرے کے محروم افراد کے دکھوں کا احساس کرتے ہوئے اپنی زکوٰۃ اور صدقات پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کریں تو اس سے معاشرے میں غریب اور بے سہارا افراد کے دکھوں اور غربت کو بانٹنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

رمضان میں خرچ

رمضان المبارک میں خرچ کرنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

"جو شخص اس مہینے میں کسی روزہ دار کو افطار کرائے تو اس کے لیے گناہوں سے مغفرت اور دوزخ کی آگ سے رہائی ہے۔ اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا روزہ دار کو اور اس سے روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے سب کے پاس اتنا سامان تو نہیں ہوتا کہ روزہ دار کو افطار کرائیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس کو بھی عطا کرتا ہے جو ایک گھونٹ دودھ، ایک کھجور اور پانی کے ایک گھونٹ سے کسی روزہ دار کو افطار کرائے گا۔" (بیہقی)

فوائد و مسائل

1۔ اس حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی صاحب حیثیت نہیں ہے اور اس کے پاس کسی کو دینے کے لیے یا کسی کو افطار کرانے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے تو ایک گھونٹ پانی یا ایک گھونٹ دودھ یا ایک کھجور سے بھی کسی مسلمان بھائی کو افطار کرا کے گناہوں کی مغفرت اور جہنم کی آگ سے بچنے کا اہتمام کر سکتا ہے۔

2۔ اسلام صدقات و خیرات کی بھی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک میں ایک ایک دانہ اور ایک پیسہ صدقہ و خیرات کرنے پر کم از کم سات سو گنا اجر کا وعدہ فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جس کو وہ چاہے گا، اس سے بھی زیادہ عطا کرے گا۔

3۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے علاوہ اس ماہ مبارک میں کوشش کرنی چاہیے کہ روزانہ کچھ نہ کچھ مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا جاتا رہے، جس سے مال و دولت میں برکت پیدا ہوگی۔ اس عمل سے جہاں صدقہ و خیرات کرنے والوں میں شکر گزاری اور ایثار و قربانی کا جذبہ فروغ پائے گا، وہاں اس عمل سے غریب اور بے کس انسانوں کی امداد کی راہ بھی ہموار ہوگی۔

4۔ تقویٰ کے حصول کے لیے جہاں بدنی عبادت کی بہت زیادہ تاکید بیان کی گئی ہے، وہاں مالی عبادت یعنی صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ کی بروقت مستحقین کو ادائیگی بھی لازمی شرط ہے۔ اسلام مال اور دولت کو سینت سینت کر جمع کرنے کی ویسے بھی مخالفت کرتا ہے، اس لیے اس مبارک مہینے کے توسط سے زیادہ سے زیادہ مال و دولت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا خصوصی اہتمام کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا باعث بن سکتا ہے۔ زکوٰۃ تقسیم کرتے وقت اس بات کا خصوصی خیال رکھنا چاہیے کہ اس میں کسی غریب اور مستحق کی عزت نفس مجروح نہ ہو، بلکہ انتہائی عاجزی اور خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر مستحق لوگوں کی مدد کرنی چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"صدقہ و خیرات اس طرح کرنا چاہیے کہ اگر

یہ دائیں ہاتھ سے دیا جائے تو بائیں ہاتھ تک کو اس کی خبر نہ ہو۔"

یعنی بڑی راز داری اور خاموشی سے بغیر کوئی احسان جتائے اپنے ضرورت مند مسلمان بھائی کی مدد کرنی چاہیے۔ اسلام میں احسان جتانے کو برا فعل قرار دیا گیا ہے۔

فطرانہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے "صدقۂ فطر کو اس لیے واجب کیا گیا ہے تاکہ روزوں میں روزہ دار سے جو فضول اور بے حیائی کی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں، ان کا کفارہ بنے۔ مساکین و غریبوں کے لیے کھانے، پینے کا انتظام ہو جائے۔ جو اسے نماز عید الفطر سے پہلے ادا کرے تو فطرانہ قبول ہوتا ہے اور جو اسے نماز عید کے بعد ادا کرے تو یہ بھی دوسرے صدقات کی طرح کا ایک صدقہ ہوگا۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل

1۔ جیسا کہ اس حدیث مبارک میں فطرانے کا بنیادی مقصد روزے کی حالت میں سرزد ہونے والی خطاؤں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ یعنی اگر رمضان المبارک میں روزہ دار سے بھول چوک اور بشری کمزوریوں کے باعث ایسی خطائیں سرزد ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے روزے کی قبولیت اور اس کے اجر و ثواب میں کمی کا امکان ہو تو اس کمی کے ازالے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر یا فطرانے کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔

2۔ فطرانہ کی ادائیگی میں غیر ضروری تاخیر سے اجتناب کیجیے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ فطرانہ عید الفطر سے قبل ادا کر دیا جائے بلکہ عید الفطر سے بھی اگر دو چار دن پہلے اپنے حصے کا فطرانہ مستحق افراد میں تقسیم کر دیا جائے تو اس طرح معاشرے کے ضرورت مند اور مستحق افراد کو بھی عید الفطر کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع مل سکے گا۔ مستحقین کو فطرانے کی بروقت ادائیگی سے مستحقین بھی اپنے بال بچوں کے لیے کھانے پینے کی اشیا، کپڑے اور بعض دیگر ضروریات زندگی کی خریداری عید سے قبل ہی کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

3۔ جتنا فطرانہ ایک شخص پر واجب ہے اس کی عدم ادائیگی یا ادائیگی میں ٹال مٹول اور تساہل کا سخت گناہ ہے۔ لہٰذا عدم ادائیگی کا تو تصور ہی محال ہے۔ البتہ اگر کسی کی استطاعت ہو تو واجب الادا فطرانے سے زائد مال بھی معاشرے کے غریب اور مستحق افراد میں تقسیم کر سکتا ہے۔ واجب فطرانے سے زائد صدقہ و خیرات کی ادائیگی سے مال و دولت میں برکت پیدا ہو گی اور اس اخلاص سے اللہ تعالیٰ کی رضا بھی حاصل ہو گی۔

4۔ اسلامی اخوت و محبت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جو انسان عید الفطر کے موقع پر اپنے اہل و عیال اور دیگر عزیز رشتہ داروں کی خوشی کی خاطر خوراک، لباس اور دیگر ضروریات زندگی کے ڈھیر لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اسے چاہیے کہ اپنے معاشرے کے محروم اور غریب و نادار افراد کو بھی اپنی خوشیوں میں یاد رکھے۔

5۔ فطرانے کے واجب ہونے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ معاشرے کے صاحب ثروت افراد کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ جہاں وہ عید الفطر کی خوشیاں اپنے لیے سمیٹنے میں مصروف ہوں وہاں اپنے اردگرد رہائش پذیر ایسے مسلمانوں کو بھی یاد رکھیں جو اپنی غربت اور لاچاری کی وجہ سے اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے بیواؤں، یتامیٰ، غرباء اور مساکین کی معاشی مجبوریوں کا ازالہ کر کے اسلامی معاشرے کو معاشی عدم مساوات کے بھنور میں گرنے سے بچانے کے لیے زکوٰۃ، صدقات اور فطرانے جیسے احکامات نازل کر کے دین اسلام کو رہتی دنیا تک پوری انسانیت کے لیے معاشی لحاظ سے ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

☆

چھانگیا رکھ

مصنف:- بلبیر مادھوپوری
ترجمہ:- اجمل کمال
تبصرہ:- آمنہ زریں

سُنو!

اگر تم ایسی زمین پر بسیرا کرو، جو تمہاری ہونے کے باوجود، تم پر تنگ کردی جائے۔ جہاں تم سانس تو لیتے ہو...... مگر وہ سکھ سے متصادم ہو۔ جہاں تم ہی جیسے دکھنے والے، تمہارا دکھ بن جائیں۔ جہاں تمہارے خال و خد تو انسانوں جیسے ہوں، مگر حال جانوروں سے بدتر...... جہاں موسموں کے قہر سینچنے کے لیے تمہارے پاس سر چھپانے کو چھت اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر نہ ہو۔ جہاں تم پتھر کوٹ کر...... زمین کو تو ہموار راستے میں ڈھال دو...... مگر ناہمواری تم پر مسلط رہے؟

جہاں بیج بونے، ہل چلانے اور فصل کاٹ کر گھروں تک پہنچانے کے لیے تمہارے ہاتھ درکار ہوں...... اور پھر یہی ہاتھ، دھرم بھرشٹ ہوجانے کا خطرہ بن کر...... تمہارے لیے پیالہ بن جائیں؟

جہاں گھر میں پیڑ اگانا، تمہاری تمنا سے حسرت میں ڈھل جائے؟ جہاں زمین کے ٹکڑے کی ملکیت کا خواب تمہاری سانس لیتی زندگی میں یاس گھولتا رہے اور قدم قدم پر...... استبداد تمہارے حق کے مقابل رہے؟

سنو...... یہ دنیا کبھی نغمہ تو کبھی نوحہ بن جاتی ہے۔ مگر یہ داستان، ایک نوحے کو نغمگی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر رکھتی ہے۔ سنو...... اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ اگر تم بھارت کے دلت پیدا نہیں کیے گئے تو اس میں تمہارا کیا کمال ہے؟

تعصب کا بھالا اٹھانے سے پہلے ذرا ٹھہر جاؤ کہ دلت نہ ہونے کا تشکر صرف پاکستانی ہونے سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ تو ان کے لیے بھی ہے جہاں دراصل درجہ بندی کے تحت شودر اور دلت...... اچھوت بنائے جاتے ہیں۔

"بندوں کو جاتوں میں بانٹ کے کفر تو یہ مکار تولتے ہیں۔ بھلا انسانوں کی بھی کوئی جات ہوتی ہے۔ یہ جانوروں پتھروں کو پوجتے ہیں، ہمیں ان سے بھی گئے گزرے سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں، پرے رہو ہم بھشٹ ہوجائیں گے۔ کوئی پوچھنے والا ہووے تمہارے انگ ہم سے زیادہ لگے ہوئے ہیں۔

بھائیے کا پسینہ ابھی نہیں سوکھا تھا اور نہ ختم ہوا تھا۔ ادھر ان باتوں سے میرے دل پر آری سی چلنے لگی۔ میرے مستک میں کئی باتیں یوں سمائیں جیسے پنڈ کے پچھم میں بنے ٹبے کی ریت میں پانی جذب ہوتا دیکھا تھا۔"

"چھانگیا رکھ" بھارتی پنجاب سے تعلق رکھنے والے بلبیر مادھوپوری کی آپ بیتی ہے۔ جو دراصل پنجابی زبان میں لکھی گئی۔ پاکستانی قاری کے لیے اسے اردو کا قالب اجمل کمال نے عطا کیا۔ اور ترجمہ کو اس خوبی سے نبھایا ہے کہ زبان کا لہجہ اور لفظ کی ادائیگی کی خوب صورتی برقرار ہے۔

"چھانگیا رکھ" کی ترکیب اپنے آپ میں محض ایک شکایتی عنوان نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس نموکی داستان ہے جو چھانگ دینے کے باوجود...... زمین سے جڑی جڑوں کو ملتی ہے اور شجر کو پھر سے ہرا بھرا کردینے کا وصف رکھتی ہے۔ مگر ویرانی کے دنوں میں جڑے رہنا

بھی کمال طلب ہے۔ کم سیرابی کے دنوں میں امید سے وابستہ رہنا، مصیبت کے موسم میں یقین کا دیا جلائے رکھنا بھی کب آسان ہے؟

تو چلیے...... مادھو پور کو جانے والی پگڈنڈی پر...... جہاں آپ کا ہاتھ ایک بچے کے ہاتھ میں ہے اور اس پر بیتے ہر لمحے کی روداد آپ کو سننی ہے۔ سہنے کا کام اس نے کر رکھا ہے۔

"پرشاد کے لیے سب کے بعد جب ہماری باری آتی تو وہ جھڑک کے کہتا۔ کم جاتوں، تمہیں ایک بار کہا نہیں کہ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پر ہم کھڑے کھڑے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں کے ننھے ننھے بک (چلو) بنا کر اس کے آگے آگے کرتے۔ وہ جھکے بنا پرشاد ڈالتا تو ہم پھرتی سے اوپر ہی دبوچ لیتے۔ کبھی کبھی کسی کے بک میں پرشاد نہ آتا اور زمین پر گر پڑتا تو وہ روہانسہ ہو جاتا۔ جب وہ زمین پر سے اٹھانے لگتا تو اتنے میں تاڑ میں بیٹھا ڈبو (کتا) اپنی جیبھ سے پرشاد چاٹ جاتا۔ ایسے ہی ایک بار میری گولی (تانبے کی کٹوری) اس وقت ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی جب بھائی، جلدی جلدی زور سے چھڈواں جیبا (ذرا سا) پرشاد اوپر ہی سے ڈال رہا تھا کہ کہیں اس کا ہاتھ کوئی یا ہاتھ کو نہ چھو جائے۔ ایسی گھٹنا ہونے پر میرے چہرے پر خوشی کی چڑھی تہہ ایک دم اتر کے کہیں دور چلی جاتی اور آسانی سے میری طرف جلدی نہ پلٹتی۔"

بچے کا دنیا سے ہونے والا تعارف، اس کے آئندہ رویے کی کنجی بنتا ہے اور معمولی سمجھے جانے والے اس کے احساس پر پڑنے والی ہر ضرب سماج کے ساتھ ساتھ اس کے مستقبل کی صورت گری کرتی ہے۔

کم تر سمجھے جانے کا ادراک، نہایت بچپن سے اپنی راہ بنانے لگا تھا جس پر دنوں کے بڑھتے قدم، ارتقاء کے نقوش کو گہرا کرتے گئے۔

"دھونی کی لپٹوں میں ہم اپنے برف جیسے ٹھنڈے پیر لے جاتے اور پھر اسکول کی طرف دوڑ پڑتے۔ ہم میں سے کسی جنے کے بھی پیروں میں جوتی نہ ہوتی۔ ادھر زمینداروں کے لڑکوں لڑکیوں نے دوہرے سویٹر پہنے ہوتے۔ میں سوچتا "کوئی جنا ایک سویٹر مجھے بھی دے دیوے۔ میں بھی اس کا نگھ (گرمائش) لے کے دیکھوں۔ میرے ان خیالوں کی لڑی تب ہی ٹوٹتی جب میں اور نیانوں کے ساتھ اونچی آواز میں کہتا۔

سورج سورج، پھٹی سکھا
نہیں سکھائی، گھر کو جا

میں سوچتا...... "ہر لحہ تھم سا جاتا ہے۔ اس لمحے کو واپس جا کر بھی گزارنا مشکل لگتا ہے۔

کتاب پڑھتے ہوئے، ایسے کئی لمحے آتے ہیں، جب سناٹے کی سی کیفیت میں اپنے آپ سے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ ایک جھرجھری جو نا شکرے وجود میں آتی ہے۔ ایک طمانچہ...... جو بے حسی کے جمود پر پڑتا ہے۔

"جٹیاں تھوڑا سا جھک کے اوپر سے ہی روٹیاں ایسے ڈالتیں کہ ہم دونوں ہاتھوں کی بنائی چپل پر بڑی جگت سے انہیں سنبھال لیتے۔ دال ساگ کی بھری کڑچھیاں بھی اسی طرح اوپر سے بھانڈوں میں ڈالتیں جن کے گرم چھینٹے کئی بار ہمارے پیروں پر گر جاتے اور پھر ان سے چھوٹے بڑے چھالے پڑ جاتے۔"

ہر عہد ایک داستان ہے اور ہر اگلا پچھلے سے مختلف ہے۔ تحریر اپنے عہد کو سمو دینے کا وصف رکھتی ہے اور آنے والوں پر گزر چکے، کل کو روشن کرتی ہے۔

دیہات کا رہن سہن، رواج، میلے ٹھیلے، گیت، گلیاں، کھیت کھلیان، موسم، پکوان، جوان، بوڑھے خوشی اور غم، منظر کردار، حادثے، قصہ گوئی، مذہبی طریق، سادھو فقیر مزار اور منت نیاز......

ہمارے گھروں میں چولہوں میں رات کو ہی سویرے کے لیے بھوبھل میں آگ دبا دی جاتی تھی۔ جب کبھی یاد بھول جاتی تو ایک دوجے کے گھروں سے مانگ لے آتے۔ تیلی کی ڈبیاں سوچ سمجھ کے

ہی برتتے۔ جاڑوں کی گھنی دھند میں ہم چولہے کے
پاس بیٹھے رہتے اور سوکھے پتوں کی گچھیاں بنا بنا کے
چولہے میں جھونکتے جاتے۔"

"ان کھڈیوں پہ فوج کے لیے تولیے بنے جاتے۔
لہریا بنا جاتا۔ سلک گیلن کا ایک سو دس گز کا تانا اور تیس تیس
گز کا تھان ہوتا۔ جب سلکی تانے کی کھڈی اور کھنڈے کے
بیچ میں کچھ جھول پڑ جاتا تو بھائیاں منہ میں پانی بھر کر چھڑکاؤ
کرتا۔ میں اپنے جیسی چھوٹی سی ہنسی ہنستا۔"

پیپل کی چوٹی کے ٹہنیوں پر مور شام صبح بیٹھتے اور
"ایواں" کی آوازیں نکالتے۔ پھر وہاں سے اٹھ کے
ہمارے گھروں کی چھتوں پہ اترنے لگتے۔ ہم چوگا ڈالتے،
وہ ہم سے زیادہ نہ ڈرتے۔ کوے بوہڑ کی گوہلوں کو ٹھونگے
مارتے۔ چڑیاں بار بار اڑتیں اور پھر آ بیٹھتیں۔"

دھیان اور ادراک کے حساس ارتکاز نے
نہایت بچپن کے آئینے پر منعکس ہوتی ہر شبیہہ کو تصویر
کردیا ہے۔ تب دھیان کو تقسیم کرنے والی چیزیں
ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اسی غیر معمولی توجہ میں سنی گئی ہر
بات اور اس بات پر دل میں پیدا ہونے والے ہر
سوال کو یاد رکھنے کے وصف نے ہر منظر اور واقعے کو
اس تفصیل سے مرتب کیا کہ آج ہر پڑھنے والی نظر،
تصویر کو ہر رنگ اور رخ کے ساتھ دیکھ سکتی ہے۔

اسی دوران مجھے اندھے سادھو غریب داس کا خیال
آیا جو گرمیوں میں بوہڑ تلے پورن بھگت، لولان، رانا رانی
اور دھود کا قصہ سنایا کرتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے تونبا اور
دوجے ہاتھ میں پڑی کھڑتالیں بجاتا جاتا۔ بیچ بیچ میں قصے
کی تفصیل بتاتا جاتا۔ رہ رہ کے حقے کا کش بھی بھر لیتا۔ اس
کی لمبی، بھرواں ڈاڑھی مونچھیں دھواں سی ہو کے لاکھے رنگ
کی ہوگئی تھیں اور اس کے گیروے رنگ کے چولے سے ان
کے گڈمڈ ہوجانے کا گمان ہوتا تھا۔

ایک بار میں بھائیے سے پوچھا۔ "ہمارے پنڈ
میں تایا گیانو اور اس کا بھائیا نتھا سنگھ جو ہیں......"

"وہ ہندو نائی ہیں، ہمارے بال نہیں مونڈتے۔"

بھائیا یہ کہہ کے کسی اور کام میں لگ گیا۔ بات زیادہ
میرے پلے نہ پڑی۔ پر تائے گیانو کو میں نے کئی بار
جٹوں کے جانوروں کی پونچھیں مونڈتے دیکھا تھا۔

تعصب کی پرورش اور دلیل کی موت باہم
مربوط ہیں اور ہمارا خطہ ان کے لیے سازگار حالات
فراہم کرتا ہے۔ ان گھڑ اور من گھڑت دلیل کا تعلق کسی
مخصوص مذہب، فرقے یا گروہ سے نہیں...... بلکہ کہنا
چاہیے کہ یہی ہیں جن کا کوئی فرقہ، کوئی مذہب، کوئی
گروہ نہیں۔ نہ ان کی حد ہے نہ سرحد...... بس ان کی
جڑیں ہیں جو باہم گتھی ہوئی اور پیوست ہیں۔

ہندوستانی سماج میں سوال اٹھانے کا کلچر موجود رہا
ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اس کا رجحان صحت مند
نہیں رہا۔ لوگوں کی آسانی کے لیے ان کے من پسند
میڈیم کو ذریعہ اختیار کرنے کی مثال "پی کے" ہے۔
سوال اٹھانے سے کیا اثرات مرتب ہوئے، کیا فائدہ ملا
سے قطع نظر...... بات تو یہ ہے کہ سوال اٹھانے کے
موقعے کی موجودگی اور فراہمی ثابت ہوئی۔

اس کتاب میں بھی سوال اور دلیل کی دستک
موجود ہے۔

"باہمنوں کے رچے پرپنچ (فراڈ) پر کون اعتبار
کرے۔ کہتے، بالمیکی نے کش کو تنکے سے پیدا
کردیا۔ انجلی کے کان میں ماری پھونک سے ہنومان
پیدا ہوگیا۔ اشٹ بجی (آٹھ باہنوں والی) جنانی آج
تک دھرتی پر ہوئی نہیں اور چار ٹانگوں والی جنانی ہوتی
تو میں پھر بھی مان لیتا کہ ہنومان کی طرح وہ کان میں
پھونک مارنے سے جن پڑے ہوں گے۔ اب تو مجھے
بتا کہ ہمارے گڈو، برجو کیسے جمے تھے؟

سو، قدرت کے برخلاف کوئی بندہ کام نہیں
کرسکتا۔ آئی سمجھ؟"

مجھے لگا کہ بھائیا گھاس کا گٹھڑ کھولنے کے ساتھ
ساتھ کئی بھیدوں پہ اپنی دلیلوں کے گٹھڑوں کی بھی
گانٹھیں کھول رہا ہو۔

"تجھے کیا پتا، ان کی چور چالاکیوں کا لہوری رام
بالی نے بھوگ پور آدم پور کے جلسوں میں بتایا تھا کہ
سارے باہمن پہلے گایوں بچھیوں کا ماس کھایا کرتے
تھے۔ کہتے تھے کہ ہندوؤں کے گرنتھوں میں لکھا ہوا ہے

کہ شرادھ پہ باہمن کو گائے کا ماس کھلانے کا زیادہ پن ہے۔ بھائیا سنی ہوئی باتوں کو سنا تا کسی گیانی سے کم نہ لگتا تھا۔ اس نے تھوڑا سا ہنس کے پھر کہا اور سن لے، کہتے تھے کہ گرنتھوں میں یہ بھی لکھا ہے، شرادھ میں جو آدمی ماس نہیں کھاتا وہ مرنے کے بعد اکیس جنم تک جانور بنا رہتا ہے۔"

کہنے والوں نے ہمارے جیسے خطوں کے لیے تیسری دنیا کی ظالم اصطلاح بھی گھڑ رکھی ہے۔ بنیاد جس کی ترقی پذیر معیشت ہے۔ ارے کوئی پوچھے کہ معیشت اور معاشرہ بھی دلیل کی بنیاد پر قائم ہے۔ فرد، گروہ اور جماعتوں کی کامیابی اپنی اپنی دلیل کی معیشت بناتی، سنوارتی اور چمکاتی ہے جو جتنا کامیاب ہے۔ اس کے پیچھے اس کی دلیل کارفرما ہے اور ناکامی کے پیچھے بھی عین یہی اسباب ہیں اور فرد کا دل اس دلیل کے قبضے میں ہے۔ دلیل کے میدان میں عزرائیل، استادوں کا استاد رہا ہے...... مگر یہاں اس کی یاد، اس کی دلیل کے حق میں نہیں بلکہ خدائے لم یزل کی یاد ہے کہ جس نے دلیل کی سزا موت مقرر کرنے کے بجائے مہلت مقرر کر دی اور اس کو دیے گئے اختیارات اور مراعات آج تک بہت سوں کو لبھانے کا ذریعہ ہیں۔ گو کہ مہلت اور مدت سب ہی کی مقرر ہے۔

"جاڑوں میں اور مارچ اپریل مہینوں میں اناج کی بہت تنگی آ جاتی۔ اس کا اکلوتا بدل گنے کے رس کی پت سے اترا ہوا میل ہوتا۔"

"جٹوں کے نیانے اور میرے ساتھی ہمیں میل پینے والے لوگ کہتے۔ جب بھی تو تو میں میں ہو جاتی تو وہ چمار ماں دے یار جیسے کٹیلے فقرے بنا کے کستے۔

میرے ٹڈی کھانے کی بات اسکول میں افواہ کی طرح پھیل گئی اور نیانے مجھے ٹڈی کھاتا سانپ کہہ کے چڑاتے۔ لفظ سانپ انہوں نے میرے کالے رنگ کے صدقے جوڑ لیا تھا۔ میں اس شرمندگی کے بوجھ تلے لگاتار دبتا جا رہا تھا جس کے نیچے سے میں جتن کر کے بھی نکل نہیں پا رہا تھا۔ کبھی اپنی ٹڈی ہو لیں کھانے کی گھٹنا گھناؤنی تو کبھی سچ لگتی۔ من میں دلیل اٹھتی، دیوالی دسہرے کو سب گھروں میں بکرے کا ماس رندھتا ہے، ان کو تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

بیتی ہوئی کو آپ کہنا آسان نہیں...... اور بھی کبھی سننا بھی آسان نہیں رہتا۔

یہ تو بچپن تھا۔

کالج میں آ چکنے کے بعد......

اس کے کھیتوں میں دیہاڑی کرنے کے دوران تیسرے پہر کی چائے ہمارے گلاسوں میں ڈالنے کے وقت چوٹ کے طور پر کہی گئی بات خود بخود یاد آ گئی۔

"چائے چوہڑی، چائے چماری
چائے نیچوں کی نیچ......
پورن برہم پار تھے
جو چائے نہ ہوتی بیچ......

یہ سنتے ہوئے من کا کھلا آکاش پل بھر میں سکڑ گیا تھا۔

اور یہ تعصب ہی ہے جو جارحیت کو جائز قرار دینے کی دلیل فراہم کرتا ہے۔

تکبر، جہل اور نفرت، تعصب کی جڑوں کو سینچتی ہیں، تب کہیں جا کر تعصب کی شاخیں پھلتی پھولتی ہیں۔ رنگ، نسل، زبان، مذہب، عقیدہ، فرقہ اور قوم پرستی کی بنیاد پر ہونے والے فساد، جھگڑے اور جنگیں اس خطہ ارض پر حضرت انسان کی کوتاہ نظری اور کم ظرفی کا بین ثبوت ہیں اور ہر زمانے کا انسان اس کا شاہد بھی...... شکار بھی......

کسی بھی تصویر کو وسیع تناظر میں دیکھنے کے لیے عالمی سطح پر جاری...... مختلف معاشروں کی کشاکش دیکھنا مشکل نہیں۔ فرصت کے علاوہ ترجیح اہم ہے اور اسی صورت حال کو فرد کی اکائی پر منطبق کرنا ہو۔ تو کبھی کبھی ہماری ذات اور شخصیت، عقل اور ظرف، جذبات اور تجربات کی محدود سطحوں پر یرغمال بن جاتی ہے۔ ایسے میں اہم یہ نہیں کہ آپ اپنے یرغمال ہونے کو جان لیں۔ اہم یہ ہے کہ آپ خود کو رہا کرنے کے لیے کیا اور کتنے جتن کرنے کی ہمت دکھاتے ہیں۔ "چھانگیا رکھ" اس ہمت کو تھامے رکھنے کی داستان ہے جو بھوک پیاس، طعنوں، نفرت اور کم تر سمجھے جانے کی گھپ تاریکی میں جینے اور مرنے سے انکار سکھاتی ہے۔

انکار محض منکرین سے جڑی اصطلاح نہیں، یہ ظلم اور زمانے سے ٹکرا جانے والی صفت کا بھی عنوان ہوا کرتا ہے۔

"ذرا دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ ویران بنجر زمینوں جیسی زندگیوں میں ہریالی کے لیے سب نے مل کے لگاتار اور کام کرنا ہے۔ اس لیے کہ ہماری پیتا در پیتا جگوں پرانی ہے جسے کسی نے نہ کبھی سنا اور نہ ہی محسوس کیا۔"

"بھائیے کی خواہشوں پر کھرا اترنے کے لیے میں لگاتار مچھلی کی طرح تڑپا کرتا۔ مجھے لگتا کہ دن بہ دن میرا رستہ روشن ہوتا جارہا ہے۔ جس کے صدقے من ہی من میں امبر سے تارے توڑنے کے منصوبے بناتا نہ تھکتا۔"

مگر نتیجہ صاد ہونے سے قبل کے مرحلوں میں رہنا، گزرنا اور پھر ان سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈنا......

"کیا ہوا جو ساتھ پڑھتے لڑکے جات کا طعنہ دیتے ہیں؟ شاستری کون سا برہمن تھا؟ کیا ہوا جو میرے پاس اور کپڑے نہیں؟ میرے ساتھ میرا بھائیا، میری ماں ہیں۔ شاستری کے پاس تو وہ بھی نہیں تھے۔ اگر شاستری اپنی غریبی کے دوران محنت اور عزم سے یہاں تک پہنچ سکتا ہے تو مجھے ہمت سے پڑھائی کرنی چاہیے۔"

اور چلتے رہنا تو ایک آزمائش ہے، جب کہ ڈھے جانا آسان ہو، تو قائم رہنے کی مشکل کا انتخاب کرنا دراصل سربلندی، سرفروشی کے جذبے سے سرشار رہنا ہے۔

"ویہڑے میں بان کی ننگی چارپائی پر سونے کے لیے لیٹا تو میری مندی آنکھوں کے آگے ان دونوں اجنبیوں کے ٹھوس خیال فضا میں چمکتے جگنوؤں کی طرح من کے اندھیرے میں روشنی بھرنے کے لیے ادھر کبھی ادھر چھوٹی چھوٹی اڑانیں بھر رہے تھے۔

اس کتاب کا یہی پیغام اس آپ بیتی کو منفرد بناتا ہے کہ دراصل اس طرز عمل سے ایک فرد نے اپنے وجود کی طاقت کو گروہی طاقت سے جوڑ کر اپنے سماج کی چلتی روش سے مخالفت مول لے کر مقابلہ کیا۔ اس سے سبق سیکھ کر، اپنے حصے کی تاریکی کو ختم کرنے کی جرأت ہر کوئی کرسکتا ہے۔

جیے جانے کے بعد زندگی...... کہانی کو زندہ کردیتی ہے۔ ہر منظر، ہر لمحہ سانس لیتا ہے۔ تب ہی تو......کبھی تھم جاتا ہے......کبھی چلنے لگتا ہے۔

زندگی ارتقاء اور بقاء کا قصہ ہے۔ کوئی خود سنا دے تو آپ بیتی......اور جو نہ کہہ سکے وہ جگ بیتی۔

ذہن سازی کے دنوں میں ماحول، شخصیات، ان کے کردار اور گفتگو گہرے اثرات کے حامل عناصر ثابت ہوتے ہیں۔

بھائیے (باپ) کا ذہن متحرک اور کردار عملی ہے۔ صرف محنت مزدوری پر اکتفا نہیں۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں کی دیکھ بھال میں، برساتوں میں گرتی چھتوں اور دیواروں کی مصیبت کے آگے ڈھال بنا۔ کھیتی باڑی کرتا، شریک حیات اور بچوں کی دیکھ بھال اور ذمہ داری تندہی سے نبٹاتا ہوا بھائیا......دھنک کی طرح کہانی کے آسمان پر چھایا ہوا ہے۔ گزشتہ سطروں میں بھائیے کے وچار تو آپ نے ملاحظہ کر ہی لیے ہیں۔ وہ شریک حیات سے مکالمے کا کچھ حصہ تھا۔

بھائیا حقے کا گھونٹ بھرے بنا ہی ان کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گھر کی طرف لوٹتے ہوئے اونچا اونچا بولے جارہا تھا۔ "یہ کوڑھ نہیں نکلنے کا ہم لوگوں میں سے، سارا پواڑا باہمنوں کا ڈالا ہوا ہے۔ پواڑا کاہے کا، پاڑا (پھوٹ) ڈال رکھا ہے۔ وہیلے بیٹھ کے کھانے کو اور ہمارے جیسوں اوروں کے لیے بیگار بیتی کروانے کو۔"

بھائیے کا سماجی اور سیاسی شعور بھی اسے مختلف بنا رہا تھا۔

بھائیے کو پھر پتا نہیں کیا سوجھا کہ بولنے لگا۔ "میں تو کہتا ہوں کہ کسی ایک طرف ہو کے مرجاؤ سارے جنے۔ چاہے جدھر مرضی جاؤ، چاہے سکھ بن جاؤ، چاہے کچھ اور...... پر ہندو نہ رہو۔ اس نرک سے نکلو۔" اپنے جہنم میں رہنے سے مسلسل انکار اور کوشش دراصل بھائیے کو اس ساری داستان کا ایکشن ہیرو بناتی ہے۔

خدا اور خود پر یقین رکھنا، ان دونوں پر...... یا ان میں سے ایک پر، وہ ہر کسی کا اپنا انتخاب ہے۔ لیکن یقین کیجیے کہ اصل مرحلہ صرف اس یقین پر قائم رہنے اور اس کو قائم رکھنے کا ہی ہے۔ ایک ایسا مرحلہ، جو

آنے والے مرحلوں کو بدل دینے کا یقین رکھتا ہے۔
کہنے لگا۔ ”نام یا بھاگوں کے کھیل سی کیا سنورنے والا بہتیرے کرم کرلیے، دن رات سخت محنت کر کے دا کھو پر گھس چلا۔ کچھ نہ بنا، جو کوئی سچ پوچھے تو میں کہتا ہوں، من میں پکا بھروسا رکھو اور اپنے بل بوتے پر کھڑے ہو جاؤ۔
دم بھر چپ رہ کے بھائیا اچانک اچھل کے پڑ گیا۔ ”ماما چار، اکھر پڑھ لیا کر، نہیں تو ہماری طرح جمیند اروں کی غلامی کیا کرے گا۔ سارا دن ہاڑ توڑا کرے گا اور پیچھے ملیں گی ڈپٹیں جھڑکیاں۔“
47ء...... ایک ہی وقت کو تقسیم اور آزادی کا عنوان ملا، ایسے میں کچھ جدائیاں، سفر اور ہجرت کے جبر کی صورت میں پیش آئیں۔ جن کا ذکر عمدہ اور دل گداز ہی۔
بھائیے نے اسکول کی عمارت سے جان محمد کی حویلی تک جانے کے لیے اپنی یادوں کا گھوڑا پیچھے کی طرف سرپٹ دوڑا رکھا تھا۔
”جان محمد کا چھوٹا بھائی ابجے (عزیز) محمد میرا جگری دوست تھا۔“ بھائیے کی آواز پہلے سے دھیمی اور تھوڑی سی بھاری ہوگئی تھی۔
بھائیے کو کچھ اور خیال آ گیا تھا اور وہ بنا پوچھے بتانے لگا۔
اس ایک جملے میں بنا پوچھے کے ادراک کی رمز، نہایت حساس اور گہرے مشاہدے کی جانب اشارہ کرتی ہے۔
بھائیے کی بے ساختگی دل کو چھو لینے والی ہے اور اسی بے ساختگی سے دی جانے والی گالیوں اور گڈو کی ہونے والی پٹائی کا احوال بھی دلچسپ ہے۔
”شاباش، حرام دے جنے...... چاند چڑھائے گا کسی دن......“ بھائیے نے کسی نجومی کی طرح کہا۔
”در فٹے منہ اس تخم کی مار کے...... جیتے جی مروائے گا۔“ بھائیے کے داہنے ہاتھ کی چپیڑ میرے منہ پر لگی ہی تھی کہ ماں نے تیزی سے بھائیے کی اٹھی ہوئی بانہہ پکڑی۔
گڈو کی پٹائی دراصل باغیانہ کارروائیوں کا علم ہونے پر ہوئی۔ جو گاؤں کے اونچی ذات کے کھیتوں، کنوؤں اور درختوں سے چھیڑ چھاڑ کی صورت میں بچوں کی ٹولی مل کر کر رہی تھی۔ یہ انتقامی کارروائیاں جہاں استحصالی رویے کے خلاف مزاحمت کی علامت تھیں، وہیں آنے والے وقت کا سمت نما بھی تھیں۔
”جو چار سیاڑ (تھوڑی سی زمین) ہمارے بھی ہوتے۔ بڑی سوکھی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ پتا نہیں کس کنجر نے ہمیں زمینوں سے بروے (محروم) رکھا۔“
بھائیے کو جیسے کچھ یاد آ جاتا۔ اداس سا ہو کے کہتا۔
”ہم نے آدم پور م کی نہر پاٹ دی۔ امب کے ٹھانے تک سڑک بنا دی۔ پر مجھ سے سالا چار خانے کو ٹھانہ ڈالا جا سکا۔“
برسات کے قہر سے نبٹتے، کبھی دیوار، کبھی چھت کو بچاتے بھائیا سپر ہیرو کی طرح لگتا ہے۔ ایک اور دبنگ کردار دادی کا ہے جس کے لیے ایک پورا باب ”میری دادی۔ ایک اتہاس“ کے نام سے وقف ہے۔
”کس نکھمسی کا ہے تو؟ کھڑا ہو ذرا، چیر کے دو کرتی ہوں۔“
دادی کے کردار سے متعارف کروانے والے پہلے جملے ہیں۔ اس کے بعد ایک دلچسپ داستان شروع ہوتی ہے۔ جو دراصل بھائیے اور پھر گڈو (مصنف) کے ذہنی ارتقاء کا سراغ دیتی ہے کہ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں، ہار نہ ماننے کا وصف ہی لڑنے والوں کی جداگانہ پہچان بنتا ہے۔
تلخی حیات کا زہر پی کر بھی، تلخ نوا نہ ہونا ایک منفرد اظہار ہے۔ کتاب کی نثر شاعرانہ اوار رکھتی ہے جس کا ثبوت وہ عنوان ہیں جو مختلف ابواب کو دیے گئے ہیں۔
”کورے کاغذ کی گہری لکھت“ جو بچپن کی طرف اشارہ ہے۔ ”ترخنے شیشے کی پیا“ جب حساس دل پر سوالوں کی چوٹ لگنے لگی تھی۔ ”تھوہروں پر اگے پھول، بادلوں میں سے جھانکتا سورج، مارو تھل میں بہا دریا“۔
مارو تھل میں بہا دریا اس کتاب زندگی کا خوب صورت ترین تجربہ ہے۔ جہاں بے لوث اور غیر مشروط محبت انسان دوستی سے اٹھ جانے والے یقین کو حیات بخش لمحہ عطا کرتی ہے اور درحقیقت، محبت کی مضبوط فصیلیں ہی کارزار ہستی میں انسان کی ڈھال بنتی ہیں۔
شاعرانہ نثر سے کچھ منتخب جملے پڑھیے۔
”دھند کے اڑتے جڑتے بادلوں کی طرح میرے من میں خیالوں کی لڑیاں جڑنے لگیں۔“

QUICE
All Time Refreshing
Since 1980
QUICE
SHARBAT
Since 1980
QUICE
ICE CREAM
SYRUP

”ان کے چہروں پر کسی چتا اور سوگ کا جیسے دہرا بوجھا پھر گیا ہو۔“

”میرے خیالوں کے پتا نہیں کیسے برساتی، کیڑوں پتنگوں کی طرح پر نکل آئے۔“

”جاڑا اپنے آخری دن گن رہا تھا۔“

بھابیے نے خاموشی کا ساگر پار کرتے ہوئے کچھ دیر بعد ماں سے کہا۔ ”جو میری ساس جیتی ہوتی تو وہ تیرے دکھڑے سنتی۔“

”سدا دن ایک سے نہیں رہتے۔“ ماں ڈھلتے سورج کی کرنیں پکڑنے لگتی۔

ماں کے ذکر کے بغیر جیون، جنم ادھورا ہے۔ ماں کا دھیما لہجہ، تحمل اور صلح جو انداز، امید اور حوصلے کے دامن سے لپٹے رہنا بھی۔ مصنف کے مزاج پر اثر رکھتا ہے۔

ماں کے تحمل، دھیرج نے امید اور حوصلے کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ماں کا یہ وصف، مصنف کے قلم کا گداز بن گیا۔

دنیا، زندگی، سماج، جب کسی مخصوص طبقے کو دیوار کے ساتھ لگا دے۔ پھلنے پھولنے کے مواقع ان پر بند کر دے۔ جبر کا نظام ان پر مسلط کرے تو وہ اپنے زمانے اور خطے کے دلت ہی کی مانند ہیں۔ دور نہیں جانے کی زحمت نہ کریں۔ تاریخ کی تاریک سرنگوں میں تلاش کی مشعل اٹھائیے، تحقیق کا پھاوڑا چلائیے بغیر، جدید زمانے کی ترقی سے لبالب بھرے امریکہ میں جاری نسلی تعصب کی جھلک دیکھ لیں۔ بوسنیا، کشمیر، فلسطین تو مانوس نام ہیں۔ ایک نیا اضافہ ایغور سے اٹھنے والی گونج کا ہے۔

خود اپنے ملک میں وڈیرہ، جاگیرداری نظام کے تحت روا رکھے جانے والے استحصال سے ہم واقف ہی ہیں۔ پاکستان میں تو خیر ایک مخصوص طبقے کی نگاہ میں پوری قوم ہی شودر سمجھی جاتی ہے۔ جہاں کچھ جانیں زیادہ قیمتی قرار دی جاتی ہیں اور جہاں کچھ کو مراعات یافتہ ہونے کا حق دلیل کے ساتھ حاصل ہو اور باقی کو ان مراعات یافتہ طبقات سے کم تر رکھنے کی دانستہ کوشش کی جائے تو لکیر تو کھنچ ہی جاتی ہے اور پاکستانی سماج میں ایسی کئی لکیریں کھینچی جا چکی ہیں۔

نوجوانی کا ولولہ...... زمانے کو بدلنے کی امنگوں کا مدار بنتا ہے مگر دھیرے دھیرے طے ہوتا سفر زمانے سے دست کش ہو کر اپنی ذات تک محدود ہوتا جاتا ہے۔ داخلی اور خارجی محاذ پر بلبیر مادھو پوری کا سفر آب و تاب سے شروع ہوا۔ ہر روز حقیقت کے نئے سورج سے سامنا، جو روشنی تو دیتا ہے مگر آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں دیتا۔

عملی زندگی میں تنہا ایمان داری، راہ کا روڑا کیسے بنتی ہے۔ ایمان کا امتحان ہر روز کس طرح لیا جاتا ہے اور مذہب بنے تعصب کو ہر موڑ پر موجود دیکھ کر سماج کے بدلنے کی امید تو انا نہیں رہتی۔

کتاب کے آخری ابواب سنسنی خیز حقائق کا بے لاگ بیانیہ ہیں۔ ملک کی وزیراعظم کے قتل پر برپا ہونے والے فسادات کے المیے کو بالواسطہ بیان کی تکنیک منفرد بناتی ہے۔

ایک ایسے سماج کا سامنا، جہاں بازوؤں سے محروم مزدور، مدد کی پیش کش قبول کرنے سے پہلے ذات کی اونچ نیچ کھوجتا ہے۔ نظمیں کہنے والا شاعر بھی دفتر کے ساتھی کو کچوکے لگا سکتا ہے۔ کرائے پر مکان لینے کے لیے ذات پات کی پوچھ تاچھ کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایسے سماج میں عزم، امید اور لگن سے جڑے رہنا۔ ایک کڑا امتحان ثابت ہوتا ہے۔ داخلی جہنموں سے گزر کر جو ملتی ہے، وہ اصل آزادی ہے۔ جسے چھین لینا ممکن نہیں رہتا اور اس آزادی کو پالینے والا خود کو بے معنی، بے قدر اور بے مقصد سمجھے جانے کی بے سمت گمراہی سے مکتی پا لیتا ہے۔ محض ایک کتاب کا مطالعہ، شعور کی شمع روشن کرنے کی استعداد رکھتا ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ روشنی اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت کا بھی پیام لاتی ہے اور پھر وہ روشنی دیا ہو۔ شمع ہو، مشعل ہو یا سورج ہو جائے۔

اندھیروں کی قسمت کہ انہیں روشنی کی کس قسم سے واسطہ پڑنے والا ہے۔

اپریل 2021
سالگرہ نمبر کی ایک جھلک

- "تم مجھ سے نہ کہنا" نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- "حالم" نمرہ احمد کے مکمل ناول کی آخری قسط،
- "زنجیر ایام" سارہ پیرزادہ کا مکمل ناول،
- راحت جبیں اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- منشا محسن علی اور نازیہ رزاق کے ناولٹ،
- شمائلہ دالعباد، قرۃ العین خرم ہاشمی اور کشف بلوچ کے افسانے،
- معروف فنکارہ "رباب رانا" سے باتیں،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ "قانتہ رابعہ" سے ملاقات،
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، خبریں وبریں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل 2021 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

بندھن

ڈاکٹر فرح خان ہمراہ نسیم احمد خان

شاہین رشید

خوش گلو، خوش گفتار اور خوب صورت خدوخال کی مالک ڈاکٹر فرح خان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ سریلی آواز اور گفتگو سے ایف ایم 101 کے سامعین کو اپنے سحر میں جکڑنے والی فرح خان ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرہ اور گلوکارہ بھی ہیں۔ ایک اچھی گھریلو خاتون ماں اور بیوی بھی ہیں......

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟ اور میاں صاحب کے بارے میں بھی؟"

"میرا تعلق فیصل آباد سے ہے اور میری مادری زبان پنجابی ہے میری پیدائش "میاں چنوں" کی ہے ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ پانچ بہنوں اور تین بھائیوں میں میرا نمبر پہلا ہے۔ میرے والد ایئر فورس میں تھے اور انہوں نے ماشاءاللہ دو جنگیں لڑی ہیں 1965ء کی اور 1971ء کی...... اب وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں جبکہ میری والدہ ہاؤس وائف تھیں اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔ میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہوں......

میری ابتدائی تعلیم پنجاب سے مکمل ہوئی جب کہ کالج، یونیورسٹی کی تعلیم کراچی سے حاصل کی، کیونکہ والد صاحب کی پوسٹنگ کراچی میں ہوگئی تھی ہومیو پیتھک کی تعلیم، ہومیو پیتھک کالج میڈیکل سینٹر سے حاصل کی...... میں ابھی طالبہ ہی تھی کہ میری شادی ہوگئی...... تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کا بھی ساتھ دیا۔ میرے میاں صاحب ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں ان کا اپنا کلینک ہے...... جب میں ہومیو پیتھک کے فائنل میں تھی تو میری گود میں ایک پیاری سی بیٹی تھی مجھے اللہ تعالیٰ نے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا دیا۔

جب بچے چھوٹے تھے تو ماں اور ساس بہت ساتھ دیتی تھیں۔ اسی لیے میں نے بچوں کی موجودگی میں کلینک بھی کیا۔ جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو پھر والدین کی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ پھر کلینک کے لیے ٹائم نکالنا مشکل ہوگیا اور میں نے کچھ وقت کے لیے کلینک کو خیر باد کہہ دیا۔

میرے میاں صاحب کا نام نسیم احمد خان ہے۔ ان کے والدین کا تعلق لکھنؤ سے ہے میاں صاحب کراچی میں پیدا ہوئے یہ ماشاءاللہ 9 بہن بھائی ہیں اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ یہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور کسی فیلڈ میں یہ اسپشلائز اس لیے نہیں کر سکے کہ ان پر بہت ذمہ داریاں تھیں بہن بھائیوں کو پڑھانا پھر ان کی شادیاں کرنا...... تو جب میری شادی ہوئی تو میں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

"آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

گھر کی ذمہ داریاں این جی اوز کے ساتھ میٹنگز، ریڈیو پروگرامز تو بس یہی مصروفیات ہیں میری......"

"آپ کی شادی 1985ء میں ہوئی، اتنے سال گزرنے کے باوجود آپ نکھری نکھری، فریش نظر آتی ہیں، وجہ اپنی کیریئر یا خوشحال زندگی؟"

"جب میری شادی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت ہی خوب صورت، خوبرو اور خیال کرنے والا پیار کرنے والا شوہر دیا اور میں ان کی بہت احسان مند ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا میری ہر

خواہش کا احترام کیا اسی وجہ سے میں آپ کو آج خوش باش اور نکھری نکھری نظر آتی ہوں ...... یہ عادت تو شروع سے ہی نہیں ہے کہ دوسروں کو دیکھ کر حسد کرنا کہ یہ میرے پاس کیوں نہیں ہے جو اللہ نے دیا اس کا شکر کیا۔ پوزیٹو رہتی ہوں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اولین سمجھتی ہوں۔ رشتوں کو نبھاتی ہوں۔"

"اپنی پہلی ملاقات کا احوال بتائیں؟"

"ہماری پہلی ملاقات ایک ڈاکٹرز میٹنگ میں ہوئی تھی وہاں میں نے ایک بہت ہی خوب صورت خوبرو نوجوان کو دیکھا، جو بالکل چاکلیٹی ہیرو لگا ...... اور میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ مجھے تو انہی کی تلاش تھی ...... اسی طرح جب انہوں نے مجھے دیکھا تو میں انہیں بھی بہت اچھی لگی۔ یوں دعا سلام کے بعد ایک دوسرے سے دوستی بڑھی تو ہم دونوں نے ہی اپنی پسند کا اظہار اپنے والدین سے کیا۔ اللہ نے ساتھ دیا یوں ہم ایک دوسرے کے شریک سفر بن گئے۔ ان کی شخصیت تو مجھے پسند آئی ہی تھی مگر مجھے ان کے دیکھنے کا اسٹائل بہت اچھا لگا تھا عزت و پیار کے ساتھ ......

اور آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ ہماری عمروں میں صرف پانچ یا چھ سال کا ہی فرق ہوگا۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی؟ شادی کے بعد علیحدہ گھر میں گئیں یا جوائنٹ فیملی میں؟"

"منگنی ایک سال رہی ...... اور میں جوائنٹ فیملی میں آئی۔ میں بھرے گھر سے الحمدللہ بھرے گھر میں ہی آئی ...... اور سب نے مجھے بہت پیار دیا۔ ماحول بہت پیارا تھا۔ سسرال میں بہت محبت ملی اور میرا اتنا دل لگ گیا تھا کہ مجھے اپنا میکہ بھی زیادہ یاد نہیں آتا تھا ...... میں اتنی خوش تھی۔"

"عموماً لڑکیوں کو اپنی ساس سے بہت شکوے ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی ہیں؟"

"میری ساس بہت اچھی نیک خاتون تھیں۔ بہت سمجھدار انہوں نے مجھے ہمیشہ دھیرے دھیمے انداز میں سمجھایا۔ ہمیشہ اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھایا ...... اور میں نے بھی انہیں ماں ہی سمجھا ...... مجھے اندازہ تھا کہ ایک ماں نے اپنا بیٹا جوان کر کے پڑھا لکھا کے میرے حوالے کیا ہے تو میری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں کہ میں اس محبت کو نبھاؤں، تو میں نے بھی ان کے

اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی بلکہ ایک اچھی بہو بلکہ بیٹی بن کر دکھایا۔"

"شادی کے بعد گھر کو اپنا گھر بنانے میں کتنا وقت لگا اور اپنے بچوں کے بارے میں بھی بتایئے؟"

"گھر بنانے میں تو پوری زندگی گزر جاتی ہے۔ تو بہت محنت کی...... سسرال والوں کا بھی خیال رکھا اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی...... تو دھیرے دھیرے سب حالات اچھے ہوتے گئے اور آج میں اپنے گھر میں بہت خوشحال زندگی گزار رہی ہوں۔

اور الحمد للہ میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کردی ہے اور بیٹے کی شادی بھی گزشتہ سال کی ہے...... اور میں تو اپنی ساس کی طرح اپنی بہو کو پہلے دن سے بیٹی تسلیم کر چکی ہوں...... اور ان شاء اللہ جب تک زندگی ہے وہ میری بیٹی ہی رہے گی...... اور وہ بھی مجھے ماں ہی کہتی ہے۔"

"اپنے دور کی اور آج کی رسومات کے بارے میں بتائیں؟"

"ہمارے دور میں تو لوگ مجبور کر دیا کرتے تھے جہیز کے لیے اور ہندوانہ رسمیں بہت ہوا کرتی تھیں...... جبکہ آج کل کے نوجوان وقت اور پیسوں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے زیادہ رسومات کو پسند نہیں کرتے...... اور اب جہیز لینے کو لوگ برا سمجھتے ہیں ہاں اپنی بچیوں کو جو دینا چاہیں ضرور دیں۔ مگر اب کوئی مجبور نہیں کرتا۔"

"کھانے پینے اور پکانے کے معاملے میں کیا فرق تھا؟"

"ہمارے گھر میں ذرا چٹ پٹے کھانوں کا رواج تھا جبکہ سسرال میں کم نمک مرچ کے کھانے پکائے اور کھائے جاتے تھے۔ تو مجھے جیسا میری ساس نے پکانے کو کہا میں نے پکایا...... اور لڑکی کا یہ اولین فرض ہے کہ سسرال میں اس کے بڑے جیسا کہیں وہ ویسا ہی کرے...... آپ کو بتاؤں کہ میرے ہاتھ کے پکے کھانے سب کو بہت پسند آتے ہیں۔ اس طرح میری بہو کے ہاتھ میں بھی بہت ذائقہ ہے۔"

"اب تو موبائل نے سب شرم و حیا ختم کر دی ہے اب منگنی کے بعد ملنا جلنا سب جاری رہتا ہے۔ آپ اپنا بتائیں؟"

"پہلے تو جناب ایک ماہ پہلے ہی لڑکی کو پردہ کرا دیا جاتا تھا میں نے بھی پردہ پندرہ دن پہلے ہی کر لیا تھا اور ابٹن لگائی تھی اور کہا جاتا تھا کہ دلہن پر روپ نہیں آتا اگر وہ سب کے سامنے آئے۔ مگر اب تو پارلر سے تیار ہو کر آتی ہیں اور ہونے والے میاں کے ساتھ گپ شپ کر رہی ہوتی ہیں۔ میں تو گھر پر ہی تیار ہوئی تھی۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں؟"

"منہ دکھائی میں انہوں نے گھڑی دی تھی اور ہنی مون کے لیے اسلام آباد، مری اور ناردرن ایریاز گئے تھے۔"

"میاں صاحب مزاج کے کیسے ہیں؟ گھر کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں؟"

"میرے میاں مزاج کے بہت نرم ہیں اور بڑے اچھے موڈ میں رہتے ہیں۔ غصہ تو بہت کم آتا ہے۔ شروع شروع میں تو گھر کے کاموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ مگر پھر ذمہ داریاں بڑھیں تو کلینک کو زیادہ وقت دینے لگے اور گھر کے کاموں کے لیے میں خود جو تھی۔ بچوں کی تربیت میں ہم دونوں کا ہی ہاتھ ہے لیکن چونکہ میں ماں ہوں تو میری ذمہ داریاں زیادہ ہیں تو میں نے بچوں کو بھرپور ٹائم دیا بچوں کی اور میری دوستی ہے جبکہ وہ اپنے والد سے ڈرتے ہیں بچے اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کرتے ہیں۔"

"لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں؟ صلح میں پہل کون کرتا ہے؟"

"لڑائی جھگڑے کس گھر میں نہیں ہوتے۔ اگر میرا قصور ہو تو میں منا لیتی ہوں اور اگر "یہ" سمجھتے ہیں کہ قصور ان کا ہے تو پھر وہ منا لیتے ہیں اور ہم صلح

کرنے میں دیر نہیں کرتے مطلب جلدی مان جاتے ہیں۔ سسرال کی طرف سے کوئی بات ہو تو ظاہر ہے کہ ہر کوئی اپنے میکے کی سائیڈ ہی لیتا ہے اور ہمیں بھی سمجھ جانا چاہیے کہ ہمارے میاں کیا اور کس چیز کو پسند کرتے ہیں۔"

"سسرال والوں سے تعلقات پہلے کیسے تھے اور اب کیسے ہیں؟"

"میرے تعلقات ہمیشہ بہت اچھے رہے اور الحمدللہ ابھی بھی ہیں...... میرے میاں صاحب میرا بہت ساتھ دیتے ہیں اور جو بات ان کے مزاج کے مطابق نہیں ہوتی وہ میں نہیں کرتی۔ اگر میاں بیوی اسی طرح ایک دوسرے کا احترام کریں تو زندگی بہت اچھی گزر جاتی ہے۔"

"میاں صاحب کی اچھی اور بری عادت کے بارے میں بتائیں؟"

"ساری عادتیں اچھی ہیں سوائے ایک عادت کے کہ وہ فضول خرچ بہت ہیں۔ مثلاً انہیں کہا جائے کہ فلاں چیز ایک کلو لے آیئے گا تو وہ ایک کے بجائے پانچ کلو لے آتے ہیں۔ اسی طرح جب شاپنگ کرتے ہیں تو مہنگے کپڑوں اور چیزوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ تو بس مجھے ان کی یہ عادت پسند نہیں ہے۔"

"آپ کے میاں بھی ڈاکٹر اور آپ ہومیو پیتھک ڈاکٹر...... کیا گھر کی مرغی دال برابر ہے یا؟"

"میرے میاں کے ہاتھ میں بہت شفا دی ہے اللہ نے...... خاندان کے سب ہی لوگ ان کے کلینک جاتے ہیں اور صحت یاب ہوتے ہیں...... بہت دعائیں دیتے ہیں۔"

"گھر کا بجٹ کس کے ہاتھ میں ہے...... اور اپنی کمائی کا کیا کرتی ہیں؟"

"میں کافی کفایت شعار ہوں۔ جہاں خرچ کرنا ضروری ہو وہاں ہی خرچ کرتی ہوں۔ گھر کا بجٹ میرے ہاتھ میں ہے اور میری کمائی کا کیا پوچھتی ہیں۔ اللہ میرے میاں صاحب کو سلامت رکھے وہ ہی مجھے دیتے ہیں۔"

"کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ میکے اور سسرال میں ایک ہی دن تقریب ہو...... پھر آپ نے کس کو ترجیح دی سسرال کو یا پھر میکے کو؟"

"اول تو ایسا ہوا نہیں...... نہ ہی ہوگا۔ کیونکہ کسی تقریب کی ڈیٹ رکھی جاتی ہے تو دونوں گھروں سے مشورہ کر کے رکھی جاتی ہے تاکہ شرکت کو یقینی بنایا جائے۔ پھر بھی اگر ایسا اتفاق ہوا تو ہم دونوں میاں بیوی دونوں تقریبات میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ضرور جائیں گے۔"

"ماشاء اللہ آپ میں بہت ٹیلنٹ ہے تو سسرال والے آپ کی صلاحیتوں کی تعریف کرتے ہیں؟"

"اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں دی ہیں، وہ میرے لیے اللہ کا تحفہ ہے اور میرے ٹیلنٹ کو تراشا میرے میاں نے ہے...... انہوں نے مجھے اعتماد دیا۔ مجھے وقت دیا۔ میرے بچوں نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ سسرال والے بھی میری بہت تعریف کرتے ہیں۔"

''آپ سگھڑ ہیں؟ میاں صاحب آپ کے پکائے کون سے کھانے شوق سے کھاتے ہیں؟ اور ہوٹلنگ کا شوق ہے؟''

''جی...... جی اللہ کا شکر ہے میں سگھڑ ہوں۔ کھانے خود پکاتی ہوں۔ کوئی خانساماں نہیں رکھا ہوا میں نے...... میاں صاحب کو میرے ہاتھ کے کریلے گوشت ''سرسوں کا ساگ، کڑی، مچھلی کا شوربہ، سالن ''اور چاول'' بہت پسند ہیں۔ سسرال میں میرا ساتھ بھابیاں اور نندیں دیتی تھیں اور گھر میں میری بیٹیاں میرا ساتھ دیتی ہیں میری بہو بھی بہت لذیذ کھانے پکاتی ہے...... ہوٹلنگ کا بہت شوق ہے...... ہر ویک میں ضرور جاتے ہیں...... اور اگر اچانک کوئی مہمان گھر میں آ جائے اور ہم کہیں جا رہے ہوں کھانا کھانے تو پھر ہم انہیں بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔''

''میاں بیوی کی لڑائی کبھی کبھار غلط رزلٹ بھی دے دیتی ہے۔ کیا کہیں گی آپ؟''

''لڑائی جھگڑے اس لیے ہوتے ہیں جب میاں بیوی ایک دوسرے کو نہیں سمجھتے...... چونکہ شادی کے وقت لڑکا اور لڑکی دونوں ہی کم عمر ہوتے ہیں تو غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں...... ایسے میں والدین بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پوزیٹو ہیں اور اچھی ہدایات دیں تو پھر اللہ کا کرم رہتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ کمپرومائز کریں تو پھر گھر ٹوٹنے کی نوبت نہیں آتی۔ مین کردار میکے والوں کا ہوتا ہے۔ وہ جذباتی ہو کر غلط ہدایات دیں گے تو پھر گھر نہیں بسیں گے۔''

''آج کی نسل کو کیا نصیحت کرنا چاہیں گی؟''

''یہی کہوں گی کہ شادی سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو سمجھ لیں...... پھر والدین جو پوزیٹو باتیں بیٹی کو سمجھا کر بھیجیں اس پر عمل کریں۔ بے شک شروع کے چند سال مشکل ہوتے ہیں، مگر پھر اس کا میٹھا پھل بھی ملتا ہے...... اور کبھی بھی کسی بات کا طعنہ نہیں دینا چاہیے کہ تم ایسی ہو ویسی ہو...... یا تم کیا لے کر آئی ہو، ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت کے ساتھ زندگی گزاریں اور میں بچیوں سے یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ ضروری نہیں کہ شادی کا میک اپ اور جوڑا مہنگا ترین بنوائیں۔ کیونکہ یہ تو ایسا موقعہ ہوتا ہے کہ ''قدرت'' اسے روپ دیتی ہے اور سادگی میں بھی دلہن بہت پیاری لگتی ہے...... پھر شادی کے بعد بھی اپنے میاں کے لیے سجیں سنوریں، میاں شام کو گھر آئے تو آپ صاف ستھرے کپڑوں میں ہوں اور ہلکا میک اَپ بھی ہو۔''

''آپ اپنے میاں صاحب کو کس روپ میں اچھی لگتی ہیں؟''

''اپنے میاں صاحب کو میں ہمیشہ سجی بنی ہی اچھی لگتی ہوں اور وہ میرے لیے خود ہی کپڑے لے کر آتے تھے اور تاکید کرتے تھے پہننے کی جب کہیں جانا ہوتا تھا تو خود ہی ڈیسائیڈ کرتے تھے کہ کیا پہننا ہے اور کیا نہیں...... اور یہ بات ہے شروع شروع کی پھر مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہیں کیا پسند ہے اور کیا نہیں۔ انہیں میرا ساڑھی پہننا بہت پسند ہے...... تو تقریبات میں ساڑھی ہی پہنتی ہوں۔ ان کے گھر آنے سے پہلے بھی تیار ہوتی ہوں جس دن تیار نہیں ہوتی تو یہ سمجھ جاتے ہیں کہ آج فرح کو کوئی ٹینشن ہے۔ مگر پھر بھی مجھے کہتے ہیں کہ تم اس روپ میں بھی اچھی لگ رہی ہو۔''

''اور ایک پرائیویٹ سوال کہ کمرے میں آ کر انہوں نے بے ساختہ کیا کہا؟''

''ہاہاہا...... بے ساختہ کہا تھا کہ

چودھویں کا چاند ہو
یا آفتاب ہو تم''

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فرح سے اجازت چاہی۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... انمول
میک اپ ... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

صبیحہ ہاشمی!

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدللہ...... میں بالکل ٹھیک ٹھاک اور خیریت کے ساتھ ہوں۔ آپ نے یاد کیا...... اچھا لگا۔ آپ کا شکریہ۔"

"محبت ہے آپ کی ...... گزشتہ دنوں آپ کا سیریل فطرت بہت زیادہ مقبول ہوا؟"

"جی بالکل...... مگر اس سے قبل منافق، جلن اور نند بھی بہت مقبول ہوئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے اور آپ سب کی محبت ہے کہ آپ میری پرفارمنس کو پسند کرتے ہیں۔"

"فطرت کی کہانی کے بارے میں کیا کہیں گی۔ اس میں کتنی حقیقت ہے؟"

دستک دستک دستک

شاہین رشید

"دیکھیں جی...... دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ ہمارے اور آپ کے گھرانے میں اگر ایسا رویہ کسی کا نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ نہیں ہیں۔ ایسا ہوتا ہوگا تب ہی ہماری رائٹر نزہت سمن نے لکھا ہے اور یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ نزہت سمن سے میری بہت اچھی دوستی ہے۔ کہانی کی حقیقت کا تو مجھے اتنا اندازہ نہیں ہے۔ لیکن کہانی بہت خوب صورت ہے۔ کیوں کہ مجھ سے جو کوئی بھی ملتا ہے وہ فطرت کی بہت تعریف کرتا ہے ...... اور پورے سیریل میں کہانی میں اتنا تجسس رہا کہ آخری قسط تک لوگوں نے اسے نہایت ہی شوق سے دیکھا اور مجھے اس سیریل میں کام کر کے بہت مزا آیا۔ میرے یادگار سیریلز میں اب اس کا بھی شمار ہوگا۔"

"ماشاء اللہ آپ اکثر سیریل میں نظر آتی ہیں۔ آپ بتائیں کہ آپ کو کون سے رائٹرز پسند ہیں جن کے ساتھ کام کر کے آپ کو اچھا لگتا ہے؟"

"ان رائٹرز کے ڈراموں میں کام کرنے کا مزا آتا ہے جس کی کہانی ذرا غیر معمولی ہوتی ہے...... اور فطرت کی کہانی عام کہانیوں سے بہت مختلف تھی جس کو کر کے مزہ آیا...... "نند" جیسے ڈرامے ذرا چٹ پٹے ہوتے ہیں تو یہ سیریل بھی لوگوں میں مقبول ہوا۔ نزہت سمن کے میں نے کافی ڈرامے کیے ہیں۔ کیونکہ ان سے میرا ایک دل کا رشتہ ہے۔"

"کن وجوہات کی بنا پر اسکرپٹ سائن کرتی ہیں آپ؟"

"ڈائریکٹر اور رائٹر یہ دو ایسی شخصیات ہیں کہ جن کے ساتھ ہم کافی ٹائم گزارتے ہیں اور گھر والوں سے بھی زیادہ وقت ہم ان لوگوں کے ساتھ گزارتے

ہیں۔ تو ان دو شخصیات کے علاوہ اگر کاسٹ بھی اچھی ہو تو پھر گھر جیسا ماحول لگنے لگتا ہے...... اور جب فطرت کا کیمرہ کلوز ہوا مجھے کچھ عرصہ گھر رہنا پڑا تو اسد جبل اور دیگر لوگوں کو میں نے بہت مس کیا۔ بلکہ پوری ٹیم کو ہی مس کیا...... اور جن کے ساتھ اچھا وقت گزرتا ہے وہ پھر فیملی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جیسے میں نے سیریل ''جلن'' عابس رضا کے ساتھ کیا تو اچھا لگا۔ سیریل ''نند'' ذیشان کے ساتھ کیا تب بھی اچھا لگا۔ تو وقت کے ساتھ ساتھ انڈر اسٹینڈنگ بڑھتی چلی جاتی ہے۔''

''گھر جانے کا وقت تو بس اتنا ہی ملتا ہوگا کہ رات گزار لی...... کام ختم کرنے کے بعد جب آپ گھر جاتی ہیں تو پھر کیسا محسوس کرتی ہیں؟''

''بچپن میں جب اسکول کی چھٹی ہوتی تھی اور چھٹی کی جب بیل بجتی تھی تو خوشی کے مارے یہ حال ہوتا تھا کہ بس اب گھر جانا ہے۔ تو میرا اب تک وہی بچپن والا حال ہے کہ دس بجے ہمارا آف ہونا ہوتا ہے تو میں نو بجے سے ایک ایک منٹ گن رہی ہوتی ہوں کہ کب دس بجیں گے اور کب میں گھر جاؤں گی...... اور کبھی رات کو میسج آجائے کہ کل کی شوٹ کینسل ہوگئی ہے تو یقین کریں کہ میں اتنا ہی خوش ہوتی ہوں جتنا میں بچپن میں چھٹی کا سن کر ہوا کرتی تھی۔''

''اور جب اتوار کو بھی شوٹ ہو تو گھر میں کس کس کا موڈ خراب ہوجاتا ہے؟''

''میں گھر والوں کا موڈ خراب ہونے ہی نہیں دیتی کیونکہ اتوار کے دن میں کبھی بھی شوٹ پر نہیں جاتی چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہی کیوں نہ ہوجائے۔ اتوار میرا اور میری فیملی کا دن ہوتا ہے...... اسے کوئی نہیں چرا سکتا۔''

''لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا...... اور خدانخواستہ آپ کورونا کا شکار تو نہیں ہوئیں؟''

''الحمدللہ میں کورونا کا شکار نہیں ہوئی...... اور لاک ڈاؤن کے وقت کو میں نے بہت انجوائے کیا...... اس لیے کہ کافی وقت میں نے اور میری فیملی

نے ایک ساتھ نہیں گزارا تھا...... میں نے اپنے گھر کے سارے ملازمین کی چھٹی کر دی...... اور پھر میں، میرے بچے اور ان کے بچے سارا وقت گھر پر گزارتے تھے اور خوب مزے کرتے تھے...... کھانا بھی گھر میں پکتا تھا اور روٹیاں بھی گھر میں پکتی تھیں۔ باہر سے منگواتے ہوئے خوف آتا تھا...... پھر بچوں کی فرمائشیں کہ بہت دن ہو گئے آپ نے فلاں چیز نہیں پکائی...... اب ضرور پکائیں اور ساری فرمائشیں پوری کیں اپنے بچوں کی......

اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ میری بہو میری بہو نہیں بلکہ بیٹی ہے تو ہم ساس بہو نے ہی کچن سنبھالا...... اسی طرح بیٹے ٹیبل سیٹ کرتے تھے اور دیگر کاموں میں بہت مدد کرتے تھے، آٹھ دس دن جب گزر گئے تو خیال آیا کہ ہمارے گھر میں جو ملازم ہیں خواہ وہ بڑی عمر کی ہو یا چھوٹی عمر کی۔ وہ پورا پورا دن اکیلے کچن اور گھر کو سنبھالتی ہیں اور ہم اتنے لوگ ہو کے بھی ان کی طرح پورے گھر کو سنبھال نہیں پا رہے تھے اور جب بارہ دن ہو گئے گھر کے کام کر کر کے تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا تو میں نے سوچا کہ جو ملازمین میرے پاس کام کرتے ہیں وہ تو صرف میرے ہی پاس کرتے ہیں تو پھر میں نے انہیں چھٹی کیوں دی؟ پھر میں نے ان کے سارے ٹیسٹ کروا کے اور ہر طرح کی تسلی کر کے انہیں اپنے گھر واپس بلا لیا...... اور توبہ کی کہ آئندہ خود کام نہیں کریں گے کیونکہ بارہ دن کام کر کے 15 دن بستر پر رہی۔ پھر رمضان آ گئے تھے تو رمضان بڑے سکون سے گزرا۔ اس زمانے میں میں سیریل "نند" کر رہی تھی تو بڑا اچھا وقت گزرا۔"

"ایک سیریل کے اختتام کے بعد دوسری سیریل کے لیے کتنا گیپ دیتی ہیں؟"

"ہر سیریل کے اختتام کے بعد ایک ہفتے کا گیپ ضرور دیتی ہوں اور پھر دوسری سیریل کا اسٹارٹ لیتی ہوں۔ گیپ اس لیے دیتی ہوں کہ تھوڑا

ریسٹ کروں اور دوسری سیریل کی تیاری کروں گیپ میں کچھ رکے ہوئے کام بھی نمٹا لیتی ہوں فیلڈ کے۔"

لیلیٰ واسطی

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمد للہ شاہین صاحبہ۔"

"آپ کا سیریل "ڈنک" دیکھ رہی ہوں۔ بہت ہی اچھا ہے اور آپ بھی بہت خوب صورت نظر آ رہی ہیں؟"

"شکریہ...... آپ کی محبت ہے۔"

"ویسے "ڈنک" کا موضوع بہت حساس اور بولڈ ہے کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... بہت اچھا ٹاپک لیا ہے رائٹر نے...... اور آپ دیکھیں کہ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا، مرد ہو یا عورت ایک جھوٹ سے کتنے گھر برباد اور کتنے بے گناہ لوگ پھنس جاتے ہیں۔

شروع سے آخر تک دیکھیے گا بہت اچھا سیریل ہے۔"

"آپ کو اداکاری ورثے میں ملی ہے...... پھر بھی کوئی مشکل پیش آئی؟"

"نہیں...... کوئی مشکل پیش نہیں آئی، کیونکہ ایک تو والدین اس فیلڈ میں تھے پھر میں نے فلم میکنگ کا کورس UCLA اور USA سے کیا اور چونکہ والدین خود اس فیلڈ سے تھے تو انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور بہت خوش ہوئے جب میں اس فیلڈ میں آئی۔"

"پہچان کس ڈرامے نے دی آپ کو؟"

"بیگم حویلی جو کہ پی ٹی وی سے آن ایئر ہوا تھا اور اعتراف...... بس اس کے بعد تو چل سو چل والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔"

"کام سے فراغت ہو تو وقت کیسے گزارتی ہیں کیونکہ آپ کو تو ہر وقت کام کی عادت ہے؟"

"بے شک مجھے کام کی عادت ہے...... مگر میں فارغ وقت کو بھی انجوائے کرتی ہوں۔ اس لیے کہ یہ بھی نصیبوں سے ہی ملتا ہے۔"

"روزانہ کی روٹین کیا ہے آپ کی؟"

"میں صبح فجر میں اٹھ جاتی ہوں نماز پڑھتی ہوں اور پھر دوبارہ سو جاتی ہوں پھر ساڑھے سات یا آٹھ بجے تک اٹھ جاتی ہوں اپنے کتوں کی خاطر اور اگر دن ہو یعنی شوٹ پر نہ جانا ہو...... تو دوبارہ سو جاتی ہوں اور پھر ساڑھے دس بجے اٹھ جاتی ہوں...... ہاں اگر کام پر جانا ہو تو پھر دوبارہ نہیں سوتی۔ پنکچول میں اپنے وقت کی بہت پنکچول ہوں اور یہ بات میں نے اپنے والد صاحب سے سیکھی ہے۔"

"گویا آپ مارننگ پرسن ہیں؟"

"بالکل...... میں صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اٹھ جاتی ہوں۔ مجھے اٹھتے ہی اپنے پردوں کو کھولنا اور بلائنڈز کو اوپن کرنا اچھا لگتا ہے اور صبح کی جو دھیمی دھیمی روشنی ہوتی ہے وہ بہت پسند ہے پھر اس روشنی میں بیٹھ کر چائے پینا بہت پسند ہے۔"

"کورونا کی وجہ سے آپ ایس او پیز کا تو خیال رکھتی ہی ہوں گی؟"

"جی...... جی میں تو بہت زیادہ خیال رکھتی ہوں۔ ایس او پیز کا کیونکہ آپ کو پتا ہی ہے کہ میں کینسر کی مریضہ رہ چکی ہوں۔ اس لیے میں تو اپنے فارغ وقت میں مطالعہ کرتی ہوں یا گھر میں دیگر کاموں میں مصروف رہتی ہوں۔"

"کہتے ہیں کہ زندگی بڑے بڑے سبق دیتی ہے......؟ آپ نے زندگی سے کیا سیکھا؟"

"بھئی میں نے تو زندگی سے یہی سیکھا کہ اس عارضی زندگی میں وہ کام کر جائیں جو دنیا کے لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوں۔ ہم لوگوں سے اچھا رویہ رکھیں۔ پیار اور ہمدردی سے پیش آئیں۔ ہمدردی اور احساس میں فرق ہوتا ہے کسی کی تکلیف کو اپنے دل میں محسوس کرنا احساس ہے۔ اس وقت یہ نہ دیکھیں کہ جو تکلیف میں ہے وہ کس مذہب کا ہے، کس رنگ کا ہے کس نسل کا ہے بس اس کی مدد کریں، اس کا احساس کریں۔ یہ میں نے زندگی سے سیکھا ہے۔"

"آپ کی سوچ اتنی اچھی ہے...... نوجوان نسل سے کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"میں آپ کو بتاؤں کہ بچپن سے میرے والدین نے ہم بچوں کو سکھایا کہ کچرا باہر نہیں پھینکنا...... گاڑی میں ایک بیگ ہمیشہ ہمارے پاس ہوتا تھا جس میں ہم کچرا جمع کرتے تھے...... اور اس بات پر ہمارے فرینڈز ہمارا مذاق بھی بناتے تھے کہ تم اپنی کار میں "بن" بھی رکھتے ہو۔ تو ہمیں ایسی عادت ہوئی کہ ہم نے بھی کچرا نہ گاڑی سے باہر اور نہ ہی گھر سے باہر روڈ پر پھینکا......

تو میں یہی کہنا چاہوں گی کہ اپنے اردگرد کے ماحول کو صاف رکھیں۔ کیونکہ گندگی ہر طرح کی بیماری لے کر آتی ہے۔ یہ ملک ہماری ماں ہے اپنی زمین کی اپنے گھر کی اپنی دھرتی کی حفاظت کریں اور اسے صاف ستھرا رکھیں۔ اپنے ہی گھر کو کچرا کنڈی نہ بنائیں۔ باہر کے ملک میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا کہ انہیں اپنے ملک سے پیار ہوتا ہے آپ بھی اپنے ملک سے پیار کریں۔"

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکائنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

نی ڈائجسٹ 840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاونٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے "PK44ABPA0010000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو 500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

نی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 20,500 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

رخسانہ نگار عدنان

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے فرحان سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تا کہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر وخزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر وا سے منالے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ بلال اپنے طور پر پتا کروالیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آزر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیختا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آزر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آزر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آزر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آزر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور فرحان سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آزر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آزر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلالیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پر تکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔
کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔
زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔
ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔
سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔
آزر جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔
کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔
ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔
میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تئیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔
کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔
کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھنجھوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔
کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم آ جاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔
حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آ جائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔
ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔
موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آ جائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آ جاتی ہے۔
موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ دپتی اپنے بچے کے ساتھ جو رات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔
آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئرپورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر

متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماضی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہو جاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔

سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر و جیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرے۔ جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مر جائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔

موحد کو ایمان کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کر دی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آزر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروا لیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر پوچھتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہو جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔
کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔
ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔
منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔
زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔
سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔
حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔
منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔
ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔
کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔
زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔
کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔
فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔
موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔
فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔
ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔
کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

اٹھائیسویں قسط

کشف ان ہی قدموں پر بے حس و حرکت یوں کھڑی تھی جیسے اب کبھی ہل نہیں سکے گی۔
اس کے کانوں نے جو سنا تھا، اس کا دل مر کر بھی اس پر یقین نہیں کرتا۔ زینب نے افسردگی سے یوں ہی گردن گھمائی تھی۔
سونیا کی تکلیف کا اس بار اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔
''کشف!'' اس کے لب ہلے۔

سونیا کسی گہری سوچ سے چونکی۔
اس نے ایک نظر زینب کو دیکھا اور پھر اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ ایک لمحے کو اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔
اسے ردا کی موت کا لمحہ یاد آ گیا۔
''کیا کشف نے اس کی بات سن لی ہے۔'' اس کا دل دھڑکا۔
''کیا بکواس کی تھی ابھی آپ نے؟'' اگلے ہی پل وہ اس کے سر پر موجود زور سے دھاڑی تھی۔
دروازے سے اندر آتا، کھانے پینے کا سامان لاتا منصور بھی دھک سے رہ گیا۔
''کشف!'' زینب نے اسے پکارا۔ مگر وہ تو زینب کی طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔
''جو سچ تھا، وہ بولا ہے۔'' سونیا بھی اتنے برس اس سچ کا بوجھ اٹھائے تھک گئی تھی، نڈھال ہو گئی تھی۔
''سچ......؟ یہ کیسا بے ہودہ سچ ہے۔'' وہ جواباً چلائی۔
اس بار سونیا کے چہرے پر اطمینان تھا۔
''یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟'' منصور سے رہا نہیں گیا، آگے بڑھ کر بہن کی ہمدردی میں بول اٹھا۔
''آپ کون ہوتے ہیں مسٹر! مجھ سے کوئی بھی سوال کرنے والے، میں آپ سے تو بات نہیں کر رہی۔'' وہ تڑخ کر بولی۔
کشف کتنی منہ پھٹ ہے۔ اس کا اندازہ زینب کو اس وقت ہو رہا تھا۔
''کشف! میری جان! تحمل سے بیٹھ کر بات کرو۔'' اس نے نرمی سے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے ساتھ لگانا چاہا۔
''یہ عورت خود کو میری ماں کہہ رہی ہے تو آپ کون ہیں زینب منصور! یہی نام ہے نا آپ کا؟ ایک جھوٹ، ایک فریب...... مسلسل فریب۔'' وہ زینب کو پرے جھٹک کر زور سے چلائی تھی۔
شاید وہ اس وقت کسی کی بھی بات سننے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔
''کشف! جو کچھ ہوا......'' سونیا نے خود کو سنبھال کر بات کرنا چاہی۔
''جو کچھ ہوا...... کیا ہوا......؟ آپ کو کچھ اندازہ بھی ہے۔ آپ نے میری پوری زندگی...... میری پوری پرسنالٹی بدل کر رکھ دی۔'' وہ شدید شاک میں تھی، ایک طرف کھڑے موحد نے شدید دکھ سے اس ٹوٹی بکھری لڑکی کو دیکھا۔
جس کو اپنوں کے جھوٹ نے کرچی کرچی کر ڈالا تھا۔
اس کا جی چاہ رہا تھا، اسے بانہوں میں سمیٹ کر یہاں سے کہیں دور لے جائے۔ زینب ششدر سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔
یہ تو وہ جانتی تھی، جس دن کشف کو یہ سب پتا چلے گا تو کیسا طوفان آئے گا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس طوفان میں جو چیز سب سے پہلے بنیادوں سے اکھڑی تھی اور مسخ ہوئی تھی — وہ خود زینب ہو گی۔ وہ جو کہیں نہ کہیں اپنی 'نیکی' کے زعم میں مطمئن تھی کہ بہر حال اس سارے قصے میں اس کا کردار نیکی کے فرشتے کا سا رہا ہے تو اس کہانی کا کوئی بھی کردار اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔
اس کا یہ زعم ہی سب سے پہلے دھڑام سے گرا تھا۔
''یہ سچ ہے کشف! میں تمہاری ماں ہوں مگر......'' سونیا جو ایک ہی جملے میں ساری کہانی بیان کر دینا چاہتی

تھی، چند لفظ بول کر ہی اسے اندازہ ہو گیا، یہ اتنا آسان نہیں ہے۔

"میں مر کر بھی آپ کو اپنی ماں تسلیم نہیں کروں گی، نہ کر سکتی ہوں۔ مجھے صرف یہ جاننا ہے کہ میں کس کے گناہ کا پھل ہوں۔ اس کے بعد میں جیوں یا مروں، کسی کو بھی اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ زہریلے نفرت بھرے لہجے میں بولتی سونیا کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا پانی تھا کہ آج اسے اپنے آنسوؤں پر بھی اختیار تھا۔ وہ انہیں بہنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

"یہ مت کہو، تم خدانخواستہ کسی گناہ کا نتیجہ نہیں۔" سونیا تڑپ اٹھی تھی۔ "تم بیٹی ہو میری۔ جسے تا عمر میں سینے سے لگانے کے لیے تڑپتی رہی ہوں۔ میرے مرحوم شوہر منصور کی جائز اولاد۔"

منصور نے چونک کر بہن کو دیکھا۔

یہ قصہ تو اس کی سمجھ سے بھی بالاتر تھا، یہ سب کیونکر اور کیسے ہوا، شاید اس کا بوجھ اٹھائے، اس کے ہاتھ شل ہونے کو تھے۔

اس نے سامان وہیں قریب پڑی کرسی پر رکھ دیا۔

شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔

اور یہ شام تو شاید اسی دن سے اس گھر کے در و دیوار پر ٹھہر گئی تھی جس دن وہ زینب سے واپسی کے جھوٹے وعدے کر کے یہاں سے گیا تھا۔ جانے سے چند دن پہلے اس نے آکاس بیل کے جو بیج اندرونی برآمدے کے ساتھ کچی زمین میں بوئے تھے، اس کی بیل بھی شاید اب تو بوڑھی ہو چلی تھی۔ اس کے پتوں پر ہریالی کے بجائے زردیاں تھیں۔

ویسی ہی زردیاں جیسی اس وقت زینب کے چہرے پر تھیں۔

جس نے مروت میں دونوں بہن بھائی کے جھوٹ کا بوجھ اٹھایا تھا اور پھر بھی جھولی میں فریبی کا لقب آیا تھا۔

اس نے کرسی کی بیک کو دونوں ہاتھوں سے شاید خود کو گرنے سے بچانے کے لیے تھام رکھا تھا۔

اور یہ تو منصور کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ کشف سونیا کی بیٹی ہے اور اس کا شوہر کوئی منصور نامی شخص تھا۔ وہ الجھ گیا۔

☆☆☆

منصور کو ملک سے باہر گئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے، جب سونیا کو تیز بخار نے آ لیا۔

وہ مسلسل بے ہوشی میں منصور منصور کہہ کر پکارے جا رہی تھی۔

ہاجرہ تائی کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔ سونیا کے بخار کو چوتھا دن تھا۔ محلے کے کمپاؤنڈر سے دوائی لاتے سونیا کو پلاتے تین دن ہو چلے تھے۔ مگر اس کا بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"سونیا! میری بچی! آنکھیں تو کھول۔ تو نے منصور کے جانے کا اتنا غم کیوں لیا بچی۔ وہ ہم سب کی بھلائی کے لیے باہر گیا ہے۔ تو خود کو سنبھال، یہ تھوڑا سا دلیہ دو چار چمچ لے لے۔ میں تجھے دوائی دوں۔" ذرا سی ہوش میں آتی سونیا کو دیکھ کر ہاجرہ فریاد کرتے ہوئے رونے لگیں۔

زینب پاس ہی کھڑی تھی۔

دل تو اس کا بھی منصور کے جانے سے ٹوٹ چکا تھا مگر جو سونیا کی حالت تھی، وہ دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔

ہاجرہ کی کوئی جاننے والی نرس ہسپتال میں کام کرتی تھی۔

ہاجرہ کسی طرح منت ترلے کرتے اسے اپنے ساتھ لے کر آئیں۔
زینب کو ابھی بھی ایک سو تین درجے کا بخار تھا۔ اس کا چہرہ اتنا پیلا پڑ چکا تھا، جیسے وہ مرنے کے قریب ہو۔
نرس نے بڑی تفصیل سے نیم بے ہوش سونیا کا معائنہ کیا۔
اس کے چہرے پر گہری فکر سی تھی۔ جس سے ہاجرہ اور بھی پریشان ہونے لگی تھیں۔
"شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے اس کی؟" وہ اب اس کے پیٹ پر ٹونٹیاں رکھتے چیک کر رہی تھی۔
اور ہاجرہ کو لگا، وہ کھڑے قد سے زمین پر آ گری ہیں۔
"شادی؟" ان کے لب بمشکل ہلے۔
"ساتواں مہینہ لگا ہوا ہے، بچہ کمزور ہے۔ اسے شاید کوئی شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے، جس کی وجہ سے یہ حالت ہوئی ہے۔ اس کے شوہر کو بلالو، جہاں بھی ہے۔ شاید اسے دیکھ کر یہ کچھ بہتر ہو جائے۔"
نرس اپنے پروفیشنل انداز میں بولے جا رہی تھی اور ہاجرہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
"یہ دوائی میں نے لکھ دی ہے بخار کے لیے۔ دو خوراکیں دینے سے ان شاء اللہ بخار اتر جائے گا۔ زیادہ بہتر ہو گا، اسے پھل فروٹ، یخنی اور گوشت قیمہ وغیرہ دو۔ کمزوری بہت ہے۔ اسے خوراک کی کمی ہے، اس لیے بی پی بھی لو جا رہا ہے۔" سونیا کی آنکھیں کھلی تھیں۔
نرس نسخہ لکھتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔
اور ہاجرہ کو تو لگا، وہ شاید اب کبھی بول ہی نہ سکیں گی۔
یا اگر بولی بھی تو سونیا کا قتل کر ڈالیں گی۔
انہوں نے سونیا کی حالت دیکھی، نہ اس کا ساتواں مہینہ اور نہ اس کا بخار۔ نرس کے جاتے ہی جو اسے پیٹنا شروع ہوئی، زینب دو بار سونیا کو بچاتے ہوئے دھکا کھا کر پیچھے ہٹی۔
ہاجرہ میں تو جیسے کوئی جن آ گیا تھا۔
"بتا نامراد! نا ہنجار! بدکردار...... یہ کس کے گناہ کا پھل اٹھائے پھر رہی ہے۔ اتنا گندا کھیل تو نے کب کھیلا اور کس مردود کے ساتھ...... تو جیتے جی زہر کھا کر مر کیوں نہ گئی۔" ہاجرہ اسے پیٹے جا رہی تھیں اور جو منہ میں آتا بولتی جا رہی تھیں۔
"تائی! بس کر دیں۔ خدا کے لیے یہ مر جائے گی۔" زینب سونیا کو بچاتی ہانپ گئی تھی۔
"مر جائے...... کل کی مرتی آج، ابھی مر جائے۔ میں خوشی خوشی اس کو قبرستان میں دبا آؤں گی۔ جسے ہماری عزت کی قبر کھودتے حیا نہ آئی، میں اس کا جسم دفناتے کیوں حیا کروں گی۔ بول کیا ہے...... یہ کس کا گناہ ہے مردود؟"
وہ اسے مارتے مارتے نڈھال ہو گئیں۔
زمین پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔
"نکاح کیا ہے میں نے منصور سے۔ میرے ساتھ دفتر میں کام کرتا تھا۔" سونیا رو نہیں رہی تھی مگر اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔
"تیرے مرے ہوئے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اس دنیا کا کیسے سامنا کروں گی...... تجھے ذرا حیا نہ آئی۔ ایسی کیا آگ لگی تھی تجھے کہ نکاح کر لیا۔" وہ پھر سے اسے اٹھ کر مارنے لگیں۔
"بلا اسے ابھی...... ابھی میں تجھے ہاتھ پکڑ کر ان تین کپڑوں میں یہاں سے دھکا دیتی ہوں، جس مردود نے ہماری عزت کو بٹہ لگایا ہے، وہ لے جائے تجھے یہاں سے۔ بلا اسے......" وہ زور سے چیخیں۔

”کیسے بلاؤں، مر گیا ہے وہ۔ اپنے گاؤں جاتے ہوئے ایکسیڈنٹ میں۔“ سونیا ہسٹریائی انداز میں چیخی۔
اور ہاجرہ تو چیخ بھی نہ سکیں بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

اس نے بہت سال پہلے سگریٹ پینا ترک کر دی تھی۔
مگر کل کی پوری رات اور آج کا دن سوائے ایک بار طاہرہ بیگم کی عیادت کو ہسپتال جانے کے وہ سارا وقت کمرے میں بند خود کو سگریٹ کے گاڑھے دھوئیں میں اڑانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔
اس نے حمزہ اور رمشا کو ہاسپٹل بھجوا دیا تھا۔
طاہرہ بیگم کی حالت سنبھل چکی تھی۔
مگر اسے لگتا تھا، وہ اپنی ماں کا سامنا بھی اب کبھی نہیں کر سکے گا۔
جب انہیں سونیا کی بدکرداری کا پتا چلے گا۔
”کیسے مرد ہو تم آزر! تمہیں ایک پاک باز عورت اور بدکردار عورت کا فرق بھی نہ پتا چل سکا۔“ ان کا پہلا طعنہ آزر کے لیے یہی ہونا تھا۔
اور یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔
وہ کیسا مرد تھا جو اپنی دو چہروں والی عورت کو نہ پہچان سکا۔ تف ہے تم پر آزر احمد...... وہ رہ رہ کر خود لعن طعن کر رہا تھا۔
بچے اس سے سونیا کے بارے میں مسلسل پوچھے جا رہے تھے۔
وہ چیخ چیخ جودھڑلے سے وہ خود سے بولے جا رہا تھا، ان سے بولنا دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔
”اور وہ لڑکی...... کشف......“ یہ سوچ ہی اس کا خون کھولا دیتی۔
سونیا کی بیٹی...... اس کا جی چاہتا، خود کو پھندا دے لے۔
پہلے دن سے اسے کشف سے ایک نامعلوم سا بیر تھا۔ ایک ان دیکھی دشمنی کہ یہ لڑکی اسے کبھی نہیں بھائی تھی۔
تو اس کے بغض کی یہ وجہ تھی۔ آج وہ اپنی دشمنی کو حق پر سمجھتے ہوئے اپنی چھٹی حس کو شاباشی دے رہا تھا جس نے ہمیشہ اسے کشف سے فاصلے پر رکھا۔
اس کا فون مسلسل بجنے کے بعد بند ہوا اور پھر سے بجنے لگا۔
اس نے گہرا سانس لے کر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ایش ٹرے میں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ کا ٹکڑا مسلا۔
حمزہ کی کال تھی۔
”ہاں بولو۔“ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لہجے کا کھردرا پن کم نہیں کر سکا تھا۔ دونوں باپ بیٹے کے درمیان ایک ان دیکھی خلیج تھی، جو کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔
”دادو کو ہاسپٹل سے ڈسچارج کر رہے ہیں، آپ ہاسپٹل آ جائیں۔“
اس نے باپ سے بھی زیادہ روکھے لہجے میں اطلاع دی اور آزر کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔
”اماں جان گھر آ رہی ہیں، پہلے تو وہ اس بات پر نالاں ہوں گی کہ سونیا انہیں دیکھنے ہاسپٹل کیوں نہیں آئی اور پھر وہ گھر میں بھی موجود نہیں...... یا اللہ میں کیا کروں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

☆☆☆

”تو یہ وجہ تھی کہ ساری زندگی آپ مجھے کبھی بھی اچھی نہیں لگیں۔ نہ پھوپھی کے رشتے میں اور اب......“ اس

نے ہونٹ بھینچ لیے۔

کشف کا جی چاہ رہا تھا، خود کو یہاں سے کہیں غائب کر لے۔ کوئی بھی، کبھی بھی اس کی شکل نہ دیکھ سکے۔

"کشف! غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ سونیا سے بھی غلطی ہو گئی۔ اس کی نیت بری نہیں تھی اور وہ تمہیں......" زینب کو نا چاہتے ہوئے بھی پھر سونیا کی صفائی دینے کے لیے کشف سے بات کرنا پڑی۔

"آپ چپ کر جائیں۔ میں آپ سے بات نہیں کر رہی۔ اور میرا آپ سے رشتہ ہی کیا ہے...... کون ہوں میں آپ کی؟"

اس نے جس لہجے میں کہا۔ زینب کو لگا جیسے اس کے دل پر کسی نے آری چلا دی ہو۔ اس نے بہت برداشت کیا مگر دل سے جیسے لہو بہہ نکلا تھا اور درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں تھیں، جنہیں وہ دبانا چاہتی تھی لیکن شاید اس کی برداشت نے بھی آج ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ اپنے بازو اور سینے کو دباتی ایک طرف گر سی گئی۔

☆☆☆

بلال ایما کے ساتھ ریسٹورنٹ میں موجود تھا۔

ایما کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

وہ بلال کی سنگت میں بہت خوش تھی، جیسے اسے دو جہان کی دولت مل گئی ہو۔

"بلال! ہم شادی کے فوراً بعد کینیڈا موو کر جائیں گے۔ کینیڈا ایک آئیڈیل کنٹری ہے، جہاں ہم اپنا گھر بنائیں گے اور ایک محبت بھری خوب صورت زندگی اسٹارٹ کریں گے۔" وہ گلدان میں پڑے گلاب کے پھول کو نکال کر سونگھنے لگی۔

وہ اس وقت خوشی اور محبت سے سرشار تھی۔

بلال بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"سوری ایما!" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"کیا کچھ کہنا چاہتے ہو تم؟"

"میں تمہارے پرپوزل سے ایگری نہیں کرتا۔" اس نے صاف اور قطعی انداز میں کہا۔

ایما کے چہرے پر الجھن تھی۔ یہ تو وہ سمجھ رہی تھی کہ بلال اس کے ساتھ بہت زیادہ خوش نہیں ہے مگر وہ کچھ ایسا ناراض بھی نہیں کہ اس رشتے سے ہی انکار کر دے۔

"میں کینیڈا نہیں موو کروں گا۔ میرا گھر، میرے پیرنٹس یہاں ہیں۔ میں کیسے کہیں اور جا سکتا ہوں۔" اس کے لہجے میں لچک نہیں تھی۔

"مگر یہ بات تو تمہاری مام کے ساتھ ڈن ہو چکی ہے، میں نے اور مام نے ان سے بات کی تھی۔" وہ رکی۔

"شی از وری ہیپی۔" وہ جتا کر بولی۔

"مے بی۔" بلال نے کندھے اچکائے۔

"لیکن میں نہیں جا سکتا۔ میری یہاں جاب ہے، کمٹ منٹس ہیں۔ دوست، تعلق...... میں سب کچھ چھوڑ کر نہیں جا سکوں گا ایما! شادی کے بعد تمہیں وہیں رہنا ہوگا جہاں میں رہوں گا اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، ہم یہاں بہت خوش رہیں گے۔" وہ بولتے بولتے قدرے نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

ایما لب بھینچے اسے سن رہی تھی، جیسے اسے بلال کی بات بہت ناگوار گزر رہی ہو۔

"کچھ عرصہ ہم وہاں جا کر رہیں گے، اگر تمہیں اچھا نہ لگے یا تم سیٹل نہ ہو سکے تو ہم واپس آ سکتے ہیں۔" ایما نے اپنے تئیں بیچ کی راہ نکالی۔

”نہیں۔ یہ پاسبل نہیں ہے۔“ بلال کا لہجہ قطعی تھا۔
وہ اسے دیکھتے ہوئے آنکھوں میں نمی لے آئی۔
وہ اس کی نیلگوں آنکھوں کی نمی سے کچھ متزلزل سا ہو گیا۔
”تم اس پر سوچ لو ایما! اچھی طرح سے۔ ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں ایک دوسرے کو ٹائم دینا چاہیے۔ بہر حال شادی اتنا آسان فیصلہ نہیں ہے۔“
اس نے جتا کر کہا تو ایما آنکھیں ٹشو سے صاف کرتی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

”بہت شدید ہارٹ اٹیک ہوا ہے، دعا کریں یہ اسٹیبل ہو جائیں۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“
ڈاکٹر کہہ کر گیا تھا۔
موحد کو خود بھی اندازہ ہو گیا تھا جس طرح کی زینب کی حالت تھی، ہاسپٹل پہنچنے تک بچ جانا ہی بہت بڑا معجزہ تھا۔
اور اس دوران اگر دوسرا اٹیک ہو جاتا تو پھر یہ کوشش بے کار جاتی۔ عجیب سی انسیت ہو چکی تھی موحد کو اس خاموش طبع، پرسکون چہرے اور اداس آنکھوں والی عورت سے۔ جس سے بات کر کے موحد کو ہمیشہ اپنے پن کا احساس ہوا جبکہ سارے بھید کھل جانے کے بعد وہ کہیں سے بھی اس کی اپنی نہیں تھی۔ اس کے باوجود کشف کا زینب کو بغیر بتائے موحد کے ساتھ چلے جانا اسے بھی اچھا نہیں لگا تھا۔
اور یہاں آ کر جس طرح حالات بدلے، تو شاید واپس آنا ہی بہتری تھی لیکن یہ کیسی بہتری تھی جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔
سونیا سر جھکائے ایک طرف بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے روئے جا رہی تھی، منصور ایک طرف رنجیدہ چہرہ لیے کھڑا تھا۔
زریں اس کے ساتھ مگر جیسے بالکل لاتعلق سی کھڑی تھی۔
اور کشف بے تاثر چہرہ لیے دیوار سے کمر لگائے، ان سب سے دور اکیلی کھڑی تھی۔
موحد کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔
اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ اس کی نظریں اس چہرے پر آ کر رکی تھیں۔ وہ ہمیشہ ہی ہار جاتا تھا جب بھی کشف کو دیکھتا تھا۔
لیکن اس وقت وہ جس ٹرانس میں نظر آ رہی تھی شاید اسے کسی ہار جیت کی پروا رہی تھی نہ فکر۔
وہ چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔
لمحہ بھر خاموش رہا کہ شاید وہ پوچھے، ڈاکٹر نے کیا کہا ہے مگر وہ بے حس کھڑی رہی تھی۔
”تمہیں آنٹی سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی، بہر حال اتنے سال انہوں نے تمہاری پرورش ایک بیٹی کی طرح صرف کی ہی نہیں، تمہیں اپنا سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔“ وہ اس کے پہلو میں کھڑا اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔
وہ اسی طرح لب سیے کھڑی رہی۔
”وہ ٹھیک نہیں ہیں کشف! انہیں تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ آخر میں اس نے احساس دلانے کو کہا۔
مگر وہ جیسے کچھ بھی سن نہیں رہی تھی۔
”آپ نے واپس کب جانا ہے؟“ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بے تاثر لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
موحد نے چونک کر اسے دیکھا۔

"واپس...... ابھی کیسے جاسکتا ہوں۔ آنی کی کنڈیشن جب تک اسٹیبل نہیں ہوتی۔" وہ رک کر بولا۔
"آپ کا ان سے کیا تعلق ہے...... کیا رشتہ ہے؟" وہ الٹا چیخ کر بولی۔
وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔
کتنی جلدی اس نے ہر تعلق، ہر رشتہ اس عورت سے توڑ لیا تھا۔ جو ساری عمر بے غرض اس کو سینے سے لگائے رہی، زمانے کے ہر سرد و گرم سے بچانے کے لیے۔
"ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے ان سے انسانیت کا تعلق ہے اور محبت اور احساس کا رشتہ ہے۔ تمہارے ساتھ......"
"میرے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے؟" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔
"یوں بھی میں یہاں سے جلد سے جلد جانا چاہتی ہوں، ان جھوٹے، دغاباز رشتوں کے بیچ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"
اس نے ایک نفرت بھری نظر سر جھکا کر روتی سونیا اور منصور پر ڈالی۔ موحد کو اس کی سوچ پر افسوس ہوا۔
"تم چاہو تو گھر جاسکتی ہو۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
"کون سا گھر؟" وہ تلخی سے بولی۔ "کوئی گھر نہیں ہے میرا۔" وہ خلا میں نگاہیں گاڑ کر یوں بولی کہ کہیں آنسو اس کا بھید کھول نہ ڈالیں۔ موحد دکھ بھری نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

"تم انسان ہو، مشین تو نہیں۔" اس کی انگلیاں تیز تیز ٹائپ رائٹر پر چلتی جارہی تھیں۔
جب کسی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ سختی سے رکھا۔
سونیا تھکن بھرا گہرا سانس لے کر رہ گئی۔
"کبھی کبھی انسان کو مشین بھی بننا پڑتا ہے منصورا!" وہ اسی تھکی ہوئی مسکراہٹ سے بولی۔
"صرف ایک انسان کیوں؟ تمہارا بھائی خود کچھ کیوں نہیں کرتا۔" وہ جتا کر تلخی سے بولا۔
"وہ کرے گا ناں، جب ملک سے باہر چلا جائے گا۔" سونیا نظریں چرا کر بولی۔ منصور کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔
"جو شخص ملک میں کچھ نہ کرسکا، وہ باہر جا کر کیا کرے گا۔ تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔"
"مجھے یہ سمجھ میں آتی بھی ہو تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا منصورا! یہ میری ماں اور بھائی کا خواب ہے کہ وہ ملک سے باہر جا کر ڈالروں میں کمائے اور ہمارے سارے خواب پورے کرے۔" وہ رٹے رٹائے انداز میں بولی۔ منصورا سے افسوس بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔
اماں نے یہ ضد یوں پکڑی تھی، انہیں پتا تھا، ان کی نک چڑھی، نخریلی بہن سونیا کو آزر کے لیے بیاہ تو لے جائے گی مگر ساتھ میں بھاری بھرکم جہیز ہوگا تو ہی یہ ممکن ہوسکتا ہے۔
یہ بھاری بھرکم جہیز یہاں کی کمائی میں ممکن نہیں تھا۔
پھر جانے کیا ہوا، سونیا کو ماں بھائی حتیٰ کہ پردیس میں بیٹھی طاہرہ بیگم اور ان کے بیٹے سے ان دیکھی نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ سب اسے خود غرض اور بے حس لگنے لگے۔
اماں نے سونیا کی نوکری کی بات طاہرہ سے چھپا رکھی تھی اور یہ کہ گھر کی ساری ذمہ داری اکیلے منصور نے اٹھا رکھی ہے۔
اس کی اتنی محنت اور قربانی کا نہ کوئی شمار تھا، نہ ذکر۔

اس سے بس اور ایڈوانس اور ایڈوانس کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ منصور کا ویزا لگنا ہے...... منصور نے اسلام آباد جانا ہے...... ٹکٹ کے پیسے...... تیاری کے پیسے اور جانے کون کون سے خرچ جس کے لیے وہ ایڈوانس لیتی چلی گئی۔ نتیجتاً اس کی تین چوتھائی تنخواہ ایڈوانس کی قسطیں چکانے میں لگ جاتی۔

جبکہ اماں کو اس کا احساس تھا نہ میر منصور کو۔

انہیں تو بس پوری تنخواہ اور اضافی ایڈوانس چاہیے ہوتا تھا۔

اور پھر آفس میں منصور نے اسے کچھ ایڈوانس لے کر دیا، اس کی ہمدردی سونیا کے لیے دن بدن بڑھتی چلی گئی۔

یہ ہمدردی کب چاہت میں بدلی، دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔

"میں تمہارے گھر آنا چاہتا ہوں سونیا! تمہارا ہاتھ مانگنے۔ تمہاری اماں اور بھائی سے......" اس نے بالآخر ایک دن دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

"نہیں نہیں...... خدا کے لیے منصور! ایسا سوچنا بھی مت۔" وہ اماں کے جلال بھرے چہرے کا ہی سوچ کر لرز کر رہ گئی۔

"کیا ہو گیا ہے سونیا! میں کچھ غلط تو نہیں کرنے جا رہا جو سیدھا اور شرعی طریقہ ہے۔" سونیا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

وہ نرمی سے اسے سمجھانے لگا۔ وہ بس نفی میں سر ہلاتی رہی۔

"نہ میری اماں مانے گی، نہ بھائی۔" وہ آنکھوں میں آئے آنسو پی کر بولی۔

"تو کیا کریں گے ہم؟" وہ بے بسی سے بولا۔

"صبر......" وہ دکھ سے ہنسی۔

"ناممکن...... مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"کرنا پڑے گا منصور!" وہ بے چارگی سے بولی۔

"ایک راستہ ہے ناں۔" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

"کون سا؟" وہ ناامیدی سی تھی۔

اس محبت نے اس کے دل میں نئی جوت جگا دی تھی۔

"ہم دونوں نکاح کر لیتے ہیں۔ بعد میں تم اپنے گھر والوں کو بتا دینا پھر تو وہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔" وہ مزے سے سب بتا کر مسکرا دیا۔

وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"میں اپنے گھر والوں کو دھوکا نہیں دے سکتی۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"یہ دھوکا نہیں ہے۔" وہ زور دے کر بولا۔

"ہے دھوکا۔" وہ کسی صورت نہیں مانی۔

اماں کے لیے سب کچھ صرف منصور اور اس کی خواہشات تھیں۔ انہیں کولہو کے بیل کی طرح دن رات کام کرتی سونیا نظر نہیں آتی تھی۔ جہاں سونیا دن بھر دفتر میں جتی رہتی، زینب گھر کے سارے کام کسی مشین کی طرح کرتی اور پھر ٹیوشنز پڑھاتی مگر پھر بھی منصور تھا اور اس کے خواب!

آج بھی جب اماں نے اسے مزید ایڈوانس کا کہا تو وہ غصے میں پھٹ پڑی۔

"وہاں میرا باپ نہیں بیٹھا جو مجھے ہر مہینے ایڈوانس دے دے گا۔ آپ کو یہ نظر نہیں آتا۔ میں کس طرح دن رات محنت کر رہی ہوں، صرف بیٹے کی ضرورتیں، اس کی خواہشیں نظر آتی ہیں اماں! میں بھی انسان ہوں اور تکلیف مجھے بھی ہوتی ہے۔ خدا کے لیے میرا بھی احساس کریں۔"

اور یہی بات اماں کو بری لگ گئی۔
''تو ٹھیک ہے تو گھر بیٹھ، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ رہی تیرے کمانے کی بات...... ایک ایک پائی تیری تنخواہ کی قرض ہے مجھ پر اور میرے میرو پر۔ جیسے ہی یہ باہر جائے گا سب سے پہلے تیرا قرض چکائے گا۔ چاہے تو پکے کاغذ پر لکھوا لے۔''
اور پھر اس نے گویا ناک رگڑ کر اماں سے معافی مانگی تو اس کا چھٹکارا ہوا۔ اس دن اسے لگا کہ فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہیں۔
اور اس نے فیصلہ کر ڈالا۔
دونوں نے نکاح کر لیا۔
وہ دن سونیا کی پوری زندگی کے سب سے خوب صورت دن تھے۔
اس نے اوور ٹائم بھی ختم کر دیا۔ اب وہ والا ٹائم اس نے منصور کے ساتھ گزارنا شروع کر دیا۔ جو چند دنوں میں گاؤں جانے والا تھا۔ اپنی ماں کو بتانے کے لیے۔
''واپسی پر اگر تمہارے گھر والے نہیں مانے تو تم بھی میرے ساتھ گاؤں چلنا۔ وہاں ہمارا گھر ہے، تھوڑی سی زمین ہے۔ ہماری گزر بسر کے لیے کافی ہے، سب کچھ۔'' وہ اسے پیار بھری تسلیاں دیتا۔
اور دل کو تو اس نے بھی سمجھا لیا تھا کہ اگر اس کے گھر والے اتنی خود غرضی دکھا سکتے ہیں تو وہ کیوں قربانی کا بکرا بنی رہے۔
اس نے اپنی مرضی کی زندگی جینا شروع کر دی۔
منصور کو گاؤں جانے کے لیے چھٹی ملنے میں کافی وقت لگ گیا۔ اس دوران انہیں بچے کے ہونے کا بھی پتا چل گیا، جس نے سونیا کی نیندیں ہی اڑا دیں۔
''تم ذرہ برابر بھی فکر نہیں کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اماں کو گاؤں سے لے کر آتا ہوں۔ وہ تمہاری اماں سے بات کریں گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس کی محبت کی طرح اس کی تسلی بھی بڑی خوب صورت تھی۔
وہ جھوٹا تھا، نہ دغا باز...... بس بد نصیب تھا۔
منصور کے پاکستان سے جانے کے کچھ دن بعد وہ بھی اپنی ماں کو گاؤں سے لینے کے لیے گیا۔
اور اگلے ہی دن خبر ملی کہ وہ گاؤں جاتے ہوئے بس حادثے کا شکار ہو گیا۔
بس کی ٹکر ایک ٹرک سے ہوئی اور بس کے آدھے سے زیادہ مسافر مر گئے جن میں منصور احمد بھی تھا۔
اس کے آفس کے لوگ اس کے جنازے میں بھی گئے۔
اور سونیا کی تو دنیا وہیں تاریک ہو گئی۔ وہ گھر میں کیا بتاتی۔
وہ گھر سے آفس کے لیے نکلتی اور کسی تنہا پارک میں بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے روتی رہتی۔
اس دوران اس نے کئی بار سوچا کہ وہ اپنی جان لے لے، خودکشی کر لے مگر پھر اس بچے کا خیال آتا جسے ابھی اس دنیا میں آنا تھا۔
مگر وہ کس طرح سب کو بتائے گی اور کون اس کی کہانی پر یقین کرے گا کہ اس نے واقعی نکاح کیا بھی تھا یا نہیں۔
ان ہی سوچوں اور پریشانیوں میں اسے ٹوٹ کر بخار آ گیا اور پھر سب کو سب کچھ پتا چل گیا۔
اس کے سچ بتانے پر بھی کسی کو اس کا یقین نہیں آیا۔

☆☆☆

وہ اپنے کولیگ کی عیادت کے لیے ہاسپٹل آئے تھے۔

دل عجیب سا ہو رہا تھا۔
رہ رہ کر زینب کا خیال آ رہا تھا۔ اس سے ملے کئی ہفتے گزر گئے تھے اور ایسا پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔
دونوں میں کبھی اتنے فاصلے نہیں آئے تھے۔
شدید مصروفیت میں بھی دونوں ایک دوسرے کے حال احوال اور مصروفیت سے باخبر رہے تھے۔
وہ کولیگ کی عیادت کر کے کمرے سے نکلے تو دل میں تہیہ کر لیا۔ چاہے کسی بہانے سے ہی وہ آج زینب کی طرف ضرور جائیں گے۔
ہاسپٹل کے برآمدے سے بیرونی دروازے کی طرف مڑتے حیدر کی بے ساختہ نظر ایک طرف کھڑے منصور پر پڑی۔
وہ اپنے قدموں کو روک نہیں سکے۔
"خیریت منصور بھائی! یہاں کیسے؟" بلال اور ایما کے رشتے سے پہلے حیدر اور منصور میں کبھی بھی نہ اچھے تعلقات رہے نہ ایسی بے تکلفی والی علیک سلیک۔ منصور بھی حیدر کو دیکھ کر لحہ بھر کو چونکا۔
"زینب کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" اور حیدر کو لگا، یہ اچانک خبر سن کر شاید ان کا دل بند ہو رہا ہے۔
"کیسے...... کیا ہوا؟" وہ گھبرا گئے۔
"بس یونہی طبیعت خراب ہو گئی۔" منصور کا لہجہ مبہم تھا۔
"یونہی؟" انہوں نے بے یقینی سے دہرایا۔
موحد، سونیا، زریں سب ہی تو تھے وہاں۔
وہ بے سکون سے مڑے اور ان کی نظریں دیوار کے ساتھ کھڑی کشف پر پڑیں۔
وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھے۔
"کشف بیٹا...... میری جان! کیسی ہو؟" ان کے نزدیک کشف ابھی بھی وہی چھوٹی گڑیا ہی تھی جو انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف لپک کر آتی تھی اور وہ ہاتھ میں پکڑے چاکلیٹ اور کینڈیز کا پیکٹ پیچھے چھپا لیتے انہوں نے آگے بڑھ کر کشف کو اپنے ساتھ لگایا، اس کے خود پر باندھے بند جانے کیسے ٹوٹ گئے۔
وہ ان کے گلے لگ کر بے آواز آنسوؤں سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سونیا اسے یوں روتا دیکھ کر لرز اٹھی۔ روتی ہوئی کشف کے قریب پہنچ کر وہ بے قراری رک گئی۔
"کشف! مت رو میری جان!" جانے کیسے سونیا کے منہ سے پھسلا اور دوسرے لمحے کشف کرنٹ کھا کر سیدھی ہو گئی۔
"آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا مجھے کچھ بھی بولنے کا۔" وہ غصے اور نفرت سے چلائی۔
منصور نے کچھ ناگواری سے اسے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔
حیدر نے چونک کر کشف کو دیکھا۔
"چلو آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسے کندھے سے تھام کر اپنے ساتھ لے گئے۔ موحد نے اسے دور جاتے دیکھا۔
کیا وہ کبھی اس طرح اس کے نزدیک آ سکے گی۔
وہ بس دل میں سوچ کر رہ گیا۔ ایسا ہونا شاید ممکن نہیں تھا۔
"وہ میرے نکاح میں ہے۔ مجھ سے دور بھلا کیسے جا سکتی ہے۔ میں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کیوں سوچ رہا ہوں۔" وہ خود پر غصہ کرنے لگا۔

☆☆☆

طاہرہ بیگم کو وہیل چیئر سے گاڑی میں منتقل کرتے ہوئے بھی آزر کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔
"یہ تمہاری بیوی کا دماغ کچھ زیادہ خراب نہیں ہو گیا۔"
ان کے لہجے میں کمزوری تھی مگر طمطراق اسی طرح تھا۔
"آپ پرسکون رہیں اماں! ڈاکٹر نے آپ کو سکون سے رہنے کا کہا ہے۔ اپنے دماغ پر کوئی ٹینشن سوار نہ کریں پلیز۔" پیچھے بیٹھی رمشا نے باپ کے بے سکون چہرے کو دیکھا جو خود ماں کو پرسکون رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔
"کچھ ہوا ہے ایسا، بہت برا...... جو پاپا اتنے ڈسٹرب ہیں۔ اس طرح تو میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔" وہ باپ کو دیکھ کر سوچنے لگی۔ جواب لب بھینچے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔
"میں پرسکون تب ہی ہوں گی جب مجھے سکون نصیب ہو گا۔ تمہارے گھر میں، تمہاری بیوی کے ہوتے ہوئے کم از کم میں تو سکون سے نہیں رہ سکتی۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولیں۔
"فکر نہ کریں۔ وہ آپ کو بے سکون کرنے کے لیے گھر میں موجود نہیں ہے۔" طاہرہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
"اب اس بات کا کیا مطلب؟" وہ تنک کر بولیں۔
"پلیز اماں! کچھ دیر ریلیکس کریں۔ جو بات بھی ہے، گھر جا کر کیجیے گا۔" وہ سخت اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔
رمشا نے باپ کو دادی سے اس طرح بات کرتے بہت کم دیکھا تھا۔
"یہ حمزہ کہاں چلا گیا؟" آزر کو ذرا دیر سے خیال آیا۔
"اس کے کسی دوست کی کال آ گئی تھی تو کسی کام کا کہہ کر چلا گیا۔" رمشا نے آہستگی سے کہا۔
"تمہیں اور دادی کو اکیلا چھوڑ کر ہاسپٹل میں......" وہ جتا کر بولا۔ رمشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"ظاہر ہے اولاد کس کی ہے۔ اس سونیا کی جس میں خود ذرا سا احساس نہیں ہے۔ ہمیشہ اسے لطف آتا رہا ہے خود سری کر کے تو بیٹا ماں کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلے گا۔"
طاہرہ بیگم لقمہ دینے سے باز نہیں آئیں۔
جتنا اس وقت آزر کی خواہش تھی کہ سونیا کا نام بھی اسے کہیں سنائی نہ دے، تو دور کی بات...... اتنا ہی طاہرہ بیگم اس کا نام دہرائے جا رہی تھیں۔ آزر کو شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز کر دی۔

☆☆☆

وہ گاؤں تھا نہ قصبہ، جہاں ہاجرہ انہیں لے کر شام ڈھلے پہنچی تھیں۔ سونیا کی حالت اچھی نہیں تھی تو حالت تو زینب کی بھی اچھی نہ تھی۔ اسے دو دن سے بخار آ رہا تھا۔
مگر ہاجرہ سونیا کی ماں تھیں، زینب کی نہیں۔
وہ خود ہی پین کلر کھا کر خود کو کام کرنے کے قابل بنائے ہوئے تھی۔
نرس نے کہہ دیا تھا، بچے کی پیدائش میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ شاید پری میچور برتھ ہو جائے جو کسی بھی وقت متوقع ہے۔
ہاجرہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
وہ تو سونیا کو زہر دینے تک کا سوچ چکی تھیں جب نرس نے ہی انہیں اپنے گاؤں میں اپنے گھر بھجوا دیا، جو بند پڑا تھا۔
نرس ان کے ساتھ آئی۔ اردگرد کے لوگوں سے ان تینوں کا تعارف اپنی رشتہ دار بن کر کرایا۔
اور اگلی صبح وہ واپس ڈیوٹی پر ہاسپٹل چلی گئی۔
ہاجرہ نے جیسے تیسے مہینے بھر کا راشن ڈال لیا تھا اور اب دن رات کی دعا تھی کہ اللہ کرے بچہ ہو تو مرا ہوا۔

یا بچے کی پیدائش کے دوران ہی اگر سونیا اور بچہ دونوں مر جائیں تو بھی ہاجرہ کو کوئی غم نہیں ہوگا۔ وہ یہاں تک خود کو تیار کر چکی تھیں۔ ایسے میں ایک طوفانی رات میں روتی شور مچاتی خوب صورت سی بچی ہاجرہ کی تمام تر بددعاؤں کے باوجود ان کی بانہوں میں تھی۔

ہاجرہ جیسے سکتے میں آ گئیں۔

انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان کی دعائیں اس طرح بھی رد ہو سکتی ہیں۔

''اماں! اسے مجھے دکھائیں تو......'' سونیا تکلیف سے نڈھال ماں سے بولی۔

ہاجرہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

ان کی لاکھ دعاؤں کے باوجود نہ سونیا مری، نہ کم بخت یہ پیدا ہونے والی بچی۔

اسی وقت زینب گرم پانی کا تھرماس لے کر اندر داخل ہوئی۔

ہاجرہ نے تھرماس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

اور بچی کو زینب کی گود میں ڈال دیا۔

''تائی! یہ کتنی پیاری ہے...... ہے نا؟'' وہ بچی کو ایک نظر دیکھ کر ذرا خوشی سے بولی۔

''یہ آج سے تمہاری اور منصور کی بچی ہے۔'' ہاجرہ کی اچانک بات نے زینب کو دہلا دیا۔

''تائی!'' وہ شاکڈ سی تھی۔

''تمہاری شادی ہو چکی ہے منصور سے اور یہ تمہاری بچی ہے۔'' وہ پھر سے اسی سخت لہجے میں بولیں۔

''مگر تائی اماں! یہ کیسے...... نہیں نہیں۔'' وہ سخت متوحش سی گھبرائی ہوئی بچی انہیں لوٹانے لگی۔

''میرا وعدہ ہے تم سے، تمہاری شادی منصور سے ہی ہوگی اور یہ بچی تم دونوں کی ہے۔ کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں۔''

ہاجرہ کا لہجہ دبنگ تھا۔

جب بھی ہاجرہ کو زینب سے کوئی بات منوانا ہوتی تھی، وہ یہی لہجہ اختیار کیا کرتی تھیں۔

''مگر تائی ماں......'' منصور سے شادی کی خبر کی خوشی اپنی جگہ مگر وہ اس نومولود بچی کی ماں کیسے ہو سکتی تھی۔

''اماں! یہ ظلم نہ کریں۔ یہ میری بچی ہے۔ اسے مجھے دے دیں۔'' سونیا کراہ کر التجا کرنے لگی۔

ہاجرہ نے نفرت سے بیٹی کو دیکھا۔

''آج تو تیرے منہ سے یہ میری بچی نکل گیا، آئندہ ساری زندگی تیری زبان بھی جل جائے تو بھی تو یہ بات منہ سے نہیں نکالے گی۔ میں جا کر اعلان کروں گی سارے محلے میں اور سارے خاندان میں یہ بچی میرے منصور کی اور زینب کی ہے۔ دونوں کی شادی سال پہلے ہو گئی تھی۔ تب چھ ماہ نرس کے پاس رہ کر آئی ہے بس کسی کو کانوں کان یہ خبر نہیں ہونی چاہیے کہ یہ بچی تمہاری ہے۔'' وہ تو سارا منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں۔ سونیا بس روتی رہی۔

اور زینب کو تو شاید رونے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ روتی ہوئی اس بچی کو بس دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

حیدر نے اس کے لیے اور اپنے لیے دو جوس منگوائے تھے۔

مگر کشف اس طرح ساکت بیٹھی رہی۔

''کشف! کیا ہوا ہے؟ میں نے تم سے کہا ناں۔ ٹھیک ہو جائے گی تمہاری ماں! مت اتنی پریشان ہو۔''

حیدر نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔

''وہ میری ماں نہیں ہے۔'' وہ زور سے بولی۔

حیدر نے چونک کر اسے دیکھا۔
"وہ ایک جھوٹی...... فراڈ عورت ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق ہے نہ رشتہ۔ اس نے محض مجھے گود لیا اور ساری زندگی اس جھوٹ کو نبھاتی رہی۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتی کہ وہ زندہ رہے یا مر جائے۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔" وہ جیسے پھٹ پڑی۔
حیدر ششدر سا اسے دیکھتے رہ گئے۔
"تم اپنے ہوش میں تو ہو کشف! جانتی ہو یہ کیا کہہ رہی ہو۔" وہ قدرے ناراض لہجے میں اسے ڈانٹتے ہوئے بولے۔
"جو سچ ہے وہی کہہ رہی ہوں۔ یہ پورا خاندان ایک جھوٹ ہے۔ ایک فراڈ، دھوکا اور کچھ بھی نہیں۔" کہہ کر ٹیبل پر اپنا سر رکھ کر رونے لگی۔ حیدر پریشان ہو گئے تھے۔
ضرور کوئی بڑی بات ہو گئی ہے ورنہ کشف اس طرح زینب کے بارے میں بات نہیں کرتی، اور زینب کو ہارٹ اٹیک......؟ تو میرے دل میں جو اس کے لیے بری فیلنگز آ رہی تھیں وہ غلط نہیں تھیں۔
زینب کو ہوش آ چکا تھا۔
موحد اس کے قریب جھکا، اس کی ہارٹ بیٹ چیک کر رہا تھا۔
"کشف...... کشف کہاں ہے؟" وہ بے حد نحیف آواز میں پوچھ رہی تھی۔
"وہ باہر ہی موجود ہے لیکن ابھی کسی کو آپ سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ جب آپ کی حالت بہتر ہو جائے گی تو کشف آپ سے ملنے آ جائے گی۔" وہ نرمی سے، مدھم لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا۔
زینب افسردہ نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ "نہیں۔" آہستہ سے نفی میں سر ہلانے لگی۔
"کیا نہیں......" موحد نے اس کی نبض چیک کرنا شروع کی۔
"اسے میرے پاس نہیں بھیجنا۔" اس کی آواز بہت مدھم تھی۔
"کیوں آنٹی!"
"تم...... تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اسے بہت ساری خوشیاں...... وہ ساری خوشیاں جو اسے کوئی نہیں دے سکا۔ میں بھی نہیں جس نے اسے پیار تو نہیں کیا مگر......" اس کا سانس پھولنے لگا۔
"پلیز آنٹی! ابھی آپ کو اتنی بات کرنے کی اجازت نہیں۔ بس خاموش رہیں۔ کچھ نہیں بولیں گی اب آپ۔" وہ ان کے نرمی سے گال چھو کر بولا۔
زینب ملتجی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"میری بات مانو گے موحد!" اس کے لہجے میں کیا نہیں تھا۔
"کیوں نہیں آنٹی! ضرور مانوں گا لیکن اب آپ بس خاموشی سے آنکھیں بند کر کے لیٹی رہیں۔"
اس نے نرمی سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
کشف کے دل میں اب کیا ہے، وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ دھوپ چھاؤں سی لڑکی جذبات میں جانے کیا فیصلہ کرے۔
موحد بہت سوچنے پر بھی اس کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا۔
"اچھا ہے اگر میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ یہاں آنٹی کے ساتھ تو جانے وہ کیا سلوک کرے۔" وہ گہرا سانس لے کر غنودگی میں آنکھیں موندے زینب کو دیکھتا باہر نکل گیا۔
☆☆☆
"کیا آنٹی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے؟" حیدر کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچے تھے۔
بلال ان سے ملنے اسٹڈی میں آیا تو وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھے تھے۔ حیدر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"او مائی گاڈ۔ مگر کیسے؟" وہ پریشان ہو گیا۔
"بس بہت ساری باتیں ہیں۔ تم کھانا وغیرہ کھالو تو پھر بات کرتے ہیں۔" حیدر شاید ابھی اسے کچھ بتانا نہیں چاہتے تھے۔
"بابا! میں ایما کے ساتھ تھا ڈنر پر۔ کھانا کھا کر آیا ہوں۔ پلیز مجھے بتائیں یا میں ہاسپٹل جاؤں انہیں دیکھنے کے لیے۔" وہ سخت بے چین ہو گیا تھا۔
حیدر نے نفی میں سر ہلایا۔
"کیا تمہیں معلوم تھا، کشف اور موحد کا نکاح ہو چکا ہے۔" بلال کو یوں لگا جیسے حیدر نے اس کے نزدیک کوئی بم پھوڑا ہے۔
وہ ششدر سا باپ کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

زینب کو دو دن ہاسپٹل میں گزارنا پڑے۔
کشف اس دوران نہ تو گھر گئی نہ زینب کو دیکھنے اس کے روم میں۔ وہ بس باہر ہی رہتی۔ نہ کچھ کھاتی نہ آرام کرتی۔ دو ہی دن میں وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔
"کشف! یہ کیا طریقہ ہے؟ اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔" موحد اسے زبردستی ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آیا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہونے والا۔" وہ ضدی پن سے بولی۔
"تم نے ایک لمحے کے لیے بھی سوچا ہے، اس عورت نے جس نے اتنی محبت سے تمہیں پالا، پروان چڑھایا......" وہ اسے احساس دلانا چاہتا تھا۔
"آپ مجھے یہاں یہ سب بتانے کے لیے لائے ہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔ "تو مجھے کچھ نہیں سننا۔"
وہ بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔
"کیوں نہیں سننا۔ جس طرح انہوں نے تمہیں پرورش کیا......"
"پلیز مسٹر موحد! مجھے یہ سب پتا ہے۔ آپ کو یہ سب احسان جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ پھٹ پڑی۔
"اچھا چلو میرے ساتھ، تھوڑا ریسٹ کر لو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جانے لگا۔
"میں نہیں ٹھیک ہوں...... تھینک یو۔" وہ ہاتھ چھوڑ کر پھر اندر چلی گئی۔

☆☆☆

سونیا بار بار آزر کا نمبر ملاتی جسے کاٹ دیا جاتا۔
زینب کو آج ہی ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا گیا تھا۔
وہ دو دن زینب کے ساتھ ہاسپٹل میں رہی تھی۔ کشف نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔
وہ اس کے پاس جاتی، کسی فقیرنی کی طرح اسے بھیک مانگتی مگر وہ تو جیسے پتھر کی ہو چکی تھی۔
اس کا پتھر ہونا کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔
مگر وہ بھی کیا کرتی، ساری عمر مجبوریوں کی زنجیریں اور سمجھوتے کا طوق اسے سر اٹھانے ہی نہیں دیتا تھا۔
ورنہ اس کا دل کشف کے لیے کب کب نہیں تڑپا مگر اس نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا۔ اب اگر کشف اس کے لیے پتھر بن گئی تھی تو ٹھیک تھا مگر اسے چین نہیں پڑ رہا تھا۔
دو دن کے بعد اس نے آزر کا نمبر زینب کے فون سے ملایا تھا، اس کا فون سب کچھ تو وہیں رہ گیا تھا۔
حمزہ اسے بلانے آیا تھا۔ اس نے اسے زینب کی بیماری کا کہہ کر واپس بھیج دیا تھا۔

مگر کچھ بھی تھا، وہ اپنے گھر سے، اپنے بچوں سے اس طرح کٹ کر تو نہیں رہ سکتی تھی۔
اس نے رمشا کا نمبر ملایا جو بند جا رہا تھا۔ وہ سخت بے چین و پریشان تھی۔

☆☆☆

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' منصور اس کے کمرے میں دستک دے کر آیا تھا۔
اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔
وہ کچھ بے چین سا کھڑا رہا۔
زینب اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔
نہ جانے اس کا دماغ کہاں بھٹک رہا تھا۔
''تم نے یہ سب مجھے کیوں نہیں بتایا۔ تم سے کئی بار میری فون پر بات ہوئی۔'' اسے وہ گلہ یاد آیا جو وہ دل ہی دل میں تین دنوں سے زینب سے کر رہا تھا۔
''تائی اماں نے منع کیا تھا کہ منصور کو کچھ بھی پتا نہ چلے۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بے تاثر لہجے میں بولی۔
''تو پھر تم نے شادی کیوں کر لی اور کشف......''
''میں نے شادی نہیں کی۔ میں تو آج بھی......'' وہ بے اختیار زبان دانتوں تلے دبا گئی۔
''تو وہ سب جھوٹ تھا۔ غلط بیانی اماں کی، انہوں نے مجھے خود بتایا کہ تم جہاں جاب کرتی ہو۔ وہاں کسی کو پسند کرنے لگیں اور اس سے تم نے شادی کر لی۔'' وہ تیز تیز بولتا چلا گیا۔ زینب کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔
ان نظروں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ وہ ٹھہر نہیں سکا، تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

سونیا کے دل کی بے چینی عروج پر تھی۔
حمزہ بھی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔
آزر کو مزید کال کرنا بے کار تھا۔ اس نے تو شاید اب کبھی اس سے بات نہیں کرنی تھی۔
''کچھ بھی ہے۔ میں اپنے بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' وہ فیصلہ کر کے اٹھی۔ باہر نکلتے ہی اس کا سامنا برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھی کشف سے ہوا اور وہ ٹھٹک کر رک گئی۔
''کشف!'' وہ آہستہ سے اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔
کشف نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سونیا چلتے صحن میں کتنی دیر یونہی کھڑی رہی پھر دوپٹہ ٹھیک کرتی تیزی سے باہر نکل گئی۔
وہ جب رکشے سے اتر کر گھر کی طرف بڑھی تو گھر کا گیٹ کھلا تھا۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔
گارڈ ہمیشہ دروازے پر موجود اور گیٹ بند رکھتا تھا۔ آج کیسے وہ اتنی بڑی غلطی کر سکتا ہے۔
وہ پریشان سی گیٹ کے اندر آ گئی۔
اندر مکمل خاموشی تھی۔
''یا اللہ۔ سب خیریت ہو۔'' وہ دھڑکتے دل کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئی اور لاؤنج میں نظر آتے منظر نے اس کے قدم وہیں جکڑ لیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بہت سے کام ہیں

مریم شہزاد

رمضان کی آمد آمد ہے اور رجب ختم ہونے کو ہے اور پھر شعبان اور یہ آیا رمضان۔ شعبان تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کہاں گیا، رمضان اور عید کی تیاریوں میں یوں ہی گزر جاتا ہے۔

سب سے پہلے تو کچن کو ہی دیکھنا ہے رول سموسے بنا کر رکھنے ہیں، چٹنیاں بنانی ہیں، ترکیبیں تلاش کر کے رکھنی ہیں کہ روز افطار میں نئی چیز ہو اور

سب سے ضروری رمضان کے لیے جوڑے بنانے ہیں، ہر جمعہ کا ایک نیا سوٹ تو ہونا ہی چاہیے اور جمعتہ الوداع کا ایک الگ اچھا سا اور افطار پارٹی آ گئی اچانک، دو جوڑے تو اس کے لیے چاہئیں اور تراویح کے ختم میں جانا ہو گیا تو اس کے لیے بھی جوڑا چاہیے۔ اف کتنے ہی کام ہیں اور تیاری کے لیے صرف ایک مہینہ۔

اور پھر عید بھی تو فوراً ہی ہے۔ اس کے لیے بھی تو دو چار جوڑے بنانے ہیں۔ چار تو بنا ہی لوں اگر درزی نے کوئی سوٹ خراب کر دیا تو تین تو ہوں گے ہی نا، ایک تو یہ درزی بھی نا! توبہ کتنے چکر لگواتے ہیں ہر وقت کا بہانا تیار ہے کبھی لائٹ نہیں ہے، تو کبھی کام زیادہ ہے ہے کبھی مشین کی خرابی۔ مہینہ کا آخر کر دیتے ہیں، اور تو اور میاں صاحب کو تو کوئی فکر ہی نہیں بچوں اور ان کے کپڑے، جوتے بھی میں کمزور جان ہی کروں، بازار جا جا کر میری تو کمر ہی دوہری ہو جاتی ہے، ہائے اللہ! بیٹی داماد کو تو میں بھول ہی گئی، ان کی بھی تو پہلی عید ہے، بیٹی کا ایک جوڑا تو ساس بنا دیں گی اور ایک میاں دلوا دیں گے مگر میکے سے بھی ایک اچھا سا تو ہونا ہی چاہیے نا بس ایک بیٹی کا، ایک داماد کا اور اس کے ساتھ ساتھ لوازمات۔

کیا کروں اب تم ہی بتاؤ، رجب کے اسٹارٹ سے میاں صاحب کی جان کھا رہی ہوں کہ پیسے دے دیں، پیسے دے دیں مگر ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی، سمجھتے ہیں کہ میں مذاق کر رہی ہوں کہ اتنے کام ہیں اور رجب رہ ہی کتنا گیا ہے۔ خود تو میرے ساتھ چلیں گے نہیں سب کام خود ہی کرنا پڑیں گے بس چاہتے ہیں۔ میں ہی لگی رہوں کہ کچن میں بھی اور شاپنگ میں بھی۔

کچن سے یاد آیا ماسیوں کو بھی تو رمضان اور عید کے جوڑے دینے ہوں گے، بے چاریاں کتنے کام آ جاتی ہیں، بس میں تو کہہ رہی تھی کہ آج کا کام کل پر نہیں ڈالتے، آج ہی چل پڑتے ہیں۔" فاطمہ نان اسٹاپ بولے ہی چلی گئی۔

"ذرا سانس تو لو۔ کوما، فل اسٹاپ۔ کہیں تو رکو۔" رابعہ نے اس کو ٹوکا تو وہ کچھ خجل سی ہو گئی۔

"یار! اصل میں نا اتنا لوڈ ہے کاموں کا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں اور کہاں سے شروع کروں، بس تم کو اسی لیے فون کیا تھا کہ چلو ساتھ شاپنگ کے لیے چلتے ہیں، تا کہ اسٹارٹ ہو کچھ کام۔" فاطمہ کو بہم سوار تھا۔

رابعہ اور فاطمہ دونوں بہنیں تھیں اور اکثر ساتھ ہی شاپنگ کے لیے جاتی تھیں، دونوں کے گھر کے حالات بھی یکساں ہی تھی۔ متوسط گھرانے تھے اور دونوں ہی جوڑ توڑ کر کے اور کمیٹیاں ڈال کر اپنے کام پورے کرتی تھیں، ہر سال کوشش ہوتی تھی کہ رمضان المبارک میں شاپنگ کے لیے نہ جانا پڑے اور چونکہ فاطمہ کی بیٹی کی ایک ماہ پہلے ہی شادی ہوئی تھی اس لیے وہ چاہ رہی تھی کہ اس سے پہلے کہ سب چیزوں کے ریٹ بڑھ جائیں وہ جلدی سے سب کام کر لے اسی ٹینشن میں اس نے پیسے ہاتھ میں آتے ہی رابعہ کو فون کر ڈالا۔

"ایک بات تو بتاؤ فاطی! طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

"ہاں، الحمدللہ۔" فاطمہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "کیوں کیا ہوا۔"

"بھول گئیں، ہم نے کیا سوچا تھا؟"

"کس کا کیا سوچا تھا، کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" وہ الجھ کر بولی۔ "میں شاپنگ کی بات کر رہی ہوں اور تم پہیلیاں بجھوانے میں لگی ہوئی ہو۔"

"پہیلیاں نہیں بجھوا رہی، یاد دلا رہی ہوں کہ ہم نے پچھلے سال کیا سوچا تھا۔"

"توبہ ہے رابعہ! اب بول بھی چکو، کیا کہنا ہے، اور ساتھ چلنا ہے یا نہیں۔" وہ جھلا کر بولی۔

"فاطمہ! یاد ہے پچھلے سال جب ہم عارفہ کے

ہاں مل کر بیٹھے تھے تو ہم نے سوچا تھا کہ پہلے گھر میں موجود کپڑوں اور دوسری چیزوں کا جائزہ لیں گے اور پھر جو ضروری ہوگا صرف اسی کی شاپنگ ہوگی۔" رابعہ نے یاد دلایا۔

"ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی، واقعی یہ ہی تو طے کیا تھا ہم نے۔"

"تو بس اب پہلے تم بھی الماریاں کھنگالو اور میں بھی سب دیکھتی ہوں۔ لسٹ بنا کر پھر دو دن بعد چلیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" رابعہ نے پوچھا تو فاطمہ نے اس کی بات کی تائید کی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو، اچھا کیا تم نے یاد دلا دیا، کیسے اس دن بات ہوئی تھی کہ ایک ایک چیز کا حساب دینا ہوگا آخرت میں، بس میں بھی آج اور کل میں دیکھ لوں پھر کال کرتی ہوں۔"

☆☆☆

"یا اللہ یہ پچھلے سال بنایا تھا سوٹ! اب تک نہیں پہنا، کہاں کونے میں جا چھپا تھا۔" فاطمہ اپنی کپڑوں کی الماری پھیلائے بیٹھی تھی۔ ایک فیروزی سوٹ بالکل گولا بنا ہوا پڑا تھا اس نے کھول کر دیکھا تو ادھ سلا۔

"اس سوٹ کو کیا ہوا تھا۔" اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے سوٹ کھولا تو یاد آیا کہ درزی کے ہاں سے غصے میں اٹھا لائی تھی کہ اس نے ٹائم پر نہیں دیا تھا ایک کے بعد ایک وہ الماری سیٹ کرتی گئی اور جب آخر میں دیکھا تو تین سوٹ اس کے پاس بالکل نئے موجود تھے اور ایک آدھا سلا ہوا اور باقی کپڑے بھی اس قابل تھے کہ رمضان اور عید کا کام ہو ہی جانا تھا۔

"صرف دو ہی جوڑے بنانے ہوں گے، اس کا مطلب ہے۔" اس کو خوشی بھی ہو رہی تھی اور شرمندگی بھی، دو جوڑے اس قابل بھی نکل آئے کہ ماسیوں کو دیے جاسکتے تھے، ایسا ہی کچھ بچوں کی الماریوں کے ساتھ ہوا کیونکہ ابھی شادی گزری تھی تو کافی چیزیں نئی ہی تھیں جوتوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"ابھی سے بچوں کے دماغ میں ڈالوں گی تو ان کی بھی سمجھ میں آئے گا نا، ورنہ تو فضول خرچی کی ہی عادت ہوتی چلی جائے گی۔" اس نے دل میں سوچا۔

☆☆☆

"ہیلو! ہاں اب بتاؤ کیا پروگرام ہے۔" رابعہ نے فاطمہ کو فون کیا۔

"تم بتاؤ۔ میری تو کافی شاپنگ گھر پر ہی ہوگئی ہے، بس کچھ ضروری چیزیں ہیں جو لینی ہوں گی۔"

"یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے بلکہ مجھے تو صرف عید کا جوڑا ہی لینا ہوگا۔" رابعہ نے کہا۔

"سوچ لو۔ کل سے سیل بھی لگ رہی ہے۔" فاطمہ نے چھیڑا۔

"نہیں بھئی۔ ہم دونوں نے ہی اب ایک دوسرے کو اکسانا نہیں ہے بلکہ ٹھنڈا کرنا ہے، بالکل فالتو شاپنگ نہیں کرنی، مہنگائی کہاں جا رہی ہے اور ہم مردوں پر بوجھ ہی ڈالتے جائیں، یہ تو غلط بات ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے، ویسے ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

"یہ جو پیسے اب بچ جائیں گے، ان کا کیا کرو گی؟"

"کرنا کیا ہے، رکھ دوں گی سنبھال کے، وقت بے وقت چاہیے ہوتے ہیں پیسے تو......"

"یہ تو ہے، بس یہ دعا کرنا کہ خوشیوں کے وقت کام آئیں، یاد ہے نا امی کہتی تھی کہ اللہ ہمیشہ تندرستی کے خرچے اور خوشیوں کی مصروفیات دے۔"

"آمین۔ اچھا یاد دلایا، ٹھیک کہہ رہی ہو، چلو اب بس کل چلتے ہیں تا کہ بازار کے کاموں سے فارغ ہو کر پھر ہر سال کی طرح قرآن مجید کی تفسیر اس بار جلد ہی شروع کر دیں۔"

"ٹھیک ہے ان شاء اللہ کل ہی چلتے ہیں۔"

نفیسہ سعید

وہ پوائنٹ کے انتظار میں کھڑی تھی، جب پیچھے سے کسی نے اس کا نام پکارا۔

"فریال!"

وہ چونک کر پلٹی۔ دیکھا اس کے بالکل قریب علی نواز کھڑا تھا، جسے دیکھتے ہی اس کا موڈ آف ہوگیا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں چلا رہے ہو؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی فریال کا لہجہ تیز ہوگیا۔

"وہ دراصل......"

فریال کی گھورتی نگاہوں کے سامنے علی نواز کی آواز حلق میں کہیں گم ہوگئی۔

"اب بتا بھی دو کیا ہوا میرا پوائنٹ آ گیا ہے۔"

علی کی حالت دیکھ کر وہ پہلے سے نسبتاً نرم لہجہ میں بولی۔

"مجھے وہ نوٹس چاہیے تھے جو آج میڈم زیدی نے دیے ہیں۔" فریال کو محسوس ہوا جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہے مگر یہ وقت بحث کا نہ تھا، اس لیے بیگ سے نوٹس نکال کر خاموشی سے اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"رکھ لو کاپی کروا لینا میں کل واپس لے لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے چلتی سامنے کھڑے پوائنٹ میں سوار ہوگئی اور وہ اس وقت تک اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا جب تک پوائنٹ رینگتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا۔

☆☆☆

فریال یونیورسٹی سے گھر واپس آئی تو کچھ الجھی ہوئی تھی، کھانا بھی جلدی جلدی کھایا اور بڑی اماں سے کوئی بات کیے بنا اپنے کمرہ میں سونے چلی گئی تو ان سے مزید برداشت نہ ہوا۔ عصر کے بعد پڑھا جانے والا اپنا وظیفہ تیزی سے مکمل کیا اور بھاگم بھاگ پوتی کے سر پر جا پہنچیں، جو دنیا جہاں سے بے خبر آنکھیں موندے آرام کرسی پر آڑی ترچھی پڑی خود سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ منظر دیکھتے ہی ان کا دل ہول گیا تیزی سے پوتی کی جانب لپکتے ہوئے پکارا۔

"فری میرے بچے کیا ہوا۔"

جواب ندارد۔ انہوں نے تھوڑا آگے بڑھ کر پھر آواز دی اور جواب نہ پا کر زوردار طریقے سے فریال کا کندھا ہلایا اور ہلکی آواز میں چلائیں۔

"اے بیٹا! سب خیر تو ہے نا یہ اٹوانی کھٹوانی لیے خود سے کیا بڑبڑائے جا رہی ہو؟ کیوں پڑی ہو ایسے؟ میرا تو دل ہول گیا۔"

آخری جملے تک ان کی آواز قدرے روہانسی ہوگئی۔ دوسری طرف فریال شاید اس اچانک زمینی حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھی اس لیے ہڑبڑا کر سیدھی ہوتے ہوئے اپنے کان میں پھنسے ہینڈز فری نکال کر بڑی اماں کی جانب ایسے دیکھا جیسے کوئی عجیب الفطرت شے سامنے کھڑی ہو اور اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے بڑی اماں! کیوں تنگ کر رہی ہیں، میں آن لائن کلاس لے رہی ہوں۔"

"ہیں! کیا لے رہی ہو؟"

بڑی اماں کے لیے شاید آن لائن کلاس کا لفظ نیا تھا اس لیے حیرت سے منہ کھولے ایک نظر پوتی پر ڈالی، جس نے اپنے ہاتھ میں موجود موبائل فون کی اسکرین ان کے سامنے کر دی۔

بڑی اماں نے دیکھا ایک سوٹڈ بوٹڈ بندہ اسکرین پر دکھائی دے رہا ہے جو شاید کچھ بتا رہا تھا مگر اس کی آواز سنائی نہ دے رہی تھی، جب بڑی اماں کی نظر فریال کے گلے میں لٹکے ہینڈز فری پر پڑی۔
اب کچھ کچھ بات ان کی سمجھ میں آگئی فریال شاید فون پر کسی سے بات کر رہی تھی یہ سوچ کر انہوں نے دل میں شکر ادا کیا کہ پوتی ٹھیک تھی۔ وہ یوں ہی بلاوجہ وہم میں مبتلا ہوگئی تھیں اپنی خفت دور کرنے کے لیے وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی کمرہ سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

فریال مقامی یونی ورسٹی میں بزنس کی طالبہ تھی اس کے یونی کے پہلے دو سال تو بہت سکون سے گزر گئے لیکن تیسرا سال شروع ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ گاؤں سے پڑھائی کے لیے شہر آنے والا علی نواز اس کے لیے ایک اذیت بن گیا اور اس کی عجیب وغریب حرکات فریال کو پریشان کرنے لگیں۔ وہ جو ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی جلد ہی علی نواز سے زچ ہونے لگی۔
اس کا کینٹین جانا محال ہوگیا کیونکہ اس کے پیچھے ہی علی نواز بھی کینٹین آجاتا اور خاموشی سے اس کا بل ادا کردیتا، ایسے میں کوئی شور شرابا کر کے وہ دوسروں کو اپنی جانب متوجہ نہ کرنا چاہتی تھی اس لیے ایک دو بار علی نواز کو روک کر سمجھانا چاہا مگر بے سود جس کے بعد اس نے کینٹین کاؤنٹر پر پہلے ہی پیسے جمع کروانے شروع کردیے مگر وہ علی کو اس کی دیگر حرکات سے نہ روک سکی جو دن بدن بڑھ کر اس کی پریشانی کا سبب بن رہی تھیں۔
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کبھی تو علی اسے پاگل لگتا جب بنا کہے وہ اس کا کوئی کام کردیا کرتا حد تو یہ کہ ایک فریال کی خاطر وہ اس کی دوست اریشہ کے بھی کئی کام کردیتا۔ کبھی کسی نوٹس کی کاپی کروانا ہوتی تو اپنے ساتھ اریشہ اور فریال کی بھی کروا لاتا۔

اکثر گاؤں سے واپسی پر وہاں کی کوئی خاص سوغات لاتا تو صرف فریال کی خاطر پوری کلاس میں بانٹتا۔ وہ یہ سب کیوں کرتا تھا سمجھنا مشکل نہ تھا مگر فریال سمجھنا نہیں چاہتی تھی یہ ہی وجہ تھی وہ حتی الامکان اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی جس کا اسے کوئی فائدہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

☆☆☆

آج اتوار تھا۔ اماں مشین لگا کر کپڑے دھو رہی تھیں جب اچانک صدف خالہ اور ارحم آ گئے جنھیں دیکھ کر جہاں سب گھر والے خوش ہوئے وہاں فریال کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ اس کا رشتہ بچپن سے ہی ارحم کے ساتھ طے تھا اور دونوں بچپن کے گہرے دوست بھی تھے۔ پہلے خالہ ان کے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں لیکن دو سال قبل انکل ظہیر کا ٹرانسفر حیدر آباد ہو گیا تو وہ اپنی فیملی بھی ساتھ لے گئے اور اس طرح، اس کی ارحم سے ملاقاتوں میں وقفہ آ گیا جس کی ایک وجہ دوری اور دوسری پڑھائی تھی۔ آج ارحم پورے چھ ماہ بعد ان کے گھر آیا تھا۔ یہ آمد اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ فریال کا من کھل اٹھا، ایسے میں علی نواز کے سلسلہ میں جو کوفت کئی دنوں سے اسے گھیرے ہوئے تھی۔ وہ اڑن چھو ہو گئی محبوب کے دیدار نے ایک ہی پل میں اسے ہلکا پھلکا کر دیا۔

☆☆☆

خالہ کی اس دفعہ آمد کچھ خاص تھی، جس کا اندازہ اسے شام تک ہو گیا اور اس دن پہلی بار اس پر انکشاف ہوا جس گھر کو وہ بچپن سے اپنا سمجھتی ہے۔ درحقیقت نانا ابو کا ہے جو انہوں نے اپنی زندگی میں ہی بڑی بیٹی یعنی فریال کی امی افشاں کو تحفہ میں دے دیا تھا۔ ویسے بھی سرمد صاحب کی اولاد نرینہ نہ تھی تو ایک گھر بڑی بیٹی کو دیا جب کہ مین روڈ کی دکان صدف خالہ کے حصہ میں آئی جسے کئی سال پہلے ہی خالو نے بیچ کر حاصل شدہ رقم اپنے گھر کی تعمیر پر لگا دی۔ اب آج اتنے سالوں بعد صدف خالہ کو یاد آیا چوں کہ یہ گھر نانا ابو کا ہے تو اس میں وہ بھی برابر کی حصہ دار ہیں ان کے اس مطالبہ نے ایک ہی پل میں سارے گھر کو ہکا بکا کر دیا کہ مکان فروخت کر کے جو رقم ملے اس کا پچاس فیصد انہیں دیا جائے اس کے علاوہ دوسری صورت یہ تھی کہ مکان جہیز میں فریال کو دیا جائے، جس کی رجسٹری ارحم کے نام ہو۔

یہ دونوں باتیں ہی نا قابل قبول تھیں جانے کیوں فریال کو ایسا محسوس ہوا، خالہ کا اٹھایا گیا یہ قدم اس کا ارحم سے رشتہ ختم کرنے کے لیے ہے پھر بھی وہ کوئی وسوسہ اپنے دل میں نہ پالنا چاہتی تھی اس لیے ایک ہی رات میں اس نے فیصلہ کیا وہ اس مسئلے پر ارحم سے بات کرے گی۔ اگر وہ نہ مانا تو پھر اسے ارحم سے اپنا رشتہ ختم کرنا ہو گا چاہے اس مکان کا نصف حصہ خالہ کو دے دیا جاتا مگر یہ طے تھا اس صورت میں وہ ارحم سے شادی نہیں کرے گی۔ فریال کا ماننا تھا جو عمارت لالچ پر کھڑی ہو، اس کی بنیادیں بھی مضبوط نہیں ہو سکتیں۔

☆☆☆

”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا، آخر تمہاری بہن کیا چاہ رہی ہے؟“

صدف خالہ کے غیر متوقع مطالبے نے گھر کے دیگر افراد کے ساتھ بڑی اماں کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی جوں ہی خالہ اور ارحم سونے کے لیے مہمان خانے گئے اماں فوراً افشاں کے پاس آن بیٹھیں۔

”میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا، آخر بائیس سال بعد ایسا کیا ہوا جو صدف خالہ نے ایک مکان کی خاطر آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔“

ماں کی بات سنتے ہی فریال نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی جو پریشانی اور خفت کے مارے زرد پڑ گیا تھا بے اختیار ہی اسے اپنی ماں پر ترس آ گیا۔

”لالچ نے تمہارے بہن، بہنوئی کو اندھا کر دیا ہے اس لیے میں کئی سالوں سے کہہ رہی تھی مکان اپنے نام منتقل کروا لو مگر میری کون سنتا ہے ساری عمر بہن کی محبت کا درد دل میں جاگا رہا۔ اب بھگتو۔“

آج بڑی اماں کو بھی باتیں سنانے کا موقع مل گیا تھا۔

”سچ کہہ رہی ہیں اماں۔“

افشاں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔

”اس کو بھی ابا جی نے دکان دی تھی، جو کئی سال قبل لاکھوں کی تھی جب بیچی تو ہم نے کوئی مطالبہ

نہ کیا مگر اب وہ کہتی ہے کہ مکان چونکہ ابا جی کے نام ہے تو وراثت میں وہ برابر کی حصہ دار ہے۔"

"کہہ تو وہ صحیح رہی ہے ماں باپ کے نام جو جائیداد ہو اس کی حق دار ساری اولاد ہوتی ہے۔"

"مگر اماں! انسانیت اور رشتہ بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے کہ نہیں۔"

ساس کی بات پر افشاں نے دکھ سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس دور میں ساری اہمیت روپے پیسے کی ہے۔"

جواب دے کر بڑی اماں نماز کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور افشاں کی نم آنکھیں دیکھتے ہوئے فریال نے صبح ہی ارحم سے بات کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

☆☆☆

فریال جو سمجھ رہی تھی، ارحم اس کی بات سنتے ہی سارے مسئلے کو چٹکی میں حل کردے گا، محض خام خیالی ثابت ہوا اس کی ساری بات سن کر ارحم ہنس دیا۔

"ارے یہ بڑوں کا مسئلہ ہے انہیں حل کرنے دو تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔"

ارحم کے جواب نے ایک پل کے لیے فریال کو خاموش کروادیا۔ وہ سمجھ نہ سکی، اس بات کا کیا جواب دے جب ہی اس کی خاموشی کو محسوس کرتا ارحم دوبارہ بولا۔

"کم آن یار، مکان تمہارا ہو یا میرا کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق پڑتا ہے ارحم!" وہ ارحم کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ مکان نہ میرا ہے اور نہ تمہارا۔ یہ میری ماں کا ہے، جو انہیں نانا ابو کی طرف سے ویسے ہی تحفہ میں ملا جیسے خالہ جان کو دکان۔"

"دیکھو فریال! تمہیں شاید علم نہیں جو جائیداد باپ، دادا کی ہو، وہ تمام وارثین میں برابر تقسیم ہوتی ہے۔"

"تو پھر اس دکان میں سے میری اماں کو حصہ کیوں نہ ملا؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی فریال کا لہجہ تلخ ہوگیا جسے محسوس کرتے ہی ارحم کا موڈ آف ہوگیا۔

"دکان تھی، ہے نہیں جبکہ مکان ہے۔"

ایک ہی جملے میں اپنی بات کی وضاحت کرتا ارحم اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ اپنی جگہ بیٹھی سوچتی رہی۔ بلاوجہ ارحم سے بات کی، اس سے اچھا تھا سارا معاملہ حالات پر چھوڑ دیا جاتا تو کم از کم اس کا دل تو بُرا نہ ہوتا جو اس وقت ارحم کی گفتگو سے ہوا تھا۔

☆☆☆

اور پھر ہر تدبیر بے کار گئی، افشاں کا رشتہ جوڑنے کی کوشش، باپ کی نشانی بچانے کی جدوجہد بھی کسی کام نہ آئی۔ ارشد صاحب نے سالی کی بات سنتے ہی گھر بیچ کر وراثت تقسیم کرنے کا فیصلہ کرلیا حالانکہ وہ چاہتے تو مکان اپنی بیوی کے نام کر کے حصہ کی آدھی رقم صدف کو دے دیتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ دونوں بہنوں کے والدین کی آخری نشانی، افشاں کو والد کی جانب سے ملنے والا تحفہ، لالچ اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ صدف لاکھوں روپیہ لیے چلتی بنی جب کہ افشاں اس گھر سے دوری کے دکھ میں گھر گئیں حالانکہ اہمیت رشتوں کی ہوتی ہے۔ چند روپوں یا جائیداد کے لیے خون کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اب بھی ایسا ہی ہوا۔ مکان تقسیم ہوگیا وہ گھروندہ، جس سے فریال اور افشاں دونوں کی بچپن کی یادیں وابستہ تھیں غیروں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ لالچ نے والدین کی آخری نشانی دنوں میں ہی ختم کردی، جس کے دکھ نے افشاں کو اندر تک زخمی کردیا۔

ارشد صاحب نے مکان کے حصے سے ملنے والی باقی ماندہ رقم میں آفس سے لون لے کر شامل کیا اور اپنی حیثیت کے مطابق نیا گھر خرید لیا، اس طرح جلد ہی وہ سب دوسرے گھر میں منتقل ہوگئے۔ اس تمام صورتحال میں بھی ارحم اور فریال کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ شاید کسی نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کیونکہ اس وقت اہمیت جاندار سے زیادہ بے جان چیزوں کی تھی۔ اولاد سے زیادہ مکان کو فوقیت دی گئی، یقیناً گھر کے بڑے ابھی بھی اس رشتہ کو نبھانے کے پابند تھے مگر ان سب کی توقع کے خلاف فریال اپنے مستقبل کا فیصلہ کر

چکی تھی۔ جس کے لیے اسے مناسب وقت کا انتظار تھا وہ وقت جب وہ سب کو بتا سکے اسے اپنی زندگی ارحم کے ساتھ نہیں گزارنی اور پھر قدرت نے جلد ہی اسے وہ مناسب وقت بھی فراہم کر دیا۔

☆☆☆

اس کا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔ زندگی میں جیسے ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ فریال پہلے سے بہت بدل چکی تھی اب اسے علی نواز کی کوئی حرکت اذیت نہ لگتی، شاید اس کے اور علی نواز کے درمیان ایک خاموش دوستی ہو گئی تھی، اب بھی فریال کی ہر فوٹو کاپی علی کی ذمہ داری ہوتی۔ وہ بنا کہے فریال کے اکثر کام کر دیا کرتا، خاص طور پر اسائمنٹ کی تیاری میں اس کی بہت مدد کرتا۔ پوائنٹ نہ آنے کی صورت میں ایک بار اسے گھر بھی ڈراپ کرنے آیا البتہ اتنے سالوں میں اس کی ارحم سے بہت کم کسی خاص موقع پر ہی بات ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کی سالگرہ کی رات بارہ بجے آنے والے ارحم کے فون کے علاوہ ان کے درمیان گزرے دنوں کی کوئی خوش گوار یاد باقی نہ رہی تھی ویسی سرسری گفتگو جو وہ علی سے کرتی تھی ارحم سے بھی کر لیا کرتی۔ اس کے علاوہ کچھ ایسا خاص نہ تھا جو اسے ارحم کے قریب کرتا۔

جب ان ہی دنوں خالہ ایک بار پھر آ گئیں فریال کو حیرت ہوئی، اب تو دور دور تک کچھ ایسا نہ تھا جو نانا کی یادگار ہو تو خالہ کیوں آئی ہیں؟ اب ان کی نظر کس جائیداد پر تھی۔ یہ معمہ اگلے دن ہی حل ہو گیا جب گھر کے تمام افراد ایک بار پھر جمع ہوئے۔ کچھ باتیں ہوئیں جن کا تعلق ارحم اور فریال کی ذات سے تھا اور اس امر سے وہ دونوں ہی لاعلم تھے، جن کے متعلق گفتگو کی جا رہی تھی۔ خالہ ایک بار پھر اپنی محبت اور جھوٹے آنسوؤں کے جال میں اپنی بہن کو پھنسا چکی تھیں۔ اس بار وہ ارحم اور فریال کے نکاح کے ارادے سے آئی تھیں جس کا علم فریال کو ہوا ضرور مگر اس نے کوئی واویلا نہ کیا فی الحال وہ خاموشی سے سارا کھیل دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

جیسے سارے معاملات سلجھ گئے۔ اماں اور خالہ کا بہناپا زوروں پر تھا۔ اگلے ماہ فریال کی سالگرہ والے دن اس کا ارحم سے نکاح متوقع تھا۔ جس کی خبر اسے سرسری طور پر ایسے دی گئی، جیسے محلہ میں ہونے والی کسی شادی کی اطلاع اور اس شام جب خالہ نے حیدرآباد واپس جانا تھا، ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے پورے گھر کو ہلا دیا۔ علی نواز اپنے والدین کے ساتھ فریال کے رشتے کے لیے آیا تھا افشاں کے لیے سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی، وہ یہاں فریال کی رضامندی سے آیا تھا۔ فریال، علی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ خبر بذات خود ایک دھماکا سے کم نہ تھی۔ علی کے پرپوزل کو بہت تحمل سے سنا گیا اور سوچنے کا وقت لے کر اس کی فیملی کو عزت سے رخصت کیا گیا۔

پھر علی کے واپس جاتے ہی اسے ہنگامی طور پر بڑے کمرے میں طلب کر لیا گیا، جہاں لال بھبوکا چہرہ لیے خالہ کچھ بول رہی تھیں فریال کو اندر آتا دیکھ کر وہ فوراً خاموش ہو گئیں۔ فریال نے دیکھا بڑی اماں پرسکون چہرہ لیے اسے دیکھ کر مسکرا رہی ہیں۔ ان کی معنی خیز مسکراہٹ نے فریال کو حوصلہ دیا۔ امی کی جیسے ہی اس پر نظر پڑی۔ وہ علی کے متعلق جواب طلبی کرتے ہوئے بولیں۔

"تم جانتی ہو تمہارا اور ارحم کا رشتہ بچپن سے طے ہے چونکہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی کا رواج نہیں ہے، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جلد از جلد تم دونوں کی شادی کر دی جائے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ارحم مزید پڑھنے کے لیے باہر جانا چاہتا ہے اور اب جب سارے مسائل حل ہو گئے۔ نکاح کی تاریخ بھی رکھ لی گئی ایسے میں تمہاری یونیورسٹی سے کسی انجان لڑکے کا رشتہ آنا ہماری سمجھ میں نہیں آیا اگر وہ یہاں تک تمہاری منشا سے آیا ہے تو مجھے بہت دکھ ہوا میری تربیت ایسی نہ تھی کہ......"

افشاں کی بات ادھوری رہ گئی جب فریال نے درمیان میں ٹوک کر مزید بولنے سے روک دیا۔

"ایک منٹ امی! پہلے میری بات کا جواب دیں۔ ارحم سے میرا رشتہ طے کرنا وہ بھی مجھ سے

پوچھے بنا، میری رضامندی کے خلاف...... کیا آپ لوگوں کا یہ عمل درست تھا؟"

فریال نے نہایت نرم لہجے میں اپنی بات شروع کی۔ اس دوران اس نے کمرے میں موجود صدف خالہ کو قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔

"لو بھلا، اس میں پوچھنے والی کیا بات تھی۔ سب جانتے ہیں تمہارا اور ارحم کا رشتہ بچپن سے طے ہے۔ اب تو شادی کی تاریخ رکھی جا رہی ہے اور ایسے میں تم......"

افشاں حیرت سے بول رہی تھیں جب انہیں فریال نے ایک بار پھر درمیان میں ٹوک دیا۔

"میری پیاری اماں! ضروری نہیں ہے بچپن میں جو شے ہمیں پسند ہو اسے تاعمر اپنے سر پر سوار کر لیں۔ ویسے بھی پسند وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے، خیالات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ انسان بدل جاتے ہیں تو سمجھیں۔ میں، میرے خیالات اور پسند سب بدل گیا اور اب ارحم کی جگہ علی نواز نے لے لی ہے ویسے بھی میں نہیں چاہتی۔ کل کو میری خاطر آپ لوگوں کو ابا کی حق حلال کی کمائی سے بنائے گئے اس گھر سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ امید ہے اب آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ پل بھر کو رکی۔ ایک نظر خالہ کے چہرے پر ڈالی جو غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہلکا سا مسکرائی اور دوبارہ بولی۔

"اور امی جب اور جہاں انسان بدلنا شروع ہوں، وہاں اپنا راستہ تبدیل کر لینا چاہیے کہ یہ ہی بہتر ہوتا ہے ویسے بھی دلوں میں موجود حرص اور لالچ رشتوں کو کھا جاتا ہے اور رشتہ کپڑا نہیں ہوتے جنہیں ہم دوبارہ رفو کر کے استعمال کر لیں۔"

اب خالہ صدف کی برداشت جواب دے گئی اور وہ تڑخ کر بولیں۔

"اے بیٹا! اتنا گہرا فلسفہ بولنے کی کیا ضرورت ہے، صاف کہو وقت کے ساتھ تمہاری پسند بدل گئی۔ وہ مقام جو کل ارحم کا تھا، آج اس لڑکے کو دے دیا جو یہاں رشتہ لے کر آن پہنچا۔ شاباش ہے بھائی ہم ہی بے وقوف نکلے جو پرانا رشتہ نبھانے ایک بار پھر آ گئے۔"

خالہ صدف کی بات سن کر فریال بے اختیار ہنس دی یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ خالہ نے سارا الزام اس پر ڈال کر اپنے ہاتھ اور لباس جھاڑیے، بری الذمہ ہو چکی تھیں مگر فریال کو اب کسی کی پروانہ تھی وہ جو فیصلہ کر چکی تھی اٹل تھا۔ ارحم اپنا مقام کھو چکا تھا تو کوئی فرق نہ پڑتا تھا علی یا کوئی اور۔ فریال کے اس فیصلہ کی مخالفت میں صرف ایک ووٹ تھا اماں کا باقی پاپا اور بڑی اماں اس کی حمایت میں کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے پھڑ پھڑ رکا ہے کا۔ ویسے بھی خالہ اگلی صبح غصے سے بھری تمام رشتے توڑ کر حیدر آباد واپس جا چکی تھیں۔ اسی شام علی کے گھر والے اپنا جواب لینے حاضر ہو گئے، جو کچھ دن کی مہلت کے بعد انہیں اثبات میں مل گیا۔ علی اور فریال کے نکاح کی وہ ہی تاریخ تھی جس پر اس کا ارحم سے نکاح ہونا طے پایا تھا۔

☆☆☆

آج اس کی سالگرہ کا دن تھا، جو دیگر تمام سالوں سے زیادہ دلفریب اور خوب صورت تھا۔ سالگرہ کے علاوہ بھی مزید دو خوشیاں اس کا مقدر بنیں ایک تو علی جیسے مخلص ساتھی کا ساتھ تاعمر اس کا نصیب ٹھہرا۔ جب کہ دوسری خوشی جو بالکل غیر متوقع اور اچانک تھی۔ ایک ایسی خوشی جس نے فریال کو کئی لمحوں کے لیے گنگ کر دیا۔ اسے یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ اللہ یوں بھی مہربان ہوتا ہے۔ حیرت انگیز تھا وہ لمحہ جب نکاح کے بعد علی نواز نے حق مہر کے طور پر اسے وہ مکان تحفہ میں دیا، جو اس کے نانا کی نشانی تھا۔ جو اس کی ماں کو ملنے والا ایک قیمتی تحفہ تھا۔ جو اپنوں کی ہوس کے ہاتھوں ان سے چھن گیا۔ ١٠٠ اینٹ اور سمنٹ سے بنا بے جان گھر ایک ایسے شخص کے ذریعہ اس تک واپس آیا، جو شاید جانتا تھا دلوں کو تسخیر کس طرح کیا جاتا ہے۔ علی اس کا شریک سفر تھا اس پر وہ جتنا ناز کرتی کم تھا۔

سمیرا عثمان

ڈوبنے کے بعد

ڈوبتے سورج کی سرمئی کرنوں میں اس کی چمپئی رنگت کتنی دلکش لگ رہی تھی۔ یہ اداس سوگوار سا حسن اتنا حسین تھا کہ اس سے زیادہ خوب صورت کچھ بھی نہیں تھا مگر وہ اداس تھی۔ اس کے پاس جو پیسے تھے ان میں اس کا من پسند سوٹ نہیں آ سکتا تھا اور ادھار اسے کوئی دینے کو تیار نہیں تھا۔ یہاں سے وہاں ٹہلتی جب تھک گئی تو منڈیر کے پاس آ کر رک گئی۔

امی سبزی بنانے میں مشغول تھیں۔ سحر اپنی کتابوں میں گم اور سیما نے سوٹ سلائی کر لیا تھا اور اب سامنے پھیلائے دیکھ رہی تھی۔

''واؤ! یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔'' اس نے ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگیں اور سوٹ اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا پھر ڈریسنگ کے مقابل جا کر خود کو سر تا پا دیکھنے لگی۔

فیروزی رنگ اس کی سنہری رنگت پر کیسا دمکنے لگا تھا۔

''صبا! یہ کیا حرکت ہے۔'' سیما کو اس پر بے حد غصہ آیا تھا۔

''کل کالج کے فنکشن میں یہی پہن کر جاؤں گی، دیکھو کیسا جچ رہا ہے مجھ پر۔'' اسے سیما کے غصے کی کوئی پروا نہیں تھی۔

''یہ غزل کا سوٹ ہے اور اس نے مجھے سلائی کرنے کے لیے دیا تھا۔ تمہارے پہننے کے لیے نہیں۔'' سیما نے ہاتھ بڑھا کر سوٹ جھپٹ لیا تھا۔

''میں بھی دیکھتی ہوں تم مجھے کیسے روک کر دکھاتی ہو۔'' صبا نے سوٹ واپس کھینچا تو سیما نے خراب ہونے کے ڈر سے فوراً چھوڑ دیا۔

ناولٹ

''اسے پتا چلا تو کیا ہوگا؟'' سیما کی رنگت اس کی دیدہ دلیری پر متغیر ہو رہی تھی۔

''کیسے پتا چلے گا، تمہارا اور میرا کالج الگ ہے اور پھر میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔ دو گھنٹے میں کیا خراب ہو جائے گا۔'' اب وہ دوپٹہ خود پر ڈالے خوش ہو رہی تھی۔

''میں امی کو بتاتی ہوں، تم ہو ہی بد تمیز۔'' سیما کی آواز پر فہمیدہ بھی آ چکی تھیں۔ ''کیا تماشا لگایا ہوا ہے، تمہارے ابو کے آنے کا وقت ہو رہا ہے بند کرو اپنی یہ حرکتیں اور سبزی بنا دی ہے میں نے 'جا کر ہانڈی چڑھاؤ۔'' انہوں نے آتے ہی دونوں کو ڈپٹا تھا۔

''مجھ سے نہیں ہوتے یہ کام۔ ہانڈی چڑھاؤ، برتن دھوؤ اور نہ ہی یہ جھاڑو پوچھا ہوتا ہے مجھ سے۔'' اس نے سوٹ شاپر میں ڈالا اور اونچے اسٹول پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

''اچھا جی اور تم تو جیسے کسی منسٹر کی بیٹی ہو۔'' امی کو مزید تپ چڑھی تھی۔

''منسٹر کی بیٹی نہیں لیکن کسی اعلا عہدہ دار کی بیگم صاحبہ ضرور بنوں گی۔'' آنکھوں میں خوش رنگ روپہلے خوابوں کا عکس جھلملایا تھا۔

''امی! یہ غزل کا سوٹ پہننے کی ضد کر رہی ہے۔'' سیما کو اپنا رونا یاد آیا۔

''دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔ نئے اور پہنے ہوئے میں واضح فرق محسوس ہوتا ہے اور پھر جس کا ہے، وہ پہنے۔ تم کیوں پہنو گی۔''

''کل میرے کالج میں فنکشن ہے یا تو میں یہ سوٹ پہنوں گی یا پھر مجھے آٹھ ہزار کا سوٹ لا کر دیں۔'' غصے میں اس نے شاپر دور اچھال دیا، جسے فوراً سیما نے اٹھا کر قابو کیا۔

''آٹھ ہزار میں پورے سیزن کے سوٹ آ جاتے ہیں۔''

''اب نہ جانے یہ کس زمانے کی بات ہے۔'' اس نے منہ بسورا۔

''صبا! میرا سوٹ پہن جاؤ۔'' سحر نے آفر کی۔

''دو ہزار کا سوٹ پہن کر میں نے دوستوں میں انسلٹ نہیں کروانی۔'' اب وہ روہانسی ہو چکی تھی۔

''تو بندہ اپنی اوقات میں رہ کر کام کرے، اب یہ اتنا بھی ضروری نہیں فنکشن میں جانا۔'' امی کی مزید ڈانٹ کے بعد سب ادھر اُدھر ہو گئیں اور وہ جہاں تھی، وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے جو سوچ لیا تھا اسے وہی کرنا تھا۔

☆☆☆

فنکشن کے بعد اسے عباد پک کرنے آیا تھا۔ وہ اس کے چچا کا اکلوتا بیٹا اور اس کا فیانسی بھی تھا۔ بے چارہ کب سے گیٹ پر کھڑا تھا اور اس کی دوستوں سے الوداعی ملاقاتیں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں۔

''جلدی آؤ، پھر مجھے دوست کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کے لیے بھی جانا ہے۔'' تنگ آ کر اس نے صبا کے سیل فون پر میسج کیا تھا۔

جسے دیکھنے کے بعد برے برے منہ بناتی وہ چلی ہی آئی تھی۔

''کیا تم بے زار سی شکل بنائے مجھے لینے آ جاتے ہو۔''

''اب اس اعزاز میں دھمالیں ڈالنے سے تو رہا۔'' اس کے بیٹھتے ہی اس نے بائیک اسٹارٹ کر دی۔

''گھر چلنے کی ضرورت نہیں، پہلے مجھے آئس کریم کھلا کر لاؤ۔''

''یار! مجھے کمبائن اسٹڈی کے لیے جانا ہے۔ بتایا تو تھا۔'' عباد اس نئی فرمائش پر اچھا خاصا جز بز ہوا تھا۔

''لوگ تو ترستے ہیں، اپنی منگیتر کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے اور ایک تم ہو، آدم بے زار۔ ذرا جو تمہیں پروا ہو۔'' اس کا موڈ بری طرح خراب ہوا تھا۔

''اونہوں، کھانے پینے کے علاوہ بھی تمہیں کوئی بات آتی ہے۔'' اب وہ اسے تنگ کر رہا تھا، لیکن

بائیک اس نے آئس کریم پارلر کی سمت موڑ لی تھی۔
''آدھی سے زیادہ میری پاکٹ منی تم کھا جاتی ہو، تمہیں دیکھتے ہی ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے اور وہ ہے خرچا۔''
صبا نے اپنے لیے دو آئس کریم منگوائی تھیں، جس پر عباد مسلسل اسے چھیڑے جا رہا تھا مگر اس کا دھیان عباد کی باتوں سے زیادہ سامنے والی میز پر تھا۔ جہاں غزل اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھی تھی اور نہ صرف اسے دیکھ چکی تھی بلکہ اپنا سوٹ بھی دیکھ چکی تھی جو صبا نے رات ہی سیما کے بکسے سے نکال کر اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا اور پھر وہ چچا کے گھر آ کر تیار ہوئی تھی۔
غزل نے اسے ان دیکھا کر دیا لیکن اس بوکھلاہٹ میں آئس کریم دامن پر گر گئی، چاکلیٹ کے داغ بھی لگ گئے۔
واپسی میں عباد چہکتا ہی رہا مگر اسے چپ لگ گئی، وہ سمجھا اس کی کسی بات پر خفا ہو چکی ہے۔ چچا کے گھر جانے کے بجائے وہ سیدھا گھر آ گئی تھی۔
سیما نے اسے وہ سوٹ پہنے دیکھا تو مارے صدمے کے اس کا برا حال ہو گیا، اس پر چاکلیٹ کے داغ..... تو اب اسے واش بھی کرنا پڑے گا۔
''امی! دیکھا آپ نے، اگر ابھی وہ اپنا سوٹ لینے آ گئی تو میں کیا کہوں گی۔'' سیما رونے لگی۔
صبا اپنی جگہ چور سی بن گئی۔ جا کر خاموشی سے لباس تبدیل کر لیا۔ امی باہر مسلسل باتیں سنا رہی تھیں لیکن اس کی نظروں میں آئس کریم پارلر کا منظر گھوم رہا تھا۔
غزل کی زندگی کتنی خوب صورت تھی۔ مہنگا ترین لباس، میچنگ جوتے اور ہینڈ بیگ، ہمیشہ سوٹ کے ہم رنگ ہوتا۔ دوستوں کے ساتھ گھومنا، ہوٹلنگ کرنا یہ سب کتنا خوب صورت تھا۔
کب سے کمرے میں اندھیرا کیے آنکھیں موندے وہ محض غزل کے متعلق سوچ رہی تھی، جب سحر نے آ کر اسے بلایا تھا۔
''صبا! اٹھو کھانا کھا لو۔''
''کیا پکایا ہے؟''
''آلو مٹر اور چاول۔''
''مجھے نہیں کھانے۔ سبزیوں کے علاوہ بھی کچھ ملتا ہے یا نہیں۔'' اسے اور بھی غصہ آنے لگا، سحر اسے دیکھ کر مسکرائی۔
''امی اور سیما کا غصہ اتر چکا ہے۔ امی نماز میں مشغول ہیں اور سیما تو باجی عمرانہ کے گھر گئی ہے۔ انہیں مہندی لگوانی تھی۔ چچی نے بریانی بھجوائی ہے، اٹھ کر کھا لو۔''
اور پھر اسے نہ اٹھتے دیکھ کر وہ پلیٹ وہیں لے آئی۔ سحر ماسٹرز کر رہی تھی اور ایک اکیڈمی میں پڑھا کر اپنا گزارا کر لیتی تھی۔ سیما کی سلائی اچھی تھی اور دوسرا وہ مہندی بڑی اچھی لگاتی تھی تو خاص و عام موقع کے علاوہ لڑکیاں اپنی شادی پر بھی مہندی اسی سے لگواتی تھیں۔ ایسے اس کا بھی خرچا نکل آتا تھا لیکن وہ ابا سے پاکٹ منی الگ لیتی تھی، امی کو تنگ کرتی۔ کبھی ثاقب بھی مہربان ہو جاتا تھا اور عباد تو تھا ہی...... پھر اسے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔
''سحر باجی!'' بریانی کی پلیٹ صاف کرنے کے بعد ڈرتے ڈرتے سحر کی سماعتوں میں بم پھوڑنے کا ارادہ کیا تھا۔
''وہ غزل نے مجھے آئس کریم پارلر میں دیکھ لیا تھا۔''
''کیا؟'' سحر نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے یقینی سے اسے دیکھا، جو گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے انکشاف پر انکشافات کر رہی تھی۔
☆☆☆
سیما نے دو روز سے اس سے بات نہیں کی تھی اور وہ تو دو روز سے کالج بھی نہیں گئی تھی۔ اسے غزل سے عجیب سی ندامت ہو رہی تھی۔ جب سحر نے اسے بتایا تھا کہ غزل نے صبا کو دیکھ لیا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ صبا کا کیا حشر کر ڈالے۔
''تمہیں بہن سے زیادہ سوٹ کی پروا ہے۔''

صبا کے جذباتی ڈرامے عروج پر تھے۔
"بھاڑ میں جاؤ تم۔" سیما کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔
"صبا! کھانا لے کر آؤ۔" ثاقب ابھی اٹھ کر آیا تھا اور اس کی مخاطب ہمیشہ صبا ہی ہوتی تھی، جو اس کے اس تحکمانہ انداز پر خوب ہی چڑتی تھی۔
"ایسے بھی کوئی انوکھے لاڈلے نہیں ہو تم۔ اپنا کام خود کیا کرو۔ کبھی سوٹ استری، کبھی شوز پالش تو کبھی بے وقت کھانا لے کر آؤ۔ ملازمہ نہیں ہوں تمہاری۔" ٹکا سا جواب حاضر تھا۔
"ایک ہی تو بھائی ہے، اس کا کام کرتے بھی جان جاتی ہے تمہاری۔" سحر اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔
"رات کو برگر، شوارما بھی سحر کو کھلاؤں گا اور اب تم بھی اپنے باہر کے کاموں کے لیے مجھے مت کہنا۔ کبھی نوٹس فوٹو کاپی کروا دو، کبھی دوپٹہ رنگوا دو اور کبھی چنا چاٹ کھلا دو۔" ثاقب نے بھی اس کی نقل اتارتے ہوئے حساب برابر کیا۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس کی نگاہ اب سیما پر پڑی تھی، جو کب سے منہ پھلائے بیٹھی تھی۔
"وہی صبا کی حرکتیں، یہ ندیدی ہمارے گھر جانے کیسے آ گئی۔" طبل جنگ ایک بار پھر بجنے والا تھا، جب ابا کی انٹری ہوئی۔
"ہاں بھئی برخوردار! کیا بنا تمہاری نوکری کا۔" وہ ثاقب سے پوچھ رہے تھے، جسے ماسٹر کے بعد ابھی تک کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں مل رہی تھی۔
"حلوہ بنا ہے۔" ناشتے کی ٹرے اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے وہ بے دلی سے مسکرایا تو ابا نے چشمے کی اوٹ سے اسے گھورا۔
"تو پھر کیا ارادہ ہے؟" ابا خود اسکول ماسٹر تھے اور ان کا ارادہ ثاقب کو بھی یہی ملازمت دلوانے کا تھا لیکن ثاقب شاید قسمت آزمانا چاہتا تھا۔
"ملازمت مل نہیں رہی۔ کاروبار کا تمہیں تجربہ نہیں، تو پھر کیا چاہتے ہو۔" وہ آج کھل کر اس موضوع پر نا صرف بات کرنا چاہ رہے تھے بلکہ ثاقب کو اپنا فیصلہ بھی سنانا چاہتے تھے لیکن اس سے قبل ہی ثاقب فیصلہ کر چکا تھا۔
"ابا! میں باہر جانا چاہتا ہوں، ایک ایجنٹ سے بات ہو چکی ہے میری۔ وہ اٹھارہ لڑکوں کو لے کر جا رہا ہے اور وہ لڑکے بھی میرے واقف ہیں۔"
"یہ ایجنٹ زیادہ تر فراڈ ہوتے ہیں اور پھر ان راستوں میں جان کا رسک بھی ہوتا ہے۔"
ابا نے تو سنتے ہی انکار کر دیا تھا لیکن ثاقب کا اصرار تھا کہ وہ ایک بار ان لڑکوں اور ایجنٹ سے مل لیں، جس پر ابا نے ہامی بھر لی تھی۔
اور پھر ایجنٹ نے ایسا اپنی کاروباری باتوں میں پھسلایا تھا کہ ابا بھی نیم رضامند ہو چکے تھے۔

☆☆☆

غزل اپنی امی کے ساتھ آئی تھی۔ ثاقب کو آج جانا تھا تو پہلے ہی گھر میں اچھی خاصی گہما گہمی تھی۔ کھانا بھی وافر مقدار میں بنایا گیا تھا۔
فہمیدہ، بجیلہ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ اصل میں دونوں کزنز تھیں۔ بچپن سے ہی دونوں میں خوب دوستی تھی۔ بجیلہ کی شادی کے بعد تین بیٹے اور ایک بیٹی غزل تھی۔ غزل چھ ماہ کی تھی جب ان کے میاں نے بیوی بچوں کو باہر بلوایا تھا لیکن کسی وجہ سے غزل کے کاغذ نہیں بن سکے تھے اور ددھیال میں کوئی تھا نہیں، تو فہمیدہ نے چھ ماہ کی غزل کو چار ماہ تک اپنے پاس رکھا تھا۔ تب سے دونوں کی دوستی کچھ اٹوٹ اور گہری ہو چکی تھی حالانکہ دونوں کی کلاس میں بڑا فرق تھا۔
لیکن بجیلہ کے خلوص کے سامنے ہمیشہ ہی فہمیدہ ہار جاتی تھیں، اب بھی اسے ثاقب کے جانے کا پتا چلا تو فوراً چلی آئی تھیں۔
"ایجنٹ کے ذریعے بھجوانے کی کیا ضرورت تھی۔"
"بس دعا کرو اب، خیر خیریت سے پہنچ جائے۔" فہمیدہ کا اپنا دل سہا ہوا تھا۔ اکلوتا بیٹا پردیس جا رہا تھا، جانے کب واپس آئے لیکن بجیلہ نے

ساتھ لگا کر تسلی دی تھی۔

"فکر نہ کرو، بس یونان پہنچ جائے۔ آگے جہانگیر کام اور رہائش کا انتظام کر دیں گے۔" مگر فہمیدہ کے آنسو تھے کہ بہے جا رہے تھے۔

غزل کمرے سے باہر آتے ہوئے ایک دم ہی عباد سے ٹکرا گئی تھی۔ عباد نے اپنے اور اس کے مابین فاصلہ رکھنے کی خاطر اسے بازوؤں سے تھام لیا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" پھر جلدی سے ہاتھ ہٹا کر دو قدم پیچھے ہٹا، چہرے پر بھی معذرت خواہانہ تاثرات تھے۔ وہ پاس سے گزر گئی لیکن واپس کمرے میں آ کر بھی اس کی سانسیں ہموار نہیں ہوئی تھیں۔

جانے کیسی کشش تھی اس لڑکے میں کہ جب بھی اسے دیکھتی مسحور ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی جو آئس کریم پارلر میں بھی اس کا دھیان صبا کے سوٹ کی سمت نہیں گیا تھا۔ اسے یاد تھا جب بچپن میں وہ یہاں آیا کرتی تھی تو وہ مل کر کتنا کھیلا کرتے تھے۔ اب تو اس نے رسما بھی حال احوال نہ پوچھا تھا۔

پھر ان کی فیملی باہر شفٹ ہو گئی۔ حال ہی میں واپس آئے تھے اور یہ اس کے ساتھ آج تیسرا سامنا تھا لیکن اس نے تو رسما بھی اس کا احوال نہیں پوچھا تھا۔

کچھ دیر میں ثاقب کو جانا تھا۔ سب باہر صحن میں بیٹھے تھے۔ وہ بھی باہر آ چکی تھی۔

باہر بہن بھائیوں کا ایموشنل سین چل رہا تھا۔

"ایسے منہ بسور کر مت بیٹھو میرے سامنے۔ آگے سفر دشوار ہے اور مجھے سب کے ہنستے مسکراتے چہرے یاد رکھنا ہیں۔"

ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے ثاقب بظاہر مسکرا رہا تھا لیکن اندر سے اس کا دل بھی عجیب گھبراہٹ کا شکار تھا۔ پہلی بار گھر سے اتنی دور پردیس جا رہا تھا۔ امی اور صبا ایئرپورٹ تک ساتھ گئی تھیں۔ غزل اور اس کی امی رکی تھیں ان کی واپسی تک سیما اور سحر کے پاس۔

☆☆☆

تین روز گزر چکے تھے۔ ثاقب کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ ان کے گھر میں کسی کو بھی کھانے پینے تک کا ہوش نہیں تھا۔ امی تو بس اس روز سے ہی تسبیح لے کر بیٹھی تھیں۔ سحر کے سجدوں اور سیما کی دعاؤں کا دورانیہ بڑھ چکا تھا۔

اور صبا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ان سب کا کیا علاج کرے۔

"بس کر دو تم لوگ۔ اتنا ہی ڈر لگ رہا ہے تو کیا ضرورت تھی ایسے بھجوانے کی۔" اس نے تنگ آ کر کہا۔

"صبا! منہ بند کر لے۔ خبردار کچھ بھی اول فول بولا تو۔" فہمیدہ نے اسے فوراً ہی ٹوکا۔ اس نے کچن میں جا کر ہانڈی کا ڈھکن ہٹایا۔

"ماش کی دال......" جو کل پکا کر رکھی تھی۔ کوئی کھائے تو سالن بھی ختم ہو۔ دو بار تو وہ کھا چکی تھی۔ اب تیسری بار کا سوچ کر ہی اسے ہول اٹھ رہے تھے۔

کسی سے کچھ بھی کہنا بے کار تھا، وہ چھت کی دیوار پھلانگ کر چچا کے گھر آ گئی۔ چاچی نے دال چاول بنائے تھے۔ وہ چپ کر کے سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔

اور پھر اس کی آنکھوں میں غزل کے گھر کا نقشہ گھومنے لگا۔

نت نئی ڈشز' انواع واقسام کے کھانے، خوب صورت گھر، بڑا سا لان...... بچپن میں جب بھی ان کے گھر جانے کی بات ہوتی تو لڑ جھگڑ کر وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو جایا کرتی تھی۔

اسے بالوں والی گڑیا بہت پسند تھی اور غزل کے شوکیس میں تین بالوں والی گڑیا تھیں۔ اس کا کتنا دل چاہا تھا، وہ ایک گڑیا لے جائے اپنے ساتھ اور خالہ نے تو دے بھی دی تھی مگر اس کی امی نے لینے نہیں دی تھی۔ تو اب اسے یاد آ رہا تھا کہ غزل اور خالہ تو کئی بار مدعو کر چکی تھیں لیکن ایک بار کے بعد امی دوبارہ نہیں گئی تھیں۔ اور اب اس ایک بار کو بھی چھ مہینے ہو چکے

تھے۔ اس دوران غزل اور خالہ کئی بار ان کے گھر آ چکی تھیں اور پھر سیما اور غزل کا کالج بھی ایک ہی تھا۔
''خیر اب ایگزام کے بعد میں بھی اسی کالج میں ایڈمیشن لوں گی اور سیما سے زیادہ میری دوستی ہو گی غزل کے ساتھ۔''
''کن خیالوں میں گم ہو۔'' کسی نے آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تھی۔
''تمہارا ہی ویٹ ہو رہا تھا۔'' اس نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور دوپٹہ سیٹ کیا۔
''میں کسی سہیلی کے گھر چھوڑنے نہیں جاؤں گا۔''
''سہیلی کے گھر کون جا رہا ہے، ہم تو پیزا کھانے جا رہے ہیں۔''
''ہم سے مراد؟'' اس نے آنکھیں نکالیں۔
''ہم اور تم۔'' ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکیڑتے ہوئے وہ اس کی بائیک پر چڑھ کر بیٹھی تھی۔ عباد نے اپنی پاکٹ چیک کی اور مسکین سی صورت لیے چل پڑا۔
''ایک جاب لیس بندے سے مہینے کے آخر میں ایسی فرمائشیں ظلم میں شمار ہوتی ہیں۔'' بائیک اب ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔
''اور جس کو کھانے میں تیسری بار ماش کی دال پیش کی جائے، اس کا صبر تمہارے ظلم سے بے انتہا ہے۔''
وہاں بھی ڈھٹائی کی انتہا تھی اور اتنا ہی نہیں لارج پیزا اور لیٹر کولڈ ڈرنک ہڑپ کرنے کے بعد اب وہ اس سے پانچ ہزار کا مطالبہ کر رہی تھی۔
''اتنے پیسے؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔
''پانچ ہزار مانگ رہی ہوں، لاکھ نہیں۔'' صبا نے اس سوچ پر بھی برا مانا تھا۔
''کرنے کیا ہیں تم نے۔'' وہ اب اپنی دوسری پاکٹ چیک کر رہا تھا۔
''سیما کو دینے ہیں، وہ آج کل کالج نہیں جا رہی۔ اصل میں وہ غزل سے شرمندہ ہے، میں نے اس کا سوٹ پہنا تھا جو اس نے سلائی کے لیے دیا تھا لیکن خیر جو ہونا تھا، ہو چکا۔ تین ہزار سیما کے پاس ہیں، باقی یہ ملا کر وہ اسے سوٹ کی رقم دے گی جو کہ وہ لے گی نہیں تو کل پرسوں تک واپس کر دوں گی۔''
''تمہاری حرکتیں کب سدھریں گی؟'' اب وہ باقاعدہ اسے گھور رہا تھا۔
''جب تم سی ایس ایس کے بعد اعلا سرکاری افسر لگ جاؤ گے تب۔'' رقم لے کر بیگ میں رکھی لیکن اسے باور کروانا نہیں بھولی۔
''واپس کر دوں گی۔''
''جانتا ہوں تمہاری واپسی۔ پہلے بھی جو کی ہو۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے بائیک اسٹارٹ کی تھی۔

☆☆☆

غزل اور وہ کلاس لے کر باہر نکلی تھیں۔ دونوں کا رخ اب کینٹین کی سمت تھا۔ غزل نے سموسے اور کولڈ ڈرنکس آرڈر کی تھی، جب سیما نے بیگ سے کچھ نوٹ نکال کر غزل کی سمت بڑھائے تھے۔
''غزل! میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ صبا کی حرکتیں ہمیشہ ہی اوٹ پٹانگ ہوتی ہیں۔ اب تم سوٹ کی جگہ یہ رکھ لو پلیز۔''
''کیا کہہ رہی ہو، میں سمجھی نہیں۔'' وہ حیران ہو رہی تھی اور سیما سوچ رہی تھی کہ شاید وہ بھولنے کا ڈرامہ کر رہی ہے، پھر ساری بات اسے بتانا پڑی، جسے سنتے ہی وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔
''صبا اور میں بالکل کامن ہیں۔ مجھے بھی ہمیشہ دوسروں کی چیزیں اچھی لگتی ہیں اور یقین جانو، مجھے بالکل بھی برا نہیں لگا۔ وہ تو بالکل میری بہنوں جیسی ہے، وہ سوٹ تم صبا کو میری طرف سے گفٹ کر دو۔''
''لیکن......''
''ریلیکس یار! بالکل پاگل ہو تم۔ جو اتنا گلٹ فیل کر رہی ہو، اچھا یہ بتاؤ۔ عباد کیوں اتنا ریزروسا ہو گیا ہے۔ بچپن میں تو کافی ہنس مکھ اور باتونی ہوا کرتا تھا، پہلی بار تم لوگوں کے گھر آتے ہوئے میں نے

اسے ان کے گیٹ میں کھڑے دیکھا تھا۔ دوسری بار آئس کریم پارلر اور اس روز تم لوگوں کے گھر سامنا ہوا لیکن اس نے شاید پہچانا نہیں تھا۔"

سموسوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کافی سرسری انداز میں وہ اس کا ذکر کر رہی تھی، جیسے محض موضوع بدلنا چاہ رہی ہو۔

"اسے تو صبا کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ بے چارے کی جان عذاب کی ہوئی ہے، سی ایس ایس کے چکر نے۔ صبا کے خواب بڑے اونچے ہیں اور عباد کوشش کر رہا ہے، ان خوابوں کی تکمیل کر سکے۔"

اسے چونکہ صبا پر بے حد غصہ تھا اور اس بات پر اور بھی زیادہ کہ وہ عباد سے پیسے لے کر آئی تھی تو اب وہ کھل کر بھڑاس نکال رہی تھی۔

"صبا اور عباد۔" اس کی آنکھوں میں سوال تھا اور اس سے زیادہ چہرے کی رنگت بدلی تھی۔

"بس بڑوں میں ایک بات طے ہے، باقاعدہ منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی لیکن عباد کا جھکاؤ صبا کی طرف زیادہ ہے۔"

سیما نے ایک بار پھر اسے رقم دینے کی کوشش کی لیکن غزل نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"میں تمہیں نہیں صبا کو گفٹ کر رہی ہوں۔"

☆☆☆

بہت دنوں بعد ثاقب کی کال آئی تھی۔ وہ بخیریت پہنچ چکا تھا۔ کچھ جہانگیر انکل نے اپنے تعلقات استعمال کیے تھے۔ اسے رہائش اور کام مل چکا تھا۔ گھر بھر میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

صبا نے فرمائشی لسٹ تیار کرنا شروع کر دی تھی اور فون پر بات کرتے ہی پہلے سیل فون کا مطالبہ کیا تھا۔

غزل آج کل ان کے گھر بہت آنے لگی تھی اور یوں گھل مل گئی تھی، جیسے ہمیشہ سے ان کے بیچ رہتی رہی ہو۔ اس وقت بھی وہ کالج سے سیما کے ساتھ آئی تھی۔ سحر نے دال چاول بنائے تھے۔ سیما نے ساتھ شامی کباب فرائی کر لیے۔

رائتہ پہلے سے موجود تھا۔

"سحر بہت اچھا کھانا بناتی ہو تم۔" نہ صرف وہ مزے لے کر کھا رہی تھی بلکہ خوب تعریفیں بھی کر رہی تھی۔ صبا کو اس کی کلائی میں سجا بریسلیٹ اتنا دلکش لگ رہا تھا، کب سے اس کی نظریں اس پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"اب کی بار ثاقب کی کال آئے گی تو کہوں گی مجھے بھی ایسا ہی بریسلیٹ چاہیے۔" یہ سوچ کر اس نے سیل فون سے اس کی تصویر اتاری تھی۔

"تمہیں اتنا ہی پسند ہے، تو یہی لے لو۔" غزل نے ایک سیکنڈ میں اتار دیا تھا۔

"واقعی میں لے لوں؟" صبا نے تو مروتاً بھی انکار نہیں کیا۔ سیما کو بہت غصہ آیا، بھلا وہ سوٹ والی شرمندگی کیا کم تھی۔

"صبا!" سحر نے گھورا۔

"ہاں تو وہ اپنی خوشی سے دے رہی ہے۔ میں نے کوئی زبردستی تو نہیں لیا۔" اس نے پہن بھی لیا تھا۔

"اور مجھے تو اتنا پسند بھی نہیں تھا۔ کل مجھے شاپنگ پر جانا ہے صبا! کیا تم میرے ساتھ چلو گی۔" غزل نے دوسرا شامی کباب اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں تم مجھے پک کر لینا۔ میں ویسے ہی آج کل فری ہوں۔"

اتنے بڑے شاپنگ مال سے شاپنگ کا تصور ہی کس قدر شاہانہ تھا۔ اسے تو رات بھر ٹھیک سے نیند ہی نہیں آئی تھی۔ پانچ ہزار میں بھلا کیا آنا تھا، یہ وہی پیسے تھے جو سیما نے اسے واپس کر دیے تھے لیکن اس نے عباد کو لوٹانے میں ڈنڈی ماری تھی۔ اسی وجہ سے کوئی اسے ادھار نہیں دیتا تھا۔

اگلے روز غزل نے اپنی شاپنگ کم کی تھی اور اسے بہت کچھ دلا دیا تھا، واپسی میں وہ اسے اپنے ساتھ گھر بھی لے آئی تھی۔ گھر تھا یا خوابوں کا محل...... اور صبا کے لیے تو محل ہی تھا کیونکہ جس علاقے میں وہ رہتی تھی اس کے تو بالکل برعکس تھا۔

”تم کتنی لکی ہو یار! کتنا مزے کا بیڈ روم ہے تمہارا۔“ بستر پر گرتے ہی اس نے دو تین بار اچھل کر دیکھا اور وہ اس کے بچکانہ پن پر ہنسے جا رہی تھی۔

”یار! میں اتنا سب گھر کیسے لے کر جاؤں گی۔ امی تو بعد میں کچھ کہیں گی۔ پہلے وہ دونوں بلیاں مجھے نہیں چھوڑیں گی۔“

”کچھ نہیں ہوگا، تم ایسے ہی پریشان ہو رہی ہو۔ میں خود تمہیں چھوڑ کر آؤں گی۔“

غزل نے جان بوجھ کر سارے شاپنگ بیگز بیڈ پر الٹ دیے اور ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ صبا کی آنکھوں میں جیسے شوق کا جہاں آباد تھا۔ ساری زندگی سیل سے لے کر چیزیں پہنی تھیں۔

ڈنر میں اس کی ملاقات بجیلہ آنٹی سے ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

”تم سیما اور سحر کو بھی لے کر آتیں نا۔“

”میں تو آج غزل کے ساتھ شاپنگ کی وجہ سے آئی تھی۔“

”اچھا تو پھر اتوار کی دعوت پکی ہے۔ میں ڈرائیور بھیج دوں گی۔ فہمیدہ سے کہنا کہ وہ بھی ضرور آئے۔“ خود ہی انہوں نے پروگرام سیٹ کر لیا تھا، صبا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تب ہی کسی اور نے بھی انہیں جوائن کیا تھا۔

”گڈ ایوننگ ایوری باڈی۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر عین اس کے مقابل بیٹھا تھا۔

”عاشر! یہ صبا ہے۔“ غزل نے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”نائس ٹو میٹ یو۔ آئی تھنک کافی عرصے بعد ملاقات ہو رہی ہے اور صبا! کیا کرتی ہو تم۔“ امیر شہزادے کا انداز کس قدر دوستانہ تھا، اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

”ایف ایس سی کے ایگزام دیے ہیں۔“

”گڈ...... آگے کیا پلان ہے میڈیکل میں جائیں گی۔“ کھانے کے دوران ماحول دوستانہ ہی رہا

پھر غزل اسے ڈراپ کرنے آئی تھی۔

دروازے میں اس کی مڈبھیڑ عباد سے ہوگئی تھی۔ غزل نے گاڑی سے اس منظر کو دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہی۔

عباد الجھا سا واپس گھر میں چلا گیا تھا۔ وہ تائی کے امیر رشتے دار تھے اور یہ لڑکی غزل کیوں چپکے چپکے اسے دیکھا کرتی تھی، وہ اس چوری سے گھبراتا تھا۔

☆☆☆

”ہاں تو کیا حرج ہے، جو ہم ان کے گھر جائیں۔“ صبا کسی صورت اس دعوت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھی اور فہمیدہ مان نہیں رہی تھیں۔

”ہمارا اور ان کا کیا ملاپ ہے۔ وہ بجی کبھی محبت میں آ جاتی ہے تو ٹھیک ورنہ ایسے منہ اٹھا کر ان کے گھر جانا بہت معیوب لگتا ہے اور پھر کسی کی پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔“

بجیلہ کی بے تکلفی اور محبت کے باوجود ان کے گھر پر تکلف ڈنر پر جانا انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”تو جو ثاقب نے ڈالر بھجوائے ہیں، ان کو بھی ہوا لگنے دیں نا۔“ وہ ضد پر ضد کیے جا رہی تھی، کچھ سیما اور سحر کی بھی مرضی شامل تھی پھر جب بجیلہ نے رات میں دوبارہ فون کیا تو وہ بھی مان ہی گئیں۔

صبا کو اچانک چچی کا پیغام یاد آیا تھا، وہ چھت سے سیڑھیاں اتر کر ان کے گھر آئی تو وہ تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں اور عباد ان کے ساتھ مٹر چھیل رہا تھا۔

”مستقبل کے اعلا عہدے دار کو یہ کام بالکل سوٹ نہیں کرتے۔“ وہ چچی کی دوسری سمت آ بیٹھی تھی۔

”بالکل یہ مستقبل کی بہو کی ذمہ داری ہیں۔“ اس نے ٹوکری صبا کی گود میں رکھ دی، چچی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

صبا نے اسے گھورا۔

”مجھے یہ کام بالکل پسند نہیں۔“

”دیکھ لیں امی! ابھی بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی

کرلیں۔ یہ نہ ہو کل کو پچھتانا پڑے۔ محترمہ کو، ابھی سے اپنے پھوہڑ پن میں نہ صرف کافی ماہر ہیں بلکہ اس کا اقرار بھی کس قدر دھڑلے سے کر رہی ہیں۔"
اب وہ ماں کو بھڑکا رہا تھا۔

"اس عمر میں سب ہی بچیاں ایسی ہی لا ابالی ہوتی ہیں۔ وقت پڑنے پر سب آ جاتا ہے۔ صبا جاؤ، کمرے سے شاپنگ بیگ لے کر آؤ۔" بیٹے کو گھورتے ہوئے انہوں نے صبا کو اٹھایا تھا ورنہ طبل جنگ بس بجنے ہی والا تھا۔

اور ہر ایسی جنگ کے بعد وہ منگنی ہی توڑ دیا کرتی تھی اور یہ رشتہ اب تک سو بار ٹوٹ کر دو سو بار جڑ چکا تھا۔

اور عباد کہتا تھا۔

"جانتا ہوں کبھی گفٹ لینے اور کبھی زنگر کھانے کے لیے رشتہ توڑتی ہے۔" بعد میں وہ ایسی ہی چیزوں سے مانا کرتی تھی۔

اس شاپنگ بیگ میں ایک خوب صورت سوٹ تھا، لیکن پتا نہیں کیوں وہ پہلے کی طرح خوش نہیں ہو رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں ابھی تک وہ شاپنگ مال گھوم رہا تھا، جہاں اتنے خوب صورت سوٹ تھے کہ نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ اس نے ایک نئی ضد لگا لی تھی۔

"سیما! تم یہ سوٹ لے لو اور جو امی نے تمہیں سوٹ کے لیے پیسے دیے ہیں، وہ اور میرے سوٹ کے پیسے ملا کر وہ سوٹ آ جائے گا جو میں نے شاپنگ مال میں دیکھا تھا۔ اگر کچھ کم بھی ہوئے تو میں اپنے پاس سے ملا لوں گی۔" ایسی باتوں میں اس کا حساب کتاب کمال کا ہوتا تھا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے، چچی نے تمہارے لیے اتنے شوق سے لیا ہے۔ اب تم ہی سلواؤ اور یہ جو ایک بار شاپنگ مال کا چکر لگا کر تمہارے دماغ میں اتنا خناس بھر چکا ہے۔ میں غزل سے کہوں گی کہ آئندہ اسے مت لے کر جانا، وہ عادتیں خراب کر رہی ہے تمہاری۔"

"دفع ہو تم۔" منہ بنا کر اس نے کمبل تان لیا پھر کچھ یاد آیا تو اس کے کان میں گھس کر سرگوشیاں کرنے لگی۔

"ویسے غزل کا بھائی یاد ہے تمہیں، عاشر!"

"ہاں تھوڑا تھوڑا سا۔" سیما نے یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اتنا بااخلاق اور ہینڈسم ہے، میں تو بے حد متاثر ہوئی اس بندے سے...... نخرہ تو نام کا بھی نہیں۔"

"سو جاؤ صبا!" سیما کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، وہ مزید صبا کی لن ترانیاں نہیں سن سکتی تھی۔ صبا اس عدم دلچسپی پر جی بھر کر بدمزا ہوئی پھر چشم تصور میں وہ خود ہی چلا آیا۔

☆☆☆

بازار سے سب کے نئے سوٹ آ گئے تھے، جنہیں سحر اور سیما نے تین دن لگا کر سلائی بھی کر دیا تھا۔ اتوار کی صبح سب معمول سے قبل ہی جاگ چکی تھیں۔ ناشتہ بھی ہلکا پھلکا ہی کیا تھا اور اب سب اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ خوب صورت تو تینوں ہی تھیں، اب ذرا سی تیاری نے جیسے چار چاند لگا دیے تھے۔

جمیلہ نے ان کے لیے ڈرائیور بھجوایا تھا۔

"اتنا خوب صورت گھر۔" سیما اور سحر مسحور ہو رہی تھیں۔ صبا ان کو ساتھ لیے سب سے آگے تھی، جیسے اسے تو سارے راستے ازبر تھے۔ لاؤنج میں غزل اور جمیلہ آنٹی نے انہیں ریسیو کیا تھا۔

ہلکی پھلکی باتوں کے بعد ایک پرتکلف لنچ ان کا منتظر تھا۔ عاشر نے لیٹ جوائن کیا تھا لیکن اسے دیکھتے ہی صبا نے سیما کو زور سے کہنی ماری تھی۔ وہ ان سب کے ساتھ بھی بہت اچھے سے ملا تھا۔

ان سب کے جانے کے بعد غزل بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیسے ایک منٹ میں صبا کو عاشر کے ساتھ سیٹ کر دے۔ کچھ روز بعد ان کا کالج اسٹارٹ ہو گیا۔ سیما

سے اس کے ایک سبجیکٹ کا فرق تھا اور اتفاق سے اس پیریڈ میں صبا بھی فری ہوتی تھی تو بس پھر دونوں کی لمبی لمبی باتیں چلتیں اور ان باتوں میں سب سے زیادہ ذکر عاشر کا ہونے لگا تھا۔

اور اب تو عاشر کی پسند ناپسند جیسے صبا کو بھی ازبر ہو چکی تھی۔ اس روز بھی سیما نہیں آئی تھی تو غزل نے صبا کو ڈراپ کیا تھا، ساتھ عاشر بھی تھا۔

کزنوں والی بے تکلفی تو نہیں لیکن اب دونوں میں بات چیت ہونے لگی تھی اور وہ کتنی عزت سے بات کرتا تھا۔ اتنی کانفیڈنٹ اور بولڈ صبا اس کے سامنے جیسے دم سادھ کر بیٹھا کرتی تھی۔

اور آج غزل کی ایک بات نے صبا کو حیران کر دیا تھا۔

''صبا! مجھے لگتا ہے عاشر تمہیں پسند کرتا ہے۔''

اور صبا کے کان ___ جیسے ابھی تک سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ چھت کے ایک کونے میں منڈیر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

آنکھوں میں بار بار عاشر کا سراپا گھوم رہا تھا۔

اس کا گھر، لائف اسٹائل اور وہ بندہ خود کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف عباد تھا۔ ادھوری تعلیم، پرانا گھر، کیا پتا وہ اس کے خوابوں کو بھی پورا کر بھی سکے یا نہیں۔

اس کا دل نہیں، سوچ بدلنے لگی تھی۔

☆☆☆

ثاقب کو باہر ایک نئی نوکری مل گئی تھی جو پہلے سے کافی بہتر تھی اور اب گھر میں ڈالر آنے لگے تھے۔ ان کا طرز زندگی ہی نہیں، اب سوچ بھی بدلنے لگی تھی۔ ایک جاننے والی کے توسط سے سحر کا رشتہ آیا تھا۔ صبا ضد کر کے ساتھ گئی تھی، لڑکا دیکھنے...... اور گھر واپس آتے ہی اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''وہ لڑکا کسی بھی صورت سحر کے قابل نہیں ہے امی! آپ بھی لڑکیوں کے جہیز بنانا چھوڑیں اور یہ گھر بیچ کر کسی اچھے علاقے میں رہائش اختیار کریں، چاہے کرائے کا ہی سہی۔ گھر خوب صورت ہو گا تو خود بخود اچھے گھرانوں کے رشتے آنا شروع ہو جائیں گے اور سب سے پہلے تو رشتہ داروں میں مٹھائی منگوا کر بانٹیں تاکہ سب کو پتا چلے کہ ثاقب کے قدم جم چکے ہیں۔ باقی کی پبلسٹی رشتے دار خود ہی کر دیں گے۔''

بات فہمیدہ کے بھی دل کو لگی تھی اور جلد ہی انہوں نے اس پر عمل درآمد بھی کر دیا تھا۔ چند روز بعد ان کا سامان شفٹ ہو رہا تھا۔

آدھے سے زیادہ سامان تو صبا نے وہیں آس پڑوس میں بیچ ڈالا۔ عباد کے لیے یہ ساری صورت حال ناقابل یقین تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ اور اداس ہو رہا تھا۔

''تمہارے بغیر اب دل کیسے لگے گا۔''

''ویسے کیا ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہو۔''

اس نے ادائے بے نیازی سے سر جھٹکا۔

''کیا تمہیں ان برگر، سموسوں اور گول گپوں کی یاد نہیں آئے گی، جو ہر دوسرے روز میں تمہارے لیے لے کر آتا تھا۔''

عباد نے جان بوجھ کر چڑایا لیکن وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی اب ان چیزوں سے بہت دور نکل چکی تھی۔ اسے تو اب تک وہ بوفے ڈنر نہیں بھولا تھا جو غزل اور عاشر کے ساتھ اس نے کیا تھا۔

کیسے غزل کھڑے کھڑے ہزاروں روپے خرچ کر دیتی تھی، ابھی پچھلے دنوں اس نے صبا کو اسمارٹ فون گفٹ کیا تھا۔

''فری ہوم ڈلیوری سے سب مل جاتا ہے۔'' وہ کہہ کر خود ہی ہنسی اور عباد نے دیر تک سوچا۔ کیا اہمیت بس چیزوں کی تھی۔

☆☆☆

نئے گھر میں شفٹ ہوئے مہینے سے اوپر ہو چکا تھا۔ نیا فرنیچر، کراکری، پردے صبا نے سارے پیسے بس گھر کی سجاوٹ میں ہی اڑا دیے تھے۔ وہ تو اس نئے گھر اور ماحول میں بہت خوش تھی لیکن فہمیدہ کو بھی کبھی پرانا محلہ یاد آنے لگتا تھا۔

''یہاں بالکل میرا دل نہیں لگ رہا ہے، ہر چیز

مصنوعی اور اوپری سی لگ رہی ہے اور کیسے محلے دار ہیں۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن، کسی کو دوسرے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ نہ کوئی کسی کے گھر آتا ہے۔ یہ صبا کی باتوں میں آ کر بڑی غلطی کی ہے۔ بس سیما اور سحر کی شادی ہو جائے تو ہم نے تو پرانے محلے ۔ ہی چلے جانا ہے۔''

وہ روز یہی شکوہ کرتیں مگر باقی سب مگن تھے، کسی کو پرانے محلے کی خاص پروا نہیں تھی۔

صبا کی سالگرہ تھی اور سب کے میسج کے ساتھ عاشر نے بھی اسے وش کیا تھا۔ پہلی بار اس کے سیل فون پر عاشر کا میسج آیا تھا۔ وہ بھی ڈھیر ساری بیسٹ وشز کے ساتھ۔ بار بار وہ اس میسج کو کھول کر دیکھ رہی تھی اور پھر کچھ سوچ کر اس نے کال کر دی۔

''ہیلو!'' دوسری بیل پر کال ریسیو ہو چکی تھی۔

''آپ کو میرا برتھ ڈے یاد تھا۔'' وہ محتاط سے انداز میں گویا ہوئی۔

''بھئی تمہاری دوست نے کل سے کان پکا رکھے تھے، گفٹ کے چکر میں دو گھنٹے اپنے ساتھ مجھے بھی خوار کروایا۔ تب جا کر کچھ پسند آیا محترمہ کو۔''

اس کا وہی سادا سا بے تکلفانہ جواب تھا جو صبا کو کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا یا وہ کچھ اور سننا چاہتی تھی۔

''اور آپ نے کوئی تحفہ نہیں لیا میرے لیے۔'' وہ جانے کیسے اتنے حق سے جتا گئی۔ واپسی میں مردانہ قہقہہ سنائی دیا۔

''تم اسے غزل کا اور میرا مشترکہ سمجھ لو۔'' عاشر کو دل رکھنے کی عادت تھی۔ وہ دیر تک سیل فون کو گھورتی رہی۔

''ایسا بھی کیا خاص تحفہ تھا۔''

اور یہ اسے اگلے روز کالج میں جا کر پتا چلا۔ حسب معمول ان کا پیریڈ فری تھا اور غزل اسے کھینچ کر ایک الگ تھلگ گوشے میں لے گئی تھی۔

''اب آنکھیں بند کرو۔''

''بھئی کیا فلمی سچویشن ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''تم کرو نا۔'' وہ بضد تھی۔

''اچھا کر لیں۔'' اس نے آنکھیں بند کیں تو غزل نے اس کے گلے میں بازو ڈال کر ایک لاکٹ اس کے سامنے لہرایا جس کی چین میں ایک دل کی شکل والا لاکٹ تھا۔

''ابھی میرا سرپرائز ختم نہیں ہوا۔'' اور پھر اس نے دل کو کھول دیا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے صبا کا سانس رکا تھا۔

دل میں اس کی اور عاشر کی تصویر تھی۔

''غزل! یہ کیا مذاق ہے؟''

''مذاق نہیں، یہ میرا خواب ہے اور شاید کسی اور کا بھی۔ دیکھو تم دونوں ساتھ کتنے خوب صورت لگ رہے ہو۔'' غزل نے لاکٹ اس کے گلے میں پہنا دیا۔ صبا نے اس کو بند کر دیا تو وہ ہڑبڑاتے ہوئے بولی۔

''افوہ، مجھے تو اسائنمنٹ سمٹ کروانی تھی، میں ابھی آئی۔'' کہہ کر وہ جا چکی تھی۔ صبا کے گلے میں وہ لاکٹ تھا، وہ وہیں بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کا ایک ہاتھ اسی دل پر رکھا تھا۔

''تم اسے صبا کا اور میرا مشترکہ سمجھو۔'' سماعتوں میں عاشر کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ بمشکل خود کو سنبھال پائی تھی۔ اس روز دوبارہ اس کا غزل سے سامنا نہیں ہوا۔ گھر آنے کے بعد بھی جو وہ کمبل تان کر لیٹی تو رات ہونے تک ایسے ہی لیٹی رہی تھی۔

دو روز سے وہ کالج نہیں گئی تھی۔ اس کا کچھ بھی کرنے اور سوچنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لاکٹ اس نے گلے سے اتار دیا تھا، تصویر اس نے دو چار بار دیکھی تھی مگر اس تصویر کو یوں اپنے ساتھ دیکھتے ہی نہ جانے کیسا عجیب سا احساس ہونے لگتا تھا۔

☆☆☆

باہر سے بہو اور بچوں کی کال آئی تھی، جس کے بعد جمیلہ کا موڈ کافی خوش گوار تھا۔ غزل ان کے لیے کافی بنا کر لائی تھی اور چند ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے عاشر کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''آپ بھی اب بہو لے آئیں تو گھر میں کچھ رونق ہو۔''

"مشورہ تو اچھا ہے، پھر دیکھو کوئی لڑکی! بلکہ عاشر سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔ کیا پتا اس کی ہی کوئی پسند ہو۔" وہ تو جیسے تیار بیٹھی تھیں۔

"ویسے ایک لڑکی مجھے پسند ہے اور میں چاہتی ہوں، وہی اس گھر میں آئے۔" نہ صرف اس نے اپنی پسند کا ذکر کیا تھا بلکہ اس پر اصرار بھی تھا۔

"کون؟" بجیلہ چونک کر سیدھی ہوئیں۔

"صبا!" ایک لمحے کے توقف کے بعد جب اس نے کہا تو بجیلہ کے لبوں پر مدھری مسکراہٹ بکھر گئی، وہ بھی فہمیدہ کی بیٹی کو بہو بنانا چاہتی تھیں۔ انہیں تو تینوں بچیاں ہی بہت پسند تھیں۔ اتنی پیاری، نیک اطوار اور سلجھی ہوئی لیکن صبا کا نام لے کر غزل نے ان کی مشکل آسان کر دی تھی، پھر بھی وہ چاہتی تھیں آخری فیصلہ عاشر کا ہو۔ اگر اسے بھی کوئی اعتراض نہ ہوا تو یہ ان کی بھی دلی آرزو تھی۔

مگر جب عاشر سے بات تو اس نے کہا۔

"صبا بھی اچھی ہے لیکن میں نے اس کے لیے کبھی ایسا سوچا نہیں۔" اور غزل کے چہرے کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔

"تو پھر کس کے لیے سوچا آپ نے؟" اسے اپنی ہی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔ کیا اس کی ساری محنت ضائع ہونے والی تھی۔

☆☆☆

فہمیدہ آج بہت خوش تھیں جوان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اللہ نے وہاں سے وسیلہ بنایا تھا تینوں لڑکیوں کی صبح سے شامت آئی ہوئی تھی۔ گھر کی خوب صفائی ستھرائی کے بعد اب کچن سے انواع و اقسام کے کھانوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔

"بتا کیوں نہیں رہیں کہ کون آ رہا ہے صبح سے کام کروا کروا کر جان ہلکان کر دی ہے۔" صبا سے صبر نہیں ہو رہا تھا جوان کے سر پر کھڑی استفسار کر رہی تھی۔

"بجیلہ آ رہی ہے اپنی فیملی کے ساتھ اور اس نے کہا ہے اس کے آنے کا کچھ خاص مقصد ہے اب دیکھو کس کے بخت جاگتے ہیں۔"

فہمیدہ بہت خوش تھیں اور کام ختم ہونے کے بعد اب انہیں تیار ہونے کا کہہ دیا تھا اور صبا وہیں اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ غزل سے اس کی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ پہلے وہ کالج نہیں آئی تھی اور اگلا پورا ہفتہ غزل کالج نہیں آئی تھی اور وہ تو اس کی کال بھی ریسیو نہیں کر رہی تھی اور اب یہ رشتہ۔

"اگر امی نے کہہ دیا کہ اس کی تو بات طے ہے۔ مجھے امی کو بتا دینا چاہیے کہ ابھی وہ انہیں کوئی جواب نہ دیں۔"

"تو کیا تم عباد سے بے وفائی کرو گی۔" دل نے سوال کیا تھا اور وہ نظریں چرا گئی تھی یہ سب اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ ابو تو کسی صورت نہیں مانیں گے۔

اسے عجیب سی ٹینشن ہو رہی تھی بھلا اتنی جلدی بھی کیا تھی۔

"صبا! مہمان آ چکے ہیں امی بلا رہی ہیں تمہیں۔" سیما یہ پیغام لے کر آئی تھی وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی وہاں کا ماحول کافی خوش گوار تھا۔ بجیلہ آنٹی، انکل جہانگیر اور عاشر۔ غزل ساتھ موجود نہیں تھی۔

"ہم اپنے بیٹے عاشر کے لیے سیما کا پروپوزل لے کر آئے ہیں۔"

آنٹی نے مدعا بیان کیا تھا صبا نے بے ساختہ عاشر کو دیکھا تھا جس کی نگاہیں سیما پر جمی تھیں۔ بڑے اصرار کے ساتھ انہوں نے سیما کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ سب کا منہ میٹھا کروایا جا رہا تھا۔ سیما اتنی خوش تھی کہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا محال تھا۔

جن چیزوں کی اس نے خواہش کی تھی وہ سب کیسے بنا کسی خواہش کے سیما کی جھولی میں آن گری تھیں اور آنٹی بجیلہ کے توسط سے ہی اگلے چند ہفتوں میں سحر کا بھی اچھی فیملی میں رشتہ ہو گیا تھا لڑکے کا اپنا کاروبار تھا۔ اماں تو شکرانے کے نفل ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔

☆☆☆

اس نے بے دلی سے ہر فنکشن میں شرکت کی

تھی سیما اور سحر دونوں کے سسرال والوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ کوالٹی کے ملبوسات اس قدر خوب صورت کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ دونوں کے دولہا بھی ہینڈسم تھے۔
خاص طور پر عاشر تو کوئی شہزادہ ہی لگ رہا تھا۔
غزل اتنے نارمل انداز میں ملی تھی پھر اس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے محض اتنا کہا۔ ”سچی مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔“
”منگنی تو نہیں بس بات ہوئی ہے وہ بھی بڑوں میں۔“ اس نے بھی لہجے کو سرسری بنالیا جیسے اسے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔
”مجھے بعد میں پتا چلا تو امی کا خیال تھا۔ سیما ہی سہی۔ وہ بھی تو اتنی پیاری ہے۔“ اس کا دل چاہا تھا وہ پوچھے کہ عاشر کا کیا خیال تھا لیکن اپنی کوئی بھی فیلنگ وہ غزل پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔
غزل کے تو سب ارادے ہی ملیا میٹ ہو گئے تھے تقریب میں کئی بار عباد سے سامنا ہوا تھا لیکن وہ تو اسے دیکھتے ہی راستہ بدل لیتا تھا۔
اس لاکٹ سے صبا نے اپنی تصویر نکال دی تھی اور وہاں سیما کی تصویر لگا کر اسے ہی گفٹ کر دیا تھا۔
وہ بے حد خوش ہوئی تھیں۔
”واؤ یار اتنا خوب صورت تحفہ۔“ اس نے جھٹ گلے میں پہن لیا تھا۔
صبا نے رشک بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر دیر تک آئینہ دیکھتی رہی وہ سیما سے زیادہ خوب صورت تھی۔
”بس کر دو بے چارہ ٹوٹ نہ جائے کہیں۔“ کوئی اس کے کانوں میں بولا تھا وہ اچھل کر دور ہٹی۔ عباد ہنسنے لگا۔
”تم کب آئے۔“ وہ جھینپ کر دور جا بیٹھی۔
”جب تم میرے خیالوں میں گم تھیں۔“ اس نے ہاتھوں سے بال سنوارے۔
”خیال اور وہ بھی تمہارے۔“ اس نے منہ بسورا۔
”ویسے ایک بات کہوں تم سے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا آج سیما اور سحر کا مکلاوا تھا اور سب مہمان ڈرائنگ روم میں اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔ جب عباد اس کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔
”تم بہت بدل گئی ہو، ہر فنکشن میں تمہیں ڈھونڈتا ہی رہا اور تم الگ تھلگ بیٹھی نظر آئیں۔ اتنی سنجیدہ بی بی کب سے ہو گئی ہو یا پھر سمجھ دار ہونے کی پریکٹس کر رہی تھی۔“
”کچھ بھی سمجھ لو۔“ اس نے جان چھڑائی۔
”ضرور کچھ ہوا ہے۔“ وہ اٹھ کر جا چکی تھی عباد دیر تک سوچتا رہا کہ اتنی اداس اتنی خاموش کیوں تھی۔

☆☆☆

سیما اور سحر کے جانے سے گھر ایک دم خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ فہمیدہ کا اس محلے میں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔
”میں تو سوچ رہی ہوں ثاقب چند روز کے لیے آ جائے تو اس کی دلہن لے آؤں۔ گھر میں رونق ہو جائے گی۔ کل کو تم بھی چلی جاؤ گی تو میں اکیلی کیا کیا دیکھوں گی۔“ فہمیدہ کے اپنے ہی آزار تھے۔
”میں کہیں نہیں جا رہی۔“ وہ جو بس خالی کاغذ پر لائنیں لگائے جا رہی تھی پنسل روک کر تختی سے کہا تو فہمیدہ چونک گئیں۔
”کیا بات ہے عباد سے کوئی جھگڑا ہوا ہے۔“
”دنیا عباد پر تو ختم نہیں ہوئی، سحر اور سیما کا تو اتنے امیر گھرانوں میں......“
”بس...... ایک لفظ بھی منہ سے مت نکالنا۔ ارے میرا عباد تو ہیرا ہے اور اس کے جیسا ایک بھی نہیں اور تم پاگل تو نہیں ہو گئیں اتنا مصنوعی کیسے سوچ لیتی ہو ظاہری چمک دمک مال و دولت کچھ نہیں ہوتا۔“
”ہوتا ہے ظاہری چمک دمک اور مال و دولت ہی سارا کچھ ہوتا ہے۔“ وہ کہہ کر اندر کمرے میں چلی گئی اور جانتی تھی اماں ضرور پیچھے آئیں گی۔ اس لیے دروازہ بھی بند کر لیا تھا اور اب اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے تھے۔ اسے دکھ تھا اس بات کا کہ عباد سی ایس ایس کے پرچوں میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور

جیسے اس کے تو سارے خواب ہی بکھر گئے تھے تو اب کیا ضروری تھا کہ اس کا ہمسفر عباد ہی ہوتا۔
لیکن فہمیدہ کو تو اس کے تیور ہولا گئے تھے۔
وہ گہری سوچ میں متفرق تھیں شکیلہ نے تو بچپن میں ہی اسے عباد کے لیے مانگ لیا تھا۔ اسی لیے تو وہ ہمیشہ سے ہی اس کے ناز نخرے اٹھاتی تھیں۔
لیکن ان کی بیٹی کس نہج پر سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

آج اس کی کالج سے چھٹی تھی۔ صبح دس بجے ہی ابا، سامان لے آئے تھے کچھ بیکری کی چیزیں تھیں باقی چکن، قیمہ اور سبزیاں تھیں۔
"ناشتہ کر کے کچن میں آجانا آج سیما آرہی ہے تو کھانے پر خاص اہتمام کرنا ہے۔" فہمیدہ نے چائے اور آلو کا پراٹھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے باور کروایا تو اس کا جیسے حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔
"آرہی ہیں بس مہارانی صاحبہ، تو میں کیا کروں مجھ سے نہیں یہ فضول کی خدمتیں ہوتیں۔" کرارا سا جواب حاضر تھا۔
فہمیدہ محض اسے دیکھ کر رہ گئیں جانے کیوں اتنی بدمزاج اور بدزبان ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ مغز ماری کرنے سے بہتر تھا وہ خود ہی کر لیتیں۔
سیما آئی تو اس نے سحر کو بھی فون کر کے بلوا لیا تھا اور اب سر جوڑے ثاقب کے لیے کوئی لڑکی دیکھنے کی پلاننگ کر رہی تھیں۔
تب ہی اچانک فون کی گھنٹی بجی، فون سیما نے اٹھایا تھا اور وہ تو سن کے وہیں بیٹھ گئی تھیں۔
"کیا ہوا کس کا فون تھا۔" سحر نے اس کی اڑی رنگت دیکھی تو اٹھا کر صوفے پر بٹھایا۔
"چچی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے ایمرجنسی میں ہیں۔" امی اور ابا تو سنتے ہی نکل گئے تھے وہ تینوں بہنیں پریشان بیٹھی تھیں۔
شام میں اسے عباد لینے آیا تھا۔
سرخ آنکھیں، ملگجا حلیہ وہ بے حد پریشان لگ رہا تھا۔
"فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے راستے میں تسلی دی لیکن صورت حال اس کی سوچ سے زیادہ گمبھیر تھی۔
چچی کی حالت خطرے میں تھی کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تھا تو انہوں نے اماں کا ہاتھ تھام کر منت کی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی خوشی دیکھنا چاہتی ہیں۔
اس کے ابا نے ہی سارا انتظام کیا تھا۔
امی نے اس کے سر پر دوپٹہ ڈال دیا۔
مولوی صاحب اس سے کچھ پوچھ رہے تھے ابا کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔
اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور اس طرح اس کے نام کے ساتھ عباد کا نام تو جڑ گیا تھا لیکن چچی جانبر نہ ہو سکیں۔
ان کی فیملی کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔

☆☆☆

ہر لڑکی کی طرح اس کے بھی خواب تھے اور اپنی شادی کو لے کر تو اتنا کچھ سوچتی تھی۔ اس ڈیزائنر کا ڈریس پہننا ہے رنگ اور شیڈ ایسے ہوں گے زیور ایسا ہو گا کبھی سوچتی ٹیکا اچھا لگے گا یا جھومر اور فلاں پارلر سے تیار ہو گی، یہ والی رسمیں ہوں گی ایسا فوٹو شوٹ ہو گا۔ لیکن اتنی سادگی سے رخصتی ہوئی تھی کہ اسے اپنی ناتمام حسرتوں پر محض رونا آرہا تھا۔ گھر میں کوئی استقبال کو بھی موجود نہیں تھا۔
وہ اماں سے خوب لڑ کر آئی تھی۔
"کیا میرا کوئی ارمان نہیں یا میں سوتیلی اولاد ہوں۔"
"ارے بیٹا! وقت کی نزاکت کو سمجھو اس کی ماں مری ہے۔ اب کیا شہنائیاں بجا کر لے جائے گا تمہیں۔" ماں کو اس کی بے حسی پر غصہ آرہا تھا۔
"تو کیا ضرورت ہے ابھی رخصتی کروانے کی، سال دو سال ٹھہر جاتیں۔" وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔
اور اماں نے سوچا وہ ٹھہر تو جاتیں جو انہیں اپنی اولاد پر اعتبار ہوتا جو وہ اس کی آنکھوں میں چھپی بغاوت پڑھ نہ لیتیں۔
"مہمان آنے والے ہیں، جا کر تیار ہو جاؤ۔"

انہوں نے ہاتھ جوڑ کر بات ختم کی تھی۔
''ایسا کوئی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔'' اس کی بڑبڑاہٹیں جاری تھیں فہمیدہ نے کان بند کر لیے تھے۔

☆☆☆

سادہ سی تقریب میں وہ رخصت ہو کر چچی کے گھر چلی آئی تھی جہاں عباد کے سوا کوئی استقبال کو موجود نہیں تھا جو قریبی مہمان تھے وہ رات سے قبل گھروں کو رخصت ہو چکے تھے۔
اور عباد! وہ رات بھر بس پاس بیٹھا اپنا ہی سوگ مناتا رہا تھا۔ ماں سے ابدی جدائی اس کے لیے کم دھچکا نہیں تھا۔
اگلی صبح سیما اور سحر ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ ولیمہ کا کوئی سین نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ عباد سے پوچھ رہی تھی۔
''ولیمہ نہیں ہوگا۔''
''میں تو ابھی رخصتی کے حق میں بھی نہیں تھا۔ جانتا ہوں تمہارے بھی کتنے ارمان تھے لیکن بس تائی اماں نے کہا کہ اکیلے کیسے رہو گے ورنہ سچ میں ابھی تو کوئی خوشی منانے کو دل ہی نہیں مانتا، امی کو کتنا ارمان تھا۔ میری شادی کا۔'' اس کی تو پھر سے آنکھیں بھر آئی تھیں۔'' صبا تو بات کر کے ہی پچھتائی۔
''اف اور کتنی دلجوئی کروں اس بندے کی۔'' محض دل میں سوچا۔
''ہاں لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ دو چار دعوتیں ہوئیں، وہ نمٹائیں اور زندگی معمول پر آ گئی۔ امی نے جو کپڑوں کا بکس بھیجا تھا ان میں محض دس جوڑے تھے جو وہ پہن چکی تھی۔
''عباد! تم مجھے شاپنگ پر کب لے کر جا رہے ہو۔'' رات میں کھانے کے دوران پوچھا (جو کہ ہوٹل سے منگوایا گیا تھا)۔ ابھی تک اس نے خود کچھ نہیں بنایا تھا۔
''نئی نویلی دلہنیں کچن میں کام نہیں کرتیں اب ناشتہ، کھانا سب تمہیں ہی مینج کرنا ہوگا۔'' اور وہ تب سے ہی اس کے ناز نخروں میں لگا ہوا تھا اور اب یہ شاپنگ کا شوشا۔
''شادی پر تمہارا تو کوئی خرچا ہوا نہیں، نہ کوئی زیور نہ بری۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اب میں آ گئی ہوں۔ سب اپنی پسند سے لے لوں گی اور پہلی دلہن ہوگی جو شادی کے بعد اپنی بری بنائے گی۔'' شامی کباب کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے وہ خود ہی ہنسی تھی۔
''اچھا کل چلتے ہیں جو ضرورت ہو، لے لینا۔'' اس نے فراخدلی سے کہا۔
''ضرورت کا نہیں، اپنی خواہش کا لوں گی۔'' اس کے بھی اپنے نخرے تھے اور عباد جانتا تھا کہ اس کے بجٹ کا اب کیا ہونے والا تھا اور پھر وہی بات ہوئی اس نے تو جیسے دل کھول کر شاپنگ کی تھی۔
اور اب ہر چیز کو بیڈ پر پھیلائے بے حد خوش ہو رہی تھی۔
''دیکھا میری چوائس، ہر سوٹ کتنا خوب صورت ہے۔ میچنگ جوتے اور ہینڈ بیگ اس پر جیولری۔'' سنگھار میز کے سامنے کھڑی ایک ایک چیز کو وہ خود سے لگا کر دیکھ رہی تھی پھر اسے خیال آیا اتنا سب کچھ لے تو آئی ہے اب پہن کر کہاں جائے گی۔
''ارے ہمارا ہنی مون۔'' عباد اس کے لیے برگر لینے گیا ہوا تھا جب وہ واپس آیا تو صحن کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر برگر کھاتے ہوئے اب وہ اس سے ہنی مون پر جانے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔

☆☆☆

عباد کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں، اسے کل سے دفتر جانا تھا۔ وہ اسے یاد دلا کر سویا تھا کہ صبح وقت پر اٹھ جائے مگر وہ ابھی تک سو رہی تھی۔
''صبا! اٹھ جاؤ۔ تم نے کپڑے بھی پریس نہیں کیے۔'' عباد نے آ کر اس کا بازو ہلایا۔
''اف...... صبح صبح ساری نیند خراب کر دی۔'' کمبل ہٹا کر اٹھ تو چکی تھی اور اب بالوں کو دوبارہ سمیٹ کر کیچر لگا رہی تھی۔
''صبا! جلدی کرو میں لیٹ ہو جاؤں گا۔'' عباد کو اس کی سست روی پر اب غصہ آنے لگا تھا۔

”تو پہلے مجھے جگا دیتے، اب کیا منہ بھی نہ دھوؤں۔“ کہہ کر وہ واش روم میں جو گھسی تو وہ محض دروازے کو گھور کر رہ گیا۔

سوٹ تو اس نے استری کر دیا تھا مگر ابھی ناشتے کا مرحلہ باقی تھا۔

”عباد میں ناشتہ کیسے بناؤں؟“ وہ کچن میں کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”اب یہ مت کہنا کہ مجھے ناشتہ بنانا نہیں آتا۔“

”ارے نہیں بھئی، نئی نویلی دلہن پہلے کچھ میٹھا بناتی ہے پھر کھانا پکایا جاتا ہے اور میں نے تو ابھی میٹھا بنایا ہی نہیں۔“

”یار! چائے بنا دو۔ وہ بھی تو میٹھی ہوتی ہے۔“

”لیکن کہیں بدشگونی نہ ہو جائے۔“ محض اسے ستا رہی تھی۔

”رہنے دو۔ پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھا تو وہ راستے میں حائل ہو گئی۔

”کیا پہلے روز خفا ہو کر جاؤ گے۔“

”نہیں میرے چاند، ستارے۔ میں بہت خوش ہوں۔ ایسی سگھڑ سلیقہ شعار بیوی کے ہوتے ہوئے بھلا مجھے کیا ضرورت ہے خفا ہونے کی۔“

”اچھا چائے تو پی لو۔ ساتھ بسکٹ ہیں۔ وہ بھی تو میٹھے ہوتے ہیں۔“ وہ اسے کھینچ کر واپس لائی اور اب دونوں ہنستے ہوئے چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھا رہے تھے۔

”ویسے تمہارا یہ میٹھا ہمیشہ یادگار رہے گا۔“

”اور میں بھی بڑے فخر سے بتاؤں گی کہ میٹھے میں چائے بسکٹ بنائے تھے۔“

دونوں پھر سے ہنسنے لگے تھے۔ وہ چلا گیا اب سارا دن اسے کیا کام تھا، تھوڑا بہت پھیلاوا سمیٹا۔ کھانا بنانے کے بعد خود بھی تیار ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچا تھا، شام میں امی کے گھر جائے گی لیکن اس سے پہلے ہی سیما آ گئی تھی۔

”ارے تم کیسے آئیں۔“ صبا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

”سوچا آج عباد تو آفس جائے گا اور تم اکیلی ہو گی تو چلی آئی۔“ وہ اسے لے کر بیڈ روم میں ہی آ گئی تھی۔

”غزل کی سناؤ کافی دنوں سے کال نہیں کی اس نے اور وہ تو میری شادی میں بھی بہانا بنا کر بیٹھ گئی تھی طبیعت خراب ہے۔“ صبا نے نقل اتارتے ہوئے کہا تو سیما کچھ خاموش ہو گئی۔

”ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ تو مجھ سے بھی نہیں ملتی۔ بس گھر سے کالج پھر اکیڈمی اور اس کے بعد اپنے کمرے میں بند، کھانے کی میز پر سامنا ہوتا ہے وہ بھی بہت کم، زیادہ تر تو وہ اپنے روم میں ہی کھانا منگوا لیتی ہے۔“

”اچھا اتنی پڑھاکو کب سے ہو گئی۔ میرے ساتھ تو سارے پیریڈ بنک کر دیتی تھیں، اب پتا نہیں میرا رزلٹ کیسا آئے گا۔“

”چھوڑو ٹینشن لینا، تم نے کون سا کوئی جاب کرنی ہے۔“ سیما نے لاپروائی سے کہا تو صبا نے غور سے سیما کو دیکھا۔

سیما کتنا بدل گئی تھی۔ نیا ہیر اسٹائل، جدید تراش کا باوقار سا لباس جس کی چمک دمک اس کی قیمت بتا رہی تھی۔

نئے ڈیزائن کا گولڈ کا سیٹ، ایک دھیمی سی مسکان نے اسے کتنا دلکش بنا دیا تھا۔

”تمہارا نیکلس بہت پیارا ہے۔“ اس نے بے ساختہ ہی تعریف کر دی تھی۔

”یہ عاشر کی پسند کا ہے، ابھی کل ہی اس نے دلوایا ہے۔ میرا برتھ ڈے تھا نا تو گفٹ سمجھ لو۔“ وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔

”میں پہن کر دیکھ لوں؟“ سیما نے ہنستے ہوئے اتار دیا تو صبا نے پہن کر اپنی دو تین سیلفی بنائیں پھر اتار کر واپس کر دیا۔ سیما مروت میں کہہ تو دیتی کہ تمہیں پسند ہے تو تم لے لو۔ لیکن اس کا کیا بھروسا اس نے تو ”سچی“ کہہ کر لے ہی لینا تھا۔

سوچپ چاپ لے کر واپس پہن لیا اور کچھ دیر میں وہ جانے کو تیار ہوگئی تھی۔

"ارے ابھی تو آئی ہو۔"

"جاتے ہوئے امی سے بھی ملنا ہے۔ دراصل میں اور عاشر فارن ٹرپ پر جارہے ہیں۔ یہاں کی ساری خاک چھان آئے۔ اب دیکھیں باہر کیا نظارے ہیں۔"

وہ تو ہنستے ہوئے چلی گئی تھی لیکن صبا جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی اور جانے کتنا وقت بیت گیا تھا اسے ایسے بیٹھے ہوئے۔

☆☆☆

شام میں عباد آیا اور کھانا کھا کر اس نے جی بھر کر اس کی تعریف کی تھی۔ ساتھ ممنون بھی تھا جو آج مہینے بعد گھر کا کھانا نصیب ہوا تھا۔

ورنہ وہ تو روز پوچھتا۔

"صبا! کب تمہارا دل بھرے گا باہر کے کھانوں سے۔" اور وہ مزے سے کہتی تھی۔ "اگر چچی ہوتیں تو وہ ایک مہینہ تو میرے ناز نخرے اٹھاتیں۔" اور وہ چچی تو نہیں تھا لیکن ناز نخرے اس نے خوب اٹھائے تھے۔

"چلو، کھانا تم نے بنادیا اب کافی میں بنا کر لاتا ہوں۔" اور پھر کچھ دیر باتوں کے بعد وہ تو سو گیا تھا لیکن صبا کو نیند نہیں آرہی تھی۔

وہ گاڑی، ساتھ ڈرائیور، سونے کا اتنا خوب صورت نیکلس اور فارن ٹرپ جیسے اس کی جان کا وبال بن چکے تھے۔

"اگر عاشر کی شادی مجھ سے ہوجاتی تو یہ سب کچھ میرا ہوتا اور مجھے دیکھو ملا کیا...... وہی پرانا چچی کا گھر، عباد سی ایس ایس میں پاس ہوجاتا تو ہمارے حالات بھی مختلف ہوتے۔"

سیل فون میں اسکرول کر کے وہ بار بار اس نیکلس کو دیکھ رہی تھی اور یہ مجھے ایک شاپنگ کروا کر سمجھ رہا تھا زمانے بھر کی خوشیاں مجھے دے دیں اور عاشر کو دیکھو۔ لاکھوں لٹا رہا ہے۔

"ایسا کیا تھا سیما میں جو مجھ میں نہیں تھا۔" وہ سیل فون کی اسکرین میں خود کو دیکھتی رہی سوچتی رہی۔

"عباد۔" پھر اس نے سوتے ہوئے عباد کو جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا۔" وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔

"ہم ہنی مون پر کب جارہے ہیں۔"

"اف...... صبا! سو جاؤ یار۔" کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا اور صبا اسے ایک پل بھی چین نہیں تھا۔

وہ فارن ٹرپ، وہ نیکلس، وہ گاڑی۔

☆☆☆

اگلے روز وہ اس سے باقاعدہ خفا ہوچکی تھی وہ باتیں کرتا رہا لیکن صبا نے کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ پھر وہ بھی لاتعلقی سے ناشتہ کر کے دفتر چلا گیا اس کے واپس آنے تک وہ امی کے گھر پہنچ چکی تھی۔

اس نے کھانا مائیکرو میں گرم کر کے کھایا اور پھر اسے لینے چلا گیا۔

گیٹ تائی امی نے کھولا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

"صبا! تم نے بتایا نہیں کہ عباد آئے گا، میں کچھ اہتمام کرلیتی۔" پلاؤ تو انہوں نے بنایا ہی تھا لیکن داماد کی یہ خاطر تواضع کرتیں اب انہیں صبا پر غصہ آرہا تھا۔

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں اور یہ داماد والا پروٹوکول مجھے نہ دیں۔ میں آپ کا وہی بیٹا ہوں۔ میرے لیے تکلف نہ کیا کریں۔"

صبا کے لیے وہ گول گپے لے کر آیا تھا۔ وہی شاپر انہیں تھمایا اور خود اس کے قریب جا بیٹھا۔

"یاد ہے تم کہتی تھیں، تمہارا غصہ گول گپے کھانے سے اتر جاتا ہے۔" اور صبا نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

"چلو جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ آج کی ساری شام ایک دل رُبا کے نام۔ خوب گھومیں گے، ڈنر کریں گے اور پھر موٹر بائیک کو کہیں دور کھڑا کر کے لمبی واک کریں گے۔"

وہ اس کا موڈ بحال کرنے کو سب کرنے کے لیے تیار تھا حالانکہ دفتر سے تھکا ہارا آیا تھا۔ اس وقت بس دل

چاہ رہا تھا چائے پیے اور مزے سے لیٹ جائے۔
"میرا وہی سوال ہے۔" وہ اپنی بات پر مصر تھی۔
"دفتر سے چھٹیاں نہیں مل رہیں۔ سمجھا کرو نا، نئی نئی نوکری ہے لیکن دیکھو جیسے ہی چھٹیاں ملیں۔ کوئی بھی موسم ہو ہم ضرور جائیں گے۔"
"سب جانتی ہوں۔" اس کا منہ پھولا ہی رہا۔
"پکا وعدہ۔" اس پر احسان عظیم کرتی وہ گھر واپس آئی تھی۔ لیکن بھلا ہو سیما کا جس نے اپنی اور عاشر کی پکس اسے سینڈ کی تھیں۔ اس کا سلجھا ہوا سا مزاج پھر سے بگڑنے لگا تھا۔ دوسرا دھما کا سحر نے کیا تھا۔ وہ اپنے میاں کے ساتھ مری کے کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھی ڈنر کر رہی تھی۔
عباد نے اسے اتنا غمگین دیکھا تو دفتر سے چند روز کی چھٹی لے کر مری لے گیا۔ کچھ سیونگ اس کے پاس تھی کچھ رقم ادھار لی اور ایک ہفتے بعد قلاش ہو کر گھر لوٹ آیا تھا۔

☆☆☆

ایک ہفتہ سکون سے گزرا تھا۔ اگلے ہفتے صبا نے پھر سے دس ہزار مانگ لیے تھے۔ عباد کو اس پر حیرت ہوئی۔ جانتی بھی تھی کہ ابھی ایک ہفتہ قبل وہ اپنی ساری سیونگ ختم کر چکا تھا۔ تنخواہ کی رقم سے گھر چلاتا یا اس کے شوق پورے کرتا۔
"کیا کرنا ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا۔
"اچھا تو اب مجھے حساب دینا پڑے گا۔"
"حساب نہیں مانگا، بس پوچھا ہے۔"
"پارلر کا چکر لگانا ہے اسکن دیکھو کتنی رف ہو رہی ہے۔ بالکل ماسیوں والا حلیہ ہو چکا ہے۔" سنگھار میز کے سامنے بیٹھی وہ بال سنوار رہی تھی اور عباد کا دماغ بس خرچوں میں الجھنے لگا تھا۔
ثاقب دو ہفتے کی چھٹی پر آ رہا تھا اور اماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ چاہ رہی تھیں اس کی شادی کروا دیں تاکہ ان کے گھر کی رونق بحال ہو اس کے لیے لڑکیاں دیکھی جا رہی تھیں۔ ایک لڑکی کا سحر نے بتایا تھا وہ سب آج لڑکی والوں کے گھر جا رہے تھے سیما بھی آ چکی تھی۔
جب صبا رکشے سے اتر کر کرایہ دے رہی تھی تب ہی وہ اپنی شاندار سی گاڑی سے نیچے اتری تھی۔ دونوں کی ملاقات گیٹ کے پاس ہوئی۔
"تم نے بتایا ہی نہیں ورنہ میں تمہیں بھی پک کر لیتی۔" سیما نے بڑے خلوص سے کہا تھا، وہ بے دلی سے مسکرائی۔ لڑکی والوں کے گھر جا کر بھی اس کا موڈ بحال نہیں ہوا تھا۔ وہ سب سیما کی ہی گاڑی میں واپس آئے تھے۔
حالانکہ وہ اپنا سب سے اچھا سوٹ پہن کر آئی تھی۔ پارلر میں دس ہزار پھونکے تھے لیکن جو چمک سیما کے چہرے پر تھی، اتنی ہی تاریکی اس کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی۔
بہرحال لڑکی سب کو ہی پسند آئی تھی اگلے ہفتے انہیں رسم کے لیے جانا تھا اور وہ عباد سے نئے سوٹ کے لیے کہہ رہی تھی۔
"تمہاری شادی والے سب سوٹ کیا پرانے ہو گئے یار۔ اس میں سے کوئی بھی پہن لینا۔" اس نے تو کہہ کر جان چھڑائی تھی لیکن جان چھڑانا اتنا آسان کہاں تھا۔
"وہ سب میں پہن چکی ہوں اور دوسری بات یہ کہ میرا ماہانہ جیب خرچ کتنا کار ہے ہو؟" مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے آج ہی سارا حساب کرنا چاہا تھا۔
"ابھی تمہارا خرچہ باقی ہے۔" وہ حیران ہوا۔
"بالکل، تم نے مجھے دیا ہی کیا ہے۔"
"تم میرے پاس کچھ چھوڑتی تو میں دیتا نا۔" دل میں سوچتے ہوئے اس نے ایک گہرا سانس بھرا۔
"دس ہزار لے لیا کرنا باقی گھر کا سارا خرچا میں کروں گا۔"
"گھر کے اخراجات مجھے نہیں پتا دس ہزار تو میرا پارلر کا خرچہ ہے باقی کے اخراجات میں کیسے پورے کروں گی۔" وہ تنک کر بولی تھی۔
"صبا میری جو حیثیت ہے اسی میں تمہیں گزارا

کرنا ہے۔ اب جیسے بھی کرو۔" اس نے کہہ کر کروٹ بدل لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نیند آنکھوں سے جیسے کوسوں دور تھی۔

کچھ روز گزرے تو اسے خوش خبری ملی۔ اس پہ بھی اس کا منہ پھول گیا تھا۔

"اتنی جلدی۔" وہ زچ ہو رہی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے میں تو بہت خوش ہوں۔" اور وہ سچ میں بہت خوش تھا شاید آنے والا بچہ ہی اس کا مزاج بدل دیتا۔

ثاقب کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی۔ اسے ایک بار پھر سے قرض لینا پڑا۔ باقی کے دن تیاریوں میں گزر گئے اور شادی کے بعد ثاقب نے واپس جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ گھر سے دوری برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

اب ادھر ہی کاروبار کرنے کا سوچ رہا تھا۔ وہ چند روز میکے میں گزار کر واپس گھر آچکی تھی۔

عباد ان دنوں اس کا بے حد خیال رکھ رہا تھا۔ اس نے ملازمہ بھی رکھوا دی تھی۔ اپنا مکان کرائے پر چڑھا کر انہوں نے بہتر علاقے میں کرائے کا گھر لے لیا تھا۔ چند روز بعد سامان شفٹ ہوا تو صبا کو نئے گھر میں کافی چیزیں پرانی لگ رہی تھیں۔ وہ بضد تھی کہ فل سائز فریج لینا ہے۔ جب عباد نہیں مانا تو اس نے پرانا فریج اپنی ملازمہ کو چند ہزار میں بیچ دیا تھا۔ ساس کا سامان وہیں محلے میں بیچ دیا۔ اب نئے گھر میں اس کے جہیز کا نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔

"صبا! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے اچھا بھلا فریج تھا دو لوگ ہیں گھر میں پھر کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں ستر ہزار خرچ کروں اور نیا فریج لے کر آؤں۔"

اسے پہلے ہی اس پر اتنا غصہ آرہا تھا اس کی تنخواہ میں چند ہزار کا اضافہ کیا ہوا تھا، صبا نے اسے بالکل ہی رئیس سمجھ لیا تھا۔

"اب تم اس حالت میں میرے ساتھ ایسے لہجے میں بات کرو گے۔" وہ بھی دوبدو زبان درازی پر اتر آئی تھی اور پھر جھگڑا اتنا بڑھا کہ پہلے اس کا بی پی ہائی ہوا پھر طبیعت خراب ہو گئی۔ آدھی رات کو اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا اور ڈاکٹر کی باتیں بھی اسے ہی سننا پڑیں۔ اگلے روز اس نے بینک میں لون کے لیے اپلائی کیا تھا۔ دو روز کے بعد گھر میں نیا فریج آگیا تو اب اسے ایل ای ڈی کے ہول اٹھنے لگے تھے۔

"میں بور ہو جاتی ہوں۔"

"اچھا بھلا کلر ٹی وی تھا کیوں بیچا تم نے۔"

"اب ٹی وی کا کون سا زمانہ ہے۔"

"ان بچوں کو بخیریت دنیا میں آجانے دو، کچھ سیونگ ہے میرے پاس جو میں نے اچھے برے وقت کے لیے بچا کر رکھی ہے۔" عباد نے باقاعدہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"اونہہ! اچھے برے وقت۔" وہ اتنا خفا تھی کھانا بھی نہیں بنا رہی تھی۔ وہ بے چارہ خود سارے کام کر رہا تھا اور اب اس نے بے بی شاپنگ کے لیے کچھ رقم تھمائی تھی جو اس نے ویسے ہی واپس کر دی تھی۔

"اتنے سے پیسوں میں تم خود ہی لے آؤ جا کر۔" اور عباد نے وہ رقم واپس جیب میں رکھی اور چلا آیا تھا وہاں اس نے غزل کی گاڑی کو گزرتے دیکھا جو دور سے ہی اسے دیکھ رہی تھی اور پھر بے ساختہ دیکھتی ہی چلی گئی تھی۔

"کیا تھا جو میں بھی اس امیر شہزادی سے شادی کرتا اور مزے میں زندگی گزارتا۔" چلتے ہوئے اس نے سوچا اور پھر بے ساختہ کانوں کو ہاتھ لگائے امیر شہزادی کی جگہ جنگلی بلی کا خیال آگیا تھا۔

☆☆☆

اس کے لائے شاپنگ بیگ کو اس نے کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا جانتی تھی کیسی چیزیں ہوں گی سیما کا بیٹا ہوا تھا وہ کچھ دیر کے لیے گئی تھی اور جو اس کے بچے کی چیزیں دیکھ کر آئی تھی ویسا سب تو کبھی بھی اس کے بچوں کا نہیں ہو سکتا تھا۔

انہی سوچوں کا نتیجہ تھا جو اس کا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا دو بچے تھے آپریشن کرنا پڑا لاکھ سے زیادہ خرچا ہوا تھا لیکن بچے اور ماں ٹھیک تھی اس کے لیے

اتنا ہی کافی تھا۔
اور پھر دو بچوں کی ذمہ داری میں چند روز کے لیے وہ سب فراموش کر چکی تھی۔ کچھ روز کے لیے فہمیدہ بیگم آ گئی تھیں پھر وہ چلی گئیں۔ ان کے سامنے تو سب نارمل ہی رہا تھا۔ لیکن اس کا احساس کمتری اسے کسی طور پر چین نہیں لینے دیتا تھا۔
"یہ شاپنگ کی تھی تم نے بچوں کی۔ دو بے بی کمبل، انہی کو دھلوا کر پھر لپیٹا ہے۔"
"تو جب ساتھ چلنے کو کہہ رہا تھا تو تم خود ہی نہیں جا رہی تھیں۔" وہ بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا۔
"ایک بچہ ہے سیما کا اور تم اس کی شاپنگ دیکھتے تو دنگ رہ جاتے۔ دس تو بے بی بلینکٹ لیے تھے اس نے، اور باقی چیزوں کا بس تم تصور ہی کر سکتے ہو۔"
"تمہاری خواہشوں کی کوئی حد ہے۔" وہ تنگ آ کر بولا۔
"اور تم نے کون سی خواہشیں پوری کر دیں؟"
وہ لڑنے کو تیار تھی اور عباد اس کنڈیشن میں کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کسی تنہا ویران گوشے میں بیٹھ کر تحمل سے سوچے کہ بات اب برگرشوارے تک نہیں رہی تھی۔
بات اس کی حیثیت سے بہت بڑھ چکی تھی وہ کیسے اس کی وہ خواہشات پوری کر سکتا تھا جس کے لیے لاکھوں بھی کم تھے۔
ابھی دو بچوں کی خوشی میں وہ اس سے آئی فون مانگ رہی تھی اور پھر اس نے ایک کولیگ سے ادھار لے کر ڈیڑھ لاکھ کا آئی فون لے کر دیا ہے بینک سے لون الگ لے چکا تھا۔
آخر کتنا قرض دار ہوگا وہ ...... قرض کی بھی تو ایک حد تھی اور اتنا قرض وہ کیسے اتارے گا۔ اپنا گھر کیسے چلائے گا۔ وہ بہت پیار کرتا تھا صبا سے ...... لیکن وہ مقابلہ بازی میں اتنا آگے جا چکی تھی کہ اپنی چادر اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ تو تن سے بھی اترتی جا رہی تھی۔
"تو میں کیا کروں۔" خود سے سوال کرتا بے بس ہو چکا تھا۔
جس روز گاڑی کے لیے جھگڑا ہوا اس روز اس نے بھی کہہ دیا تھا۔ وہ بچوں کو ساتھ لے کر میکے جا رہی تھی عباد اس کے لیے ٹیکسی لے کر آیا تھا۔
"یہی میری حیثیت اور اتنی ہی اوقات ہے میری۔
"تو جو ہے اسی میں گزارا کرنا پڑے گا اگر نہیں کر سکتیں تو واپس مت آنا۔"
"عباد تم ......"
"سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا جو بھی ہو۔" اس نے بھی دل کو کٹھور کر لیا تھا اور اسے دروازے پہ ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔
اور اس بے وقوف نے کیا فیصلہ کرنا تھا وہ تو دو بچوں کو لے کر جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی۔
بچے اس نے بیڈ پر لٹائے نہیں تھے بلکہ پٹخے تھے جس پر دونوں نے گلا پھاڑ کر رونا شروع کر دیا تھا۔
"صبا! یہ کیا بدتمیزی ہے۔" فہمیدہ بیگم کے تو جیسے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔
"طلاق دے دی ہے آپ کے داماد نے مجھے، فارغ کر دیا ہے، بس اب کچھ بھی ہو جائے واپس نہیں جاؤں گی۔" سرخ چہرے کے ساتھ وہ باآواز چلا رہی تھی۔
کمرے میں داخل ہوئے ابا تو وہیں دہلیز پر ہی ساکت رہ گئے تھے فہمیدہ نے بے ساختہ دل پر ہاتھ رکھا تھا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو۔"
"میرے لیے آپ کو وہ کنگلا ہی ملا تھا۔ کیا دیا ہے اس نے سال بھر میں مجھے، جو میرے اخراجات سے تنگ پڑ گیا۔ ایک بھی خواہش جو میرے دل کی پوری کی ہو۔ سب اپنے گھر میں خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ قربانی کا بکرا بنانے کے لیے میں ہی ملی تھی۔ رشتے تو بچا لیے نا آپ نے، چاہے میری زندگی برباد ہوتی ہے تو ہو۔" مریم اس کے لیے پانی لے کر آئی تھی اماں کو بھی حوصلہ دیا تھا۔ بعد میں ثاقب بھی چلا آیا تھا رات تک سحر اور سیما بھی پہنچ گئیں تو اچھی خاصی پنچائت اکٹھی ہو چکی تھی۔
ابا تو اس وقت سے کمرے میں بند تھے گھر میں

آج کسی نے کھانا بنایا تھا نہ کھایا تھا۔
"میں ابھی عباد سے بات کرتی ہوں۔" سیما نے اپنا فون نکالا۔
"خبردار جو تم نے اس سے بات کی، ایسی کوئی گری پڑی نہیں ہوں میں کہ تم اس کی منتیں کرو اگر کسی نے بھی اس سے بات کی یا ملنے کی کوشش کی تو اپنے بچوں کو بھی ماردوں گی اور خود بھی مرجاؤں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی تھی۔
اماں نے سب کو ہی منع کردیا تھا، رات سیما اور سحر وہیں رک گئی تھیں۔ مریم نے ہی سب کو کھانے پر آمادہ کیا تھا۔ رات تو جیسے تیسے کٹ گئی، دن بھی نکل آیا لیکن ایک بندہ رات ایسا سویا کہ پھر دن چڑھے تک بھی نہیں اٹھا۔ اگلے روز اس کے ابا کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔
اور رات تک جو سب کی آنکھوں میں اس کے لیے رحم تھا، ہمدردی تھی۔ اب اس کی جگہ ملامت اور نفرت نے لے لی تھی۔
اس کے باپ نے جانے کیسا صدمہ لیا تھا اصل میں بھتیجے پر مان اور بھروسا بھی تو بہت تھا۔
عباد جنازے میں شرکت کے لیے آیا تو ثاقب نے اسے ابا کا منہ نہیں دیکھنے دیا تھا۔
"تم ہو قاتل میرے ابا کے۔" رندھی ہوئی آواز میں اس نے محض اتنا ہی کہا تھا وہ آخری صف میں جنازہ پڑھ کر واپس چلا آیا تھا۔
صبا اس کے ساتھ اتنا بڑا فریب کیسے کرسکتی تھی۔
اس نے سیما کو کال کی تھی۔
"میرا یقین کرو میں نے صبا کو طلاق نہیں دی۔"
"اب تم جانو اور صبا۔ ہمارا باپ تو اسی صدمے سے مرگیا نا۔" اس نے فون ہی بند کردیا تھا۔
☆☆☆
مریم تو جیسے سب سے نظریں چرائے پھرتی تھی ابھی چند ہفتے ہوئے تھے اس کی شادی کو کہ نند کو طلاق ہوگئی تھی اور سسر کا انتقال ہوگیا تھا۔ جانے کیوں سب اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور اسے صبا چبھنے لگی تھی جس نے آتے ہی اس کی زندگی کے ست رنگی کینوس پر سیاہ رنگ بکھیر دیا تھا۔
ثاقب ان دنوں کس قدر چڑچڑا اور نڈھال سا لگتا تھا۔ عجیب مردنی سی پورے گھر پر چھائی ہوئی تھی۔
وہ سب تو پھر چند دن سے دل بہلا لیتیں مگر اسے سب کی دلجوئی کے ساتھ گھر کے کام، مہمانوں کی تواضع بھی کرنا پڑ رہی تھی اوپر سے ان کا ہنی مون بھی کینسل ہوگیا تھا۔ مریم کو تو صبا کی شکل دیکھتے ہی غصہ آنے لگتا تھا۔ اس نے تو اکلوتے بیٹے سے شادی اس لیے کی تھی کہ مزے سے سسرال میں راج کرتی مگر اب جو ماں بیٹی ایک طرف تھیں تو وہ خود کو کمزور تصور کرنے لگی تھی۔
"یہ کیا چائے کا رنگ اتنا کالا کردیتی ہو۔ ایسا بدمزا ناشتہ، امی آپ کیسے کھالیتی ہیں یہ جلے ہوئے پراٹھے۔" ابھی مریم نے ناشتہ لا کر رکھا ہی تھا کہ صبا کے اعتراضات شروع ہوچکے تھے۔ مریم نے پانی کا جگ میز پر رکھا اور تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔
"تو آپ کو جیسی چائے پسند ہے، آپ ویسی بنالیں۔" اور صبا۔ جو شاید یہ سننے کی متمنی تھی کہ میں اور بنا کرلے آتی ہوں ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگی اور جو بکی کا احساس ہوا وہ الگ۔
"صفائی میں کروالوں گی، برتن دھو کر کچن کی صفائی آج سے آپ کی ذمہ داری ہے۔ اب جبکہ آپ کو مستقل یہیں رہنا ہے تو یوں مہمانوں کی طرح تو نہیں رہ سکتیں نا۔" کہہ کر اس نے تائید طلب نظروں سے ساس کی سمت دیکھا تھا اب وہ کیا کہتیں لیکن جس طرح صبا نے انہیں دیکھا تو ان کے منہ سے نکل ہی گیا۔
"بیٹا! ابھی وہ صدمے میں ہے۔"
"ہاں تو کوئی کام وام کریں، دل بھی بہل جائے گا۔ ایسے فارغ رہنے سے تو اور بیمار ہوجائیں گی۔" اپنا چائے کا کپ اٹھایا، مشورہ دیا اور چلی گئی۔
"امی! ابھی سے کنٹرول کرلیں، کچھ زیادہ اوور اسمارٹ بن رہی ہے۔"
"اچھا جاؤ، بچوں کو دیکھو۔ اٹھ گئے ہیں شاید۔"
وہ کچھ سوچتے ہوئے گھونٹ گھونٹ چائے پی رہی تھیں۔ سارا دن عجیب بے چینی میں ہی گزرا تھا۔

رات میں سیما کی کال آئی تھی اس نے سنا تو صاف منع کر دیا تھا۔

''امی کوئی ضرورت نہیں۔ بابا کی لگائی بجھائی میں آکر اپنے گھر کا ماحول خراب کرنے کی، آپ بالکل اس گھریلو سیاست میں اس کا ساتھ نہیں دیں گی۔''

ان کا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ گھر کا ماحول خراب نہیں ہونا چاہیے لیکن صبا نے سوچ لیا تھا وہ اس کی بدتمیزیاں ثاقب کو ضرور بتائے گی اور پھر بچوں کی کئی ضرورت کی چیزیں ختم تھیں۔ مہینہ بھر سے وہ خود سے ہی خرچ کر رہی تھی لیکن اب اسے ثاقب کو باور کروانا تھا کہ یہ بچے اس کی ذمہ داری ہیں اور مریم تو پہلے سے ہی اس کی برین واشنگ کر چکی تھی۔

''ایک بار آپ نے کر دیا تو سمجھ لیں بس پھر عمر بھر یہ ذمہ داریاں آپ کو تمغے کی طرح مل جائیں گی اور پھر بچوں کا باپ زندہ ہے اٹھائے اپنی ذمہ داری۔ آپ کو خرچے کا دعوا کرنا چاہیے۔'' صبا کا ہاتھ دروازے پر تھا۔ وہ رک گئی کہ بھائی کچھ کہے گا لیکن...... اندر کی خاموشی نے اس کے اپنے اندر طوفان برپا کر دیا تھا۔

ایک دل چاہ رہا تھا اندر جائے پھر واپس اپنے کمرے میں چلی آئی دل و دماغ کسی طور پر سکون نہیں ہو رہے تھے وہاں عباد سے تو خوب لڑ جھگڑ لیتی تھی مگر یہاں سامنے اپنا بھائی تھا پھر بھی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔

''یہ شاپنگ کی ہے تم نے بچوں کی۔'' اس کے لائے سامان کو کس قدر حقارت سے دیکھا تھا پھر جھگڑا بھی کیا اور اب اس کے بچوں کے لیے یہ سب کون لے کر آئے گا۔ کاٹ میں سوئے بچوں کو دیکھا تو احساس زیاں بڑھنے لگا لیکن یہ تو ابھی شروعات تھی۔

پہلے مریم نے صبا کا ناشتہ بنانا چھوڑا تھا پھر مشین سے اس کے کپڑے الگ کر دیے تھے۔

''آپ کو میرے دھلے ہوئے پسند نہیں آتے تو خود دھو لیں۔''

ایک روز پہلے اس نے کہا تھا۔ ''بھنڈی گوشت بنالو۔'' اس کا بہت دل چاہ رہا تھا بھنڈی گوشت کھانے کو لیکن مریم نے جان بوجھ کر کریلے گوشت بنالیا اور اس سے کہا۔

''ثاقب کہہ کر گیا تھا کریلے گوشت بنانا۔''

ایسے ہی ہر ہر بات میں وہ اس کی مخالفت کرتی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا اس کی راجدھانی۔ یہاں حکم بھی اسی کا چلتا تھا اور خواہشیں بھی اسی کی پوری کی جاتی تھیں۔ اس کی ماں تو ابا کی وفات کے بعد کسی معزول ملکہ کی طرح بس ایک کونے میں پڑی رہتی تھیں۔ ایسے جیسے ابا کے بعد ان کا دل دنیا سے ہی اچاٹ ہو چکا تھا۔

اس نے سیما کو کال کی تو وہ بھی اسے ہی سمجھانے لگی تھی۔

''صبا! امی کا خیال رکھا کرو۔ تمہارے اور مریم کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں وہ۔ تم نے گھر کا ماحول کیا بنا رکھا ہے۔''

''میں نے کیا کیا ہے وہ خود ہی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔'' صبا نے وضاحت کرنا چاہی تھی لیکن سیما کی نصیحتوں پر جھنجلا کر فون ہی بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

کچھ عرصہ ایسا ہی چلتا رہا پھر مریم کی بیٹی ہوئی تو ایسا لگا جیسے گھر میں پہلا بچہ آیا ہو ثاقب جس طرح اپنی بیٹی کے ناز اٹھاتا تھا اس کے بچے تو محض دور سے ہی دیکھتے تھے ہر چیز ہر کھلونا عائزہ کا تھا۔

اس کے بچوں کی تو محض ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں کبھی کسی کی اترن تو کسی کی خیرات...... وہ خواہشیں کہاں تھیں جس کے لیے اس نے گھر چھوڑا تھا جولائی کا مہینہ تھا۔ اتنی گرمی گھٹن اور حبس تھی لیکن اے سی صرف مریم کے کمرے میں چلتا تھا۔ وہ بچوں کو دن میں کئی بار نہلاتی، بار بار کی لوڈشیڈنگ میں اسے رات رات بھر جاگ کر پنکھا جھلنا پڑتا تھا۔

ڈیڑھ سال کے عرصے میں عباد نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا وہ تو کبھی بچوں سے بھی ملنے نہیں آیا تھا۔

وہ خود کو آئینے میں دیکھتی تو حیران رہ جاتی تھی۔

''اتنی رف اسکن، بکھرے بال، لباس کا رنگ اچھا تھا کیوں کہ سیما کا تھا وہ اپنے پہنے ہوئے کپڑے

یہاں اس کے لیے چھوڑ جاتی تھی۔
سارا ن دن بچوں کی لڑائیاں بھگتانے میں گزر جاتا تھا۔ بچے کوئی کھلونا لیتے تو عائزہ چیخنے لگتی تھی اور مریم چھین کر واپس لے جاتی۔ کبھی کبھار تو ایک ہاتھ بھی جڑ دیتی۔ بچوں کو کمرے سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتی تو صبا کا دل کتنا دکھتا تھا۔
آج بھی ثاقب طوطے لے کر آیا تھا رافع اور واسع پنجرے کے گرد بھاگتے خوش ہو رہے تھے رات عائزہ اپنے کمرے میں لے گئی تو انہوں نے ضد شروع کر دی تھی۔
"مما...... طوطا......" ایک بار واسع کہتا دوسری بار رافع، صبا کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہوا تو خود بیٹھ کر رونے لگی تھی۔
"اچھا میں لا دیتی ہوں۔" فہمیدہ نے ثاقب کو آواز دی وہ طوطے چھوڑ گیا تو عائزہ چلانے لگی تھی۔ دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ مریم آ کر لے گئی تھی۔
"عائزہ بہت ضد کر رہی ہے۔" اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ ثاقب کہتا تو تھا۔ "عائزہ بھائی کو بھی دو۔" لیکن کبھی اس کے بچوں کے لیے الگ سے کچھ نہیں لاتا تھا۔
"مما...... طوطا......" رافع بمشکل سویا تھا لیکن واسع آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے بس طوطا...... طوطا کہہ رہا تھا کچھ نہیں بن پڑا تو اس نے ایک تھپڑ لگا دیا۔
"نانو! مما...... مالا۔" جا کر نانو کی گود میں بیٹھ گیا تھا پھر وہیں روتے روتے سو گیا اور اب سوتے میں بھی اس کے رخسار گیلے تھے۔ صبا کو اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بچوں کے سر سے باپ کا سایہ چھین کر کتنی بڑی غلطی کی تھی۔
باپ کے جیسی نگاہ سے کوئی نہیں دیکھتا چاہے بظاہر جتنا بھی پیار کر لے۔
وہ خود بھی رونے لگی تھی۔ اسے اپنے ابا بھی یاد آ رہے تھے۔ نہ وہ آ کر واویلا مچاتی نہ اس کا باپ اتنی ٹینشن لیتا اور عباد اس کے ساتھ بھی بہت زیادتی کی تھی۔
☆☆☆
یہ اس سے اگلے روز کی بات تھی۔ پتا نہیں رافع نے کہاں سے تنکا لیا تھا، اچانک وا کر میں بھاگتی ہوئی عائزہ آ گئی تو گول گول گھومتا تنکا اس کی آنکھ میں جا لگا۔ وہ ایسے تڑپ کر روئی تھی سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ مریم نے عائزہ کو اٹھاتے ہوئے رافع کو دو تھپڑ لگائے تھے۔
"ہر وقت اس کے ہی پیچھے پڑے رہتے ہو اور ماں اتنی غافل کہ بچوں کا ہوش ہی نہیں ہوتا۔"
بڑبڑاتے ہوئے اس نے ثاقب کو کال کی وہ بھی گھر آ گیا تھا۔ وہ مریم کے ساتھ عائزہ کو ہاسپٹل لے گیا تو ڈاکٹر نے آپریشن کا بتایا تھا اور آپریشن کی بات سن کر مریم کو جیسے اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔
"بس بہت ہو گیا۔ اب یا تو اس گھر میں رہوں گی یا صبا اور اس کے بچے۔ ابھی تو آنکھ پھوڑی ہے کل کو سر پھاڑیں گے۔ سارا دن کیسے میں اسے چھپا کر رکھتی ہوں۔ کبھی کوئی کھلونا اسے مار دیتے ہیں، کبھی واکر سے گرا دیتے ہیں۔ اتنی سی بچی کا آپریشن، آنکھ بھی ضائع ہو سکتی تھی۔ بس میں اب کوئی رسک نہیں لے سکتی، ساری تکلیف تو میری بچی کے حصے میں آئی ہے۔"
ثاقب خود بے حد پریشان تھا۔ اسے یاد تھا وہ دن جب مریم کے اکسانے پر خرچے کا دعویٰ کرنے وہ عباد کے پاس گیا تھا اور جو انکشافات اس نے کیے تھے، اس کا دل صبا سے بے حد بدگمان ہو گیا تھا۔ گھر کو توڑنے میں سارا قصور اسے صبا کا ہی لگ رہا تھا اور پھر گھر تو نا ہی کب تھا۔ عباد نے کہا تھا کہ اس نے طلاق نہیں دی اسے آنا ہے تو وہ آ سکتی ہے لیکن ایسے آنے کا کوئی فائدہ نہیں بہتر ہے اسے خود احساس ہو اور اب اتنے عرصے میں جب اسے خود احساس نہیں ہوا تھا تو وہ کیسے اسے گھر سے جانے کے لیے کہہ سکتا تھا۔
دوسری طرف اس کی بیوی اور بیٹی اس سے دور تھیں اسے کسی طور چین نہیں آ رہا تھا۔
☆☆☆
مریم کو گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا صبا ثاقب کا ہر کام کر رہی تھی ناشتہ، کھانا، کپڑے لیکن پھر بھی وہ اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ دن میں چپکے چپکے کئی بار روتی تھی۔
آج اتنے عرصے بعد غزل آئی تھی وہ تو اسے

دیکھ کر حیران ہی رہ گئی تھی کیونکہ شادی سے پہلے جو غزل کی جانب سے ایک سرد مہری سی قائم ہوئی تھی اس نے پھر صبا کو بھی پیچھے ہٹا دیا تھا۔

فہمیدہ اس وقت گھر میں نہیں تھیں دونوں بچے ابھی کچھ دیر قبل ہی سوئے تھے اور وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھی۔

"بیٹھو صبا! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

اس کا انداز ہی ایسا تھا صبا خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔

"تم نے عباد کو کال کر کے کیا کہا ہے۔" اب وہ اس سے پوچھ رہی تھی صبا خاموشی سے لب چبانے لگی لیکن غزل منتظر تھی۔

"میں نے اسے کہا ہے کہ اپنے بچے لے جاؤ۔ میں انہیں نہیں پال سکتی، وہ خود ہی پالے۔"

اس نے ڈیڑھ سال بعد عباد کو کال کی تھی، محض یہ کہنے کے لیے کہ اپنے بچے لے جاؤ اپنے بارے میں اس نے سوچا تھا، کسی ویمن ہاسٹل میں چلی جائے گی اور نوکری کر لے گی۔

"اگر یہی تمہارا فیصلہ ہے تو اب مجھے کوئی گلٹ نہیں ہوگا۔ جانتی ہو میں ہمیشہ سے ہی عباد کو پسند کرتی تھی۔ تمہیں عاشر کے لیے پسند کرنے میں بھی میری اپنی غرض تھی۔ میں عباد سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ آج کل ایک ہی دفتر میں جاب کرتے ہیں، اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں میں نے تین بار اسے کہا کہ میں اب بھی تمہارا ساتھ چاہتی ہوں لیکن اس نے خوب صورتی سے بات بدل دی لیکن کل اس نے مجھے خود کال کی ہے وہ کہہ رہا تھا اگر تم میرے ساتھ میرے دونوں بچوں کو بھی قبول کر لو تو مجھے تمہارا ساتھ قبول ہے۔ بس میں اپنے دل کی تسلی کرنا چاہ رہی تھی کہ تم اپنی مرضی سے بچے اس کی کسٹڈی میں دے رہی ہو نا۔"

ایک ٹرین تھی جو اس کے اوپر سے زن کر کے گزرتی جا رہی تھی۔

"مجھے خائن مت سمجھنا، میں تم دونوں کے درمیان کبھی نہیں تھی۔" وہ اپنی سنا کر چلی بھی گئی اور وہ ایسے تھی جیسے کوئی بے جان بت ہو۔

اس کے دماغ میں جیسے دھماکے سے ہو رہے تھے۔

غزل عباد کو پسند کرتی تھی اور عباد یہ بات جانتا تھا۔ اتنی خوب صورت، ویل ایجوکیٹڈ لڑکی اس کی دسترس میں تھی۔ وہ چاہتا تو ایک جھٹکے میں اس سے جڑا تعلق توڑ کر اپنا مستقبل محفوظ کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو اس لڑکی سے محبت کرتا تھا جو گول گپوں کی ایک پلیٹ پر مان جایا کرتی تھی۔

اور میں...... میں نے عاشر کے لیے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ عاشر جس نے میری سمت کبھی ایک نگاہ غلط بھی نہ ڈالی تھی جو میری بہن کو پسند کرتا تھا تو کس زعم میں اپنا بسا بسایا گھر خراب کیا ہے میں نے......

اس کی طلاق کا سن کر ایک رشتہ کروانے والی خالہ آئی تھیں۔ اس کے بھی دو چار رشتے، کوئی رنڈوا تھا تو کوئی چار، پانچ بچوں کا باپ تھا جن کی پہلی ڈیمانڈ یہ ہوتی تھی کہ وہ لڑکی کے بچوں کو قبول نہیں کریں گے۔

"صبا...... صبا! بچے رو رہے ہیں کب سے۔ تمہیں آواز نہیں آ رہی۔" اماں جانے کب آئی تھیں اور اب اس کا شانہ ہلاتے ہوئے آوازیں دے رہی تھیں۔ اس نے چونک کر اماں کو دیکھا۔

"اماں! ثاقب سے کہنا صبا چلی گئی ہے۔ وہ جا کر مریم اور عائزہ کو لے آئے۔" فہمیدہ کو حیران پریشان چھوڑ کر وہ اپنے اور بچوں کے کپڑے سمیٹنے لگی تھی۔

"صبا کیا کہہ رہی ہو...... کہاں جا رہی ہو۔" وہ بولائی ہوئی سی پیچھے آئیں۔

"اپنے گھر، جو میرے شوہر کا گھر ہے۔ جس گھر کی بلا شرکت غیرے میں ملکہ تھی، جو میری راجدھانی تھی۔ میں نے اپنی نام نہاد انا کی خاطر خود کو اور بچوں کو اتنا عرصہ اذیت میں رکھا اور عباد کو بھی۔ اس نے مجھے طلاق نہیں دی تھی۔ میں نے جھوٹ کہا تھا آپ سے۔ پھر حالات ایسے ہو گئے کہ میں چاہتے ہوئے بھی اپنی بات سے مکر نہیں سکی۔ اب کوئی سوال نہ کریں اور مجھے جانے دیں۔"

ایک شاپر تھا، دو بچے تھے۔ اس نے عجلت میں اٹھائے اور گھر سے نکل آئی۔ گلی کے نکڑ پر آ کر اس نے ٹیکسی

لی تھی پھر یاد آیا جانا کہاں تھا۔ کرائے کا گھر تو وہ چھوڑ چکا ہوگا تو اس نے پرانے گھر کا ہی ایڈریس بتا دیا تھا۔

اور اس کا یہ فیصلہ ٹھیک ہی تھا۔ گھر میں کچھ ضروری تبدیلیاں اور مرمت کروائی گئی تھی۔ تازہ، پینٹ ہوا تھا۔ باہر ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی کھڑی تھی تو یہ سب اس نے اپنی شادی کے لیے کروایا تھا سوچ کر ہی اس کا جیسے دم گھٹنے لگا تھا وہ اندر آئی دروازہ کھلا تھا ویسے بھی ان کے پرانے محلے میں دروازہ بند رکھنے کا رواج نہیں تھا۔

لاؤنج میں آ کر بچوں کو اتارا تو وہ بھاگنے دوڑنے لگے۔

عباد کچن میں کچھ پکا رہا تھا، آوازیں سن کر باہر جھانکا تو سامنے ہی وہ کھڑی تھیں۔ لمحے جیسے جامد ہوئے تھے۔

کچھ پل یونہی گزر گئے پھر عباد کا انداز استفہامیہ ہوگیا مگر وہ کھڑی ہی رہی، نظریں جھکائے۔ کچھ کہنے نہ کہنے کی کشمکش میں مبتلا۔

''آؤ بیٹھو۔'' عباد نے اس کی مشکل آسان کی اب وہ کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا ورنہ پہلے لمحے تو اسے وہم کا ہی گماں ہوا تھا۔

باری باری اس نے دونوں بچوں کو اٹھا کر پیار کیا تھا۔ بچے آگے سے منہ بسور رہے تھے۔ کچھ دیر میں ہی ان کی دلچسپی ختم ہوئی تو وہ رونے لگے۔ صبا نے جا کر کچن میں جھانکا، چکن کڑاہی دم پر رکھی تھی، رائتہ تیار تھا۔ وہ ساتھ سلاد کاٹنے لگی اور بچوں کا باجا تھا کہ بجے ہی جا رہا تھا۔

عباد انہیں لے کر باہر چلا گیا آدھے گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تو اب بچے خوش تھے ان کے ہاتھ میں کھلونوں اور اسنیکس کے شاپر تھے۔ صبا کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

ایسے لاڈ بھلا باپ کے سوا کون اٹھا سکتا تھا۔ اسے گھر چھوڑنے سے قبل بچوں کا خیال کیوں نہیں آیا تھا لیکن آج بچوں کو خوش دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے آج ہی اسے رشتوں کا اصل مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔

''روٹیاں لے آیا ہوں، کھانا لگا دو۔'' عباد نے کچن میں جھانکا۔ تو اسے آنسو بہاتے دیکھ کر اندر چلا آیا تھا۔

''ویسے میں نے سوچا تھا کہ تم سے بات نہیں کروں گا۔ خوب ستاؤں گا۔ لیکن تم نے تو پہلے ہی لمحے میں مجھے چت کر دیا ہے۔''

اس کے آنسو صاف کرتا مصنوعی بیچارگی سے کہہ رہا تھا وہ مزید روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی تھی۔

''مجھے معاف کر دو، میں بہت بری ہوں۔''

''بس بری کہنے سے کام نہیں چلے گا ظالم، بے وفا، سنگ دل اور بھی بہت کچھ ہو۔'' اب وہ خفا ہو رہا تھا۔

''بے وفائی تو تم کرنے جا رہے تھے۔ کیا تم غزل سے شادی کر رہے ہو؟'' اسے اچانک یاد آیا تھا اور اب وہ اسے بس گھورے جا رہی تھی۔

''اب وہ اتنا اصرار کر رہی تھی تو میں پھر کیا کرتا۔'' وہ ستانے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ صبا نے وہیں بیٹھ کر خوب زور شور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

''ارے یار! اس کے ڈیڈ نے وہیں انگلینڈ میں اس کے لیے کوئی نمونہ پسند کیا ہے۔ کہہ رہی تھی اب شادی کے بعد مستقل وہیں سیٹل ہو جائے گی تو میں نے کہا جاتے جاتے اپنے اس مسکین سے دوست کے ساتھ ایک نیکی کر جاؤ۔'' اس کے برابر الٹی کرسی رکھ کر بیٹھا، اب کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔

''تو یہ تمہارا پلان تھا۔''

''ہاں اور مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی اسی لیے تو آفس سے بھی ہاف ڈے لیا، گھر کی صفائی کی۔ کھانا بھی بنایا اور تو اور دروازہ بھی کھلا رکھا۔'' صبا کے لب مسکرانے لگے آنکھوں میں بھی ــ نمی تھی۔

''ہمیشہ ایسے ہی رہنا۔''

''صفائی کرنے والا اور کھانا بنانے والا۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا تو صبا کی ہنسی کا جلترنگ بکھر گیا۔

''نہیں محبت کرنے والا۔'' وہ آسودگی سے مسکرائی اور کھانا برتنوں میں نکالنے لگی اس نے جان لیا تھا زندگی کے سارے رنگ رشتوں کی خوب صورتی میں ہیں اور خلوص اطمینان سے بڑی دنیا کی کوئی دولت نہیں تھی۔

☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

بے لگام لہجے

"امی! آپ حیا باجی کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں؟"

نوید نے جھنجلا کر کہا۔ اسی وقت امبر چائے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی تو اسے دیکھ کر دونوں ماں بیٹا چپ ہو گئے۔ امبر کو یہ چپ بہت چبھی تھی۔ اس نے غصے سے چائے کی ٹرے میز پر تقریباً پٹخی اور تیزی سے مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

جہاں آرا نے طنزیہ انداز میں بیٹے کی طرف دیکھا۔

"تم اپنی بیوی کو کیوں نہیں سمجھاتے ہو؟ کب تک چھوٹی چھوٹی باتوں پر نند سے الجھتی رہے گی۔"

جہاں آراء نے ہمیشہ کی طرح بیٹی کی طرف داری کی۔ نوید کو بھی امبر کا روڈ انداز برا لگا مگر وہ جانتا تھا کہ امبر اپنی برداشت کی آخری حد پر کھڑی تھی۔

"امی! نو سال ہو گئے ہیں امبر کو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جمع کرتے، برداشت کرتے ہوئے۔ اس کے صبر کی ایک حد ہے۔"

نوید نے اپنے لہجے کو نرم کرتے ہوئے ماں کو سمجھانا چاہا۔

"رہنے دو بیٹا! سب سمجھتی ہوں۔ بیوی نے اچھی پٹیاں پڑھائی ہیں۔" جہاں آرا نے ناگواری سے کہا۔ نوید گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی حد اتنی ہی تھی۔ وہ ماں کی شان اور رتبے میں کمی نہیں کر سکتا تھا۔

"امی! میں صرف کہہ ہی سکتا ہوں۔ تحمل سے سوچیں۔ اگر آپ اس بات کو نہیں سمجھیں گی تو حیا باجی کو کون سمجھائے گا۔"

نوید نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے آخری کوشش کی تھی۔

"مجھے سمجھانے سے پہلے اپنی بیوی کو سمجھاؤ اور یہ چائے اٹھا کر لے جاؤ۔ مجھے نہیں چاہیے کسی کا احسان۔"

جہاں آرا نے غصے سے کہا۔ نوید نے گہری سانس لی اور تھکے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے بجائے سر جھکائے گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ جان چکا تھا کہ اب جہاں آرا اس بات کو لے کر کئی دن تک خفا رہیں گی۔ لاکھ ترلے منتیں کرنے پر ہی کھانا کھایا کریں گی۔ دوسری طرف امبر کا موڈ بھی آسانی سے ٹھیک نہیں ہوگا۔ امبر کو سمجھانا بھی دن بہ دن مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

"پتا نہیں گھریلو جھگڑوں کی چکی میں پستے مردوں کی بے بسی کسی کو نظر کیوں نہیں آتی ہے۔" نوید نے بے زاری سے سوچا تھا۔

☆☆☆

"آپ کی بہو صاحبہ کہاں ہیں؟" حیا اپنی اکلوتی بیٹی مہوش کے ساتھ صبح سے میکے آئی ہوئی تھی۔

"میکے گئی ہے۔" جہاں آرا نے منہ بنا کر کہا۔

حیا کا منہ بن گیا۔

"کیا اسے ہمارے آنے کا نہیں پتا تھا؟" حیا نے ناگواری سے کہا۔

"اسی لیے تو امبر مامی چلی گئیں۔" سولہ سال کی مہوش نے موبائل پر گیم کھیلتے ہوئے کہا تو حیا نے بیٹی کو گھورا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہے میری گڑیا! وہ یہ سن کر ہی چلی گئی کہ تم آج میکے آ رہی ہو۔'' جہاں آرا نے اکلوتی نواسی کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا

''امی! اتنی جرأت ہے اس میں آپ کے ہوتے ہوئے میرے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ بعد میں تو کوئی گھر میں گھسنے بھی نہیں دے گا۔''

حیا غصے سے بولنے لگی۔

''تو اس میں بھی تمہاری غلطی ہوگی۔''

فاروق احمد نماز پڑھ کر مسجد سے لوٹے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کالے رنگ کی چھوٹی تسبیح تھی' جس کے دانے مسلسل گر رہے تھے۔ باپ کو دیکھ کر حیا نے فوراً سلام کیا۔ فاروق احمد کی بارعب شخصیت کے سامنے گھر میں کوئی نہیں بولتا تھا۔

''ابو! آپ اپنی بہو کی طرف داری کر رہے ہیں؟'' حیا نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کے باپ کی طرف دیکھا۔ فاروق احمد نے نفی میں سر ہلایا اور پیار

سے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا۔
”تمہیں آنے والے وقت سے خبردار کر رہا ہوں۔“
فاروق احمد نے نرمی سے کہا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئے۔ جہاں دیوار پر بنی کھڑکی سے صحن کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ فاروق احمد اپنی راکنگ چیئر پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر نظر آتے پودوں پرندوں کو دیکھتے رہتے۔ یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔
”آپ کو چاہیے کہ بیٹی کو ٹوکنے کے بجائے، بیٹے کو بلا کر سمجھائیں۔ ورنہ حیا ٹھیک کہتی ہے کہ ہمارے بعد اس گھر کے دروازے اس پر بند ہو جائیں گے۔“
جہاں آرا نے جلدی سے بیٹی کی سائیڈ لیتے ہوئے کہا۔ فاروق احمد نے تسبیح پڑھتے ہوئے دونوں ماں بیٹی کی طرف دیکھا جو ایک دوسرے کا عکس تھیں، ایک دوسرے کے صحیح غلط کی حصے دار بھی۔
”حیرت ہے جہاں آرا بیگم! آپ آج تک یہ ہی نہیں جان سکیں کہ گھر کے دروازے کسی پر کبھی بھی باہر سے بند نہیں ہوتے ہیں۔“
فاروق احمد نے کہا۔
”کیا مطلب نانا جان؟“ مہوش آنکھوں میں اشتیاق لیے نانا کے پاس آئی تو فاروق احمد نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔
”ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا بچے! اگر آپ کو کبھی یہ محسوس ہو، یا ایسا لگے کہ کسی کے گھر کے دروازے آپ پر بند ہو گئے ہیں تو فوراً اپنے عمل، اپنے انداز گفتگو، اپنے طور طریقے کا جائزہ لیں کیونکہ کسی پر ہم کبھی گھر کے دروازے بند نہیں کرتے، اس سے پہلے ہم اس پر اپنے دل، اپنی برداشت کے سب دروازے بند کر دیتے ہیں۔“ فاروق احمد نے نرمی سے کہا۔ مہوش نے الجھ کر دیکھا۔
”وہ کیسے نانا جان؟“ مہوش نے بے تابی سے سوال کیا۔
”کائنات کا ایک اصول بتاتا ہوں۔ کائنات کی ہر چیز، ہمیں ہمارے سوال کا جواب دیتی ہے۔ بالکل سائنس کے اہم اصولوں کی طرح! جیسے فزکس، کیمسٹری، بائیو، میں ہر فارمولا ایک مخصوص حالت یا مفروضے پر کام کرتا ہے۔ اسی طرح زندگی گزارنے کے سب طریقہ کار، ایک نظام کے تحت چلتے ہیں۔ بالکل اسی طرح انسانی رشتوں ناتوں میں بھی ایک اصول، ایک راز قدرت نے رکھ دیا ہے۔
کبھی ایک چیز آزما کر دیکھی ہے؟“ فاروق احمد نے ایک لمحے کا توقف کیا۔
”وہ کیا نانا جان؟“ مہوش نے دلچسپی سے سوال کیا۔
”جب ہم بار بار اللہ کی دی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں تو ایک وقت آتا ہے کہ ہم سے وہ نعمت دور کر دی جاتی ہے۔ جب کائنات بنانے والے رب کو انسان کا ناشکرا پن پسند نہیں ہے تو پھر ہم عام سے انسانوں سے امیدیں کیوں باندھ لیتے ہیں؟“
فاروق احمد نے اپنی بیٹی حیا کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔
”ابو! آپ ساری بات سے واقف نہیں ہیں۔ میں بتاتی ہوں کہ ہوا کیا تھا۔“
حیا نے جلدی سے کہا۔ اب وہ تینوں حیا کی طرف دیکھ رہے تھے جو کچھ دن پہلے کا عام سا قصہ سنا رہی تھی جس کی وجہ سے گھر میں مسلسل پریشانی اور لڑائی بڑھتی جا رہی تھی۔
نوید اور امبر کے سات سالہ بیٹے حسن کی سالگرہ تھی۔ سالگرہ کا اہتمام گھریلو سطح پر کیا گیا تھا۔ جس میں بہت قریبی لوگ مدعو تھے۔ کیک کاٹنے کے بعد سب اپنی اپنی پسند کی جگہ پر بیٹھ کر گپ شپ لگانے لگے۔ امبر کے والدین کے علاوہ اس کی دونوں بھابیاں اور چھوٹی بہن تانیہ بھی وہاں موجود تھے۔ حیا نے ہنستی مسکراتی، خوش اخلاقی سے سب مہمانوں کو اٹینڈ کرتی امبر کو دیکھا تو حسد کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔
”امبر اس ویک اینڈ پر رہنے آ جاؤ۔ قسم سے

کافی وقت ہو گیا مل کر بیٹھے ہوئے۔ رات کو اچھی سی موُوی دیکھیں گے۔ میں گاجر کا حلوہ بنا لوں گی۔ کشمیری چائے ثانیہ بنائے گی۔ سچ میں بہت مزا آئے گا۔" امبر کی بڑی بھابھی فوزیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو امبر پر جوش ہو گئی۔

"ٹھیک ہے بھابھی! میں ضرور آؤں گی۔"

امبر نے خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ ہامی بھری۔ مگر پاس بیٹھی حیا سے اس کی خوشی مزید برداشت نہیں ہوئی۔

"بھئی شاباش ہے، گھر کے بزرگوں سے پوچھے بغیر ہامی بھری جا رہی ہے۔" حیا کے طنز پر سب چونک گئے۔

"حیا باجی! میں امی ابو سے پوچھ کر ہی کہیں جاتی ہوں۔" امبر نے اپنے لہجے کو نرم بناتے ہوئے کہا مگر دل میں وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کی ماں اور بھابیوں کے چہرے دیکھنے والے تھے۔

"بی بی پوچھنے اور بتانے میں بہت فرق ہے۔ ویسے تم خوش نصیب ہو جو میکے میں ایسی اچھی بھابیاں موجود ہیں۔ ورنہ عام طور پر تو نند کو دیکھ کر بھابیوں کے منہ بن جاتے ہیں۔" حیا نے طنزیہ انداز میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ امبر کا منہ سرخ ہو گیا۔

"امبر کوئی بات نہیں۔ اپنا موڈ ٹھیک کرو۔" دونوں بھابیوں کے ساتھ ساتھ امی اور چھوٹی بہن نے بھی اسے تسلی دی۔ امبر نے سر ہلایا اور کھانا لگانے کے لیے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد میٹھے کا دور چل رہا تھا۔ ہر کوئی امبر کے سلیقے طریقے، کھانے کی تعریف کر رہا تھا۔ امبر اس رات محفل کا روشن چاند تھی۔

"علی بھائی! آپ نے اسکن اسپیشلسٹ کے بارے میں بتانا تھا۔" سب مہمان رخصت ہونے کے لیے کھڑے ہو گئے جب امبر کو اچانک یاد آیا اور اس نے اپنے بہنوئی ڈاکٹر علی سے کہا۔

"سوری امبر آپی! میرے ذہن سے نکل گیا۔ ان شاء اللہ کل تک ثانیہ کو بتا دوں گا۔ وہ آپ کو انفارم کر دے گی۔"

علی نے ثانیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ علی ڈاکٹر تھا اور مقامی ہسپتال میں جاب کر رہا تھا۔ اس کی واقفیت اور ریفرنس کی وجہ سے سب کو بہت آسانی ہو جاتی تھی۔

"اسکن اسپیشلسٹ سے کیوں ملنا ہے؟ کیا میک اپ کے پردے میں چھپے اپنے چہرے کے گڑھے دکھانے ہیں؟"

حیا نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا اور امبر کے اڑے رنگ کو دیکھتی، پاس کھڑے نوید کو ہاتھ ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔ امبر کو اپنے بہنوئی کے سامنے ایسی بات کہنے پر شدید غصہ اور شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ ثانیہ جلدی سے آگے ہو کر اس سے گلے ملی اور تسلی دینے لگی۔ علی نے بھی ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے سنا ہی نہیں ہے۔ امبر کی ماں کے چہرے پر واضح پریشانی اور فکر مندی تھی۔ اس کی بھابیاں ان کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئیں۔ وہ غصے میں بھری کمرے میں آئی۔

نوید جانتا تھا کہ آج امبر کے غصے کو کنٹرول کرنا بہت مشکل تھا اور ایسا ہی ہوا۔ نوید کمرے میں آیا تو امبر اسے دیکھتے ہی بولنے لگی اور آخر میں آ کر بے بسی سے رو پڑی۔

"حیا باجی ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں۔ وہ مجھے کسی اور چیز میں شکست نہیں دے سکتیں تو میری کمزوری، میری شکل صورت پر اعتراض کرنے لگتی ہیں۔ نوید ہر انسان مکمل اور خوبصورت بننا چاہتا ہے۔ کوئی یہ نہیں چاہتا کہ اس کے چہرے پر کسی بھی طرح کے نشان، دانے، چھائیاں، وغیرہ ہوں یا وہ اسکن کی کسی بیماری کا شکار ہو جائے۔ ہم بیماری، تکلیف کے آگے بے بس ہیں۔ اس لیے رب سے شکوہ نہیں کرتے بلکہ پورے یقین سے اس بیماری کا علاج کروانے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ لوگ......!"

امبر نے تھکے ہارے انداز میں کہا۔ وہ پچھلے

کچھ عرصے سے شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ دو بچوں کی آگے پیچھے ہونے والی پیدائش اور خون کی کمی کی وجہ سے اس کی جلد بہت خراب ہو گئی تھی۔ رنگ میں پیلاہٹ اور دانوں کے داغ رہنے لگے تھے۔ چہرے پر پڑنے والے گڑھوں کا وہ مسلسل علاج کروا رہی تھی۔ بظاہر اس کی زندگی مکمل ہوتے ہوئے بھی صحت کے مسائل اس کے ساتھ تھے۔ لوگ یہ تو دیکھ لیتے کہ ایک محفل میں کوئی شخص کتنا ہنس رہا ہے، کتنا چمک رہا ہے مگر اس چاند کا اندھیرا حصہ جان بوجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔

''امبر حوصلہ کرو۔ دیکھو میں ہر قدم پہ تمہارے ساتھ ہوں۔ لوگوں کو تمہاری اسکن خراب لگتی ہوگی مگر مجھے نہیں لگتی اور میرے خیال سے تمہیں صرف اسی بات سے غرض ہونی چاہیے۔'' نوید نے نرمی سے اس کے آنسو صاف کر کے تسلی دی تھی۔ امبر نے سر اٹھا کر ہمدرد شوہر کی طرف دیکھا اور پھر گہری سانس لی۔

''آپ نے ٹھیک کہا مگر میں یہ حق رکھتی ہوں کہ جو فرد مجھے تکلیف دے، اس سے ایک فاصلہ اختیار کر لوں۔ اس لیے اگلی بار حیا باجی میکے آئیں گی تو میں اپنے میکے چلی جایا کروں گی تاکہ نہ سامنا ہو اور نہ انہیں مجھ پر اعتراض کرنے کا موقع ملے۔''

امبر نے دوٹوک انداز میں کہا تو نوید کچھ کہتے ہوئے چپ کر گیا۔ پچھلے کئی سالوں سے امبر اپنی ذات پر چھوٹے چھوٹے طنز، کڑوے جملے صبر اور تحمل سے برداشت کر رہی تھی مگر ایک وقت آتا ہے کہ ہم کسی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں، تب سامنے والے کا ردعمل بہت شدید اور دوٹوک ہو جاتا ہے۔

ایسا ہی امبر کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ حیا کے ہر طنز، ہر حرکت کو ہنس کے برداشت کرتی رہی مگر جب بات اس کی شخصیت پر آنے لگی تو اس کی برداشت ایک دم ختم ہو گئی تھی۔ اپنی خراب ہوتی صحت کی وجہ سے وہ پہلے ہی ذہنی اذیت کا شکار تھی، اوپر سے ہر موقع، ہر جگہ حیا اس کی خراب جلد کو نشانہ بنا کر کچھ نہ کچھ کہہ دیتی تھی۔

امبر کو آج بھی یاد تھا کہ ایک سال پہلے جب نوید کی خالہ امی کا انتقال ہوا تو قلوں والے دن امبر سفید چھوٹے شیشوں سے مزین دوپٹہ اوڑھے سپارہ پڑھ رہی تھی۔ اس کا ڈیسنٹ انداز اور خوب صورت سوٹ دیکھ کر حیا کو فوتگی والے گھر کا بھی خیال نہیں رہا۔

''امبر تم کوئی دوائی استعمال کر رہی ہو؟'' حیا نے اچانک سوال کیا تو امبر نے چونک کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ کچھ اور خواتین بھی ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''نہیں۔ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' امبر نے حیرت سے سوال کیا۔

''تمہارا رنگ بہت ڈل لگ رہا ہے اور تم نے آنکھوں میں سرمہ کیوں لگایا ہوا ہے؟'' حیا نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ امبر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ بغیر میک اپ کے سادہ چہرے پر بہت سی نگاہیں جم چکی تھیں۔

''میں نے سرمہ نہیں لگایا۔'' امبر نے گھبرا کر سفید دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔

''اچھا شاید حلقے بہت زیادہ پڑے ہوئے ہیں۔ میں سمجھی سرمہ چہرے پر پھیل گیا ہے۔'' حیا نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ امبر کا رنگ پیلا پڑ گیا اس نے جھکا کر اپنی نگاہیں ہاتھ میں پکڑے سپارے پر مرکوز کر دیں مگر آنسوؤں کی وجہ سے کچھ پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ سپارہ ایک طرف رکھ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

باتھ روم کے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے غور سے دیکھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے تو پڑے ہی تھے مگر پچھلے دنوں ایک دوائی کے استعمال کی وجہ سے اسے الرجی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے چہرے پر سرخ دانے نکلے جو بعد میں کالے رنگ کا نشان چھوڑ گئے۔

جس چیز کو وہ کاجل کا نشان کہہ رہی تھیں وہ اسی الرجی کے کالے نشان تھے......! امبر گھر آ کر نوید کے سامنے پھٹ پڑی تھی۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے ہمدردی کر رہی

ہوں؟'' نوید نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔
''نوید ہمدردی ہوتی تو وہ میری صحت کے حوالے سے فکرمندی کا اظہار کرتیں، سر محفل طنز نہ کرتیں۔''
امبر نے جھنجلا کر کہا تو نوید چپ کر گیا مگر امبر کب تک چپ رہتی۔ اب کی بار اس نے اسٹینڈ لے ہی لیا تھا۔
''اسلام میں قرآن، حدیث، ہر جگہ میٹھی زبان، اچھے بول، بولنے کا حکم ہے۔ حتیٰ کہ نوکر، ملازموں کے ساتھ بھی درگزر، نرمی کا رویہ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اور ہم اپنے قریبی رشتوں کو دن رات، سرعام بے عزت کر کے، سخت بول بول کر، یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں سینے سے لگائیں تو یہ ہماری سب سے بڑی بھول یا حماقت ہوتی ہے۔'' فاروق احمد نے ساری بات سننے کے بعد افسوس سے سر ہلایا تھا۔
''حیا نے سچ ہی بولا تھا۔ کون سا جھوٹ کہا۔''
جہاں آرا نے بیٹی کی طرف داری کی۔ فاروق احمد مسکرا دیے۔
''جہاں آرا بیگم! کسی سے سچی ہمدردی کا اظہار بھی کرنا ہو تو ایسے لفظ چنو کہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔ لفظوں کے چناؤ سے زیادہ، لہجے کا فرق بات کو پھول یا پتھر بنا دیتا ہے۔ میٹھا بولو گے، تو تلخ بات بھی آسانی سے ہضم ہو جاتی ہے۔ ورنہ بات کتنی بھی سچی ہو، لہجے پتھر ہوں تو بات پتھر بن کر احساس کے شیشے چکنا چور کر دیتی ہے......'' فاروق احمد نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔
''ویسے بھی یہ کون سا سچ ہے جو کسی کی برائی، کمزوری، پرکھڑا ہے؟ یہ سچ نہیں، اسے حسد کہتے ہیں۔''
فاروق احمد نے دونوں کو آئینہ دکھایا اور مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے وہاں سے اٹھ گئے۔ جہاں آرا بیگم اور حیا تو کچھ نہیں سمجھیں مگر مہوش کے ذہن پر نانا جان کی باتیں گہرا اثر چھوڑ گئی تھیں۔
امبر اور حیا کے تعلق میں سرد مہری آ چکی تھی۔ حیا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی اور امبر اب اسے مار جن دینے کو۔ مگر فاروق احمد کے پیار سے سمجھانے پر، امبر نے درگزر کرنا شروع کر دیا تھا اور بڑے ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اس کے میکے آنے پر کھانے وغیرہ کا اہتمام کر لیتی مگر وہ حیا سے فالتو بات نہیں کرتی تھی۔ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر خاموشی سے کمرے میں چلی جاتی تاکہ نہ وہ سامنے ہو اور نہ حیا کو پھر موقع ملے اس کا مذاق اڑانے کا۔
''اچھا امی آپ سب وقت پر آ جایئے گا۔ میرے سسرال پر اچھا تاثر پڑنا چاہیے میرے میکے کا۔''
حیا نے جلدی سے کہا۔ اس ویک اینڈ پر اس کے جیٹھ کے بڑے بیٹے کی منگنی کی تقریب منعقد تھی جس میں حیا کے گھر والے بھی مدعو تھے۔
''ہاں بے فکر رہو مجھے پتا ہے کہ بیٹی کے سسرال والوں سے کیسے ملنا، برتنا ہے۔''
جہاں آرا نے مسکرا کر کہا تو حیا نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔ مہوش کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ ایسی ہی کسی سوچ میں گم رہتی تھی۔

☆☆☆

''مہوش! کہاں کونوں میں چھپ کر بیٹھی ہوئی ہو۔ سب لڑکیوں کے ساتھ رہو۔''
حیا نے کوئی دسویں بار مہوش کے پاس جا کر اسے جھاڑا تھا۔ بڑے سے ہال میں مہمانوں کا رش تھا۔ حیا کا سسرال کافی بڑا تھا۔ ہر عمر کے لڑکے اور لڑکیاں بڑی تعداد میں موجود تھے۔ وہ سب گروپ بنائے اسٹیج کے پاس کھڑے مسلسل دولہا کو چھیڑ رہے تھے۔ ہنسی، قہقہوں کا طوفان تھا۔ چونکہ تقریب کافی شاندار اور بڑے پیمانے پر منعقد ہوئی تھی تو لڑکیوں کی ماؤں کو بہت اچھے اچھے گمان تھے کہ ان کی بیٹیوں کے لیے اچھے بر آسانی سے مل سکتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر چیز پر نظر رکھے ہوئے تھیں۔ مہوش اگرچہ فرسٹ ائیر کی طالب علم تھی مگر ہر روایتی ماں کی طرح حیا کی سوچ بھی اچھے رشتے پہ ہی اٹکی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ مہوش کی تیاری پر خاص توجہ دیتی تھی۔ مگر مہوش اس کی

ہدایت کے برعکس کونے کھدروں میں چھپنے کی کوشش کرتی۔ ابھی بھی وہ امبر اور اس کے دونوں بچوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھی جب حیا نے پاس آ کر اسے ڈانٹا اور ایک گہری نظر امبر پر ڈالی جس کی ڈریسنگ آج بھی سب سے منفرد اور ڈیسنٹ تھی۔ حیا دل میں اس کی پسند اور طریقے سلیقے کو سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

"حیا باجی! مہنگے برانڈز یا مہنگے ملبوسات کو صرف پہن لینا ہی کمال نہیں ہوتا۔ ہر ڈریس کو موقع کی مناسبت سے پہننا اور اس لباس کے مطابق خود کو تیار کرنا ہی اصل خوب صورتی ہوتی ہے۔ یعنی لباس کو کیری کرنا آنا چاہیے۔ اکثر لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں ہے کہ انہوں نے مہنگا یا کسی مشہور برانڈ کا سوٹ پہنا ہوا ہے۔ لباس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ ہوتا ہے۔"

ایک بار امبر نے حیا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یہ سچ تھا کہ امبر لباس کو اتنے طریقے اور سلیقے سے پہنتی تھی کہ عام سا لباس بھی کئی مہنگے سوٹوں کو مات دے جاتا تھا۔

"جاؤ مہوش۔" امبر نے نرمی سے کہا تو مہوش نے تذبذب کا شکار ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

حیا نے مہوش کا بازو پکڑ کر جھٹکے سے اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئی۔ امبر گہری سانس لے کر رہ گئی۔ جہاں آرا بیگم آگے والے صوفے پر حیا کی ساس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ امبر نے اپنے لیے ایک کونا پسند کر لیا تھا کیونکہ وہ یہاں زیادہ لوگوں سے واقف نہیں تھی۔

امبر کی گہری نگاہیں کچھ فاصلے پر اسٹیج کے پاس کنفیوز سی کھڑی مہوش پر تھیں۔ اس کی سب کزنز ہنس بول رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے مذاق کر رہی تھیں مگر مہوش کے چہرے کی گھبراہٹ کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ امبر کے دل میں تاسف پھیلنے لگا۔

"کتنی بے خبر ماں ہے۔" امبر نے مہمانوں سے خوش اخلاقی سے ملتی حیا کو دیکھ کر گہری سانس لی تھی۔ آج امبر کے دل سے حیا کے لیے موجود آدھے شکوے بھی ختم ہو گئے تھے۔

"جو اپنی اکلوتی بیٹی کے معاملے میں اتنی لاپروا اور کم نظر ہو سکتی ہیں میرا ان سے شکوہ کرنا یا الجھنا فضول ہی ہے۔" شادی کے اتنے سالوں کے بعد پہلی بار امبر کے دل کو اطمینان محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح سے حیا کی فطرت کو سمجھ چکی تھی۔

منگنی کی شاندار رسم کے بعد جب کھانے سے فارغ ہو کر لڑکیاں اور لڑکے دائرے میں خوشی سے جھومنے لگے تو حیا نے آنکھ کے اشارے سے مہوش کو بھی آگے ہونے کا کہا، مہوش نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا اور صرف تالیاں بجانے پر اکتفا کیا۔ اچانک اس وقت حیا کی بڑی نند نے آواز لگائی۔

"حیا! تم دونوں ماں بیٹی نے صرف کھانے اور وزن بڑھانے پر زور دیا ہوا ہے۔ مہوش کو دوسری لڑکیوں کی طرح ڈانس کرنا نہیں آتا ہے کیا؟"

انہوں نے اپنی طرف سے مذاق کیا مگر سب مہوش اور حیا کی طرف دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ مہوش کا رنگ سفید پڑ گیا اور حیا ساکت رہ گئی۔ اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹا تھا۔

"میری کرن تو ہر چیز میں تیز ہے۔ چاہے فٹنس کی بات ہو یا اپنی اسکن کی یا ڈریسنگ ہو۔ سب میں نمایاں ہے میری بچی۔"

بھابی جیٹھانی نے طنزیہ انداز میں حیا اور مہوش کی طرف دیکھا تھا۔ حیا نے پہلی بار آنکھیں کھول کر اپنی پیاری اور اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا۔

ان کے لیے اکلوتی اولاد انمول تھی مگر دنیا کی نظر میں وہ موٹی، بھدی، سانولے رنگ کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ اوپر سے حیا نے زبردستی اسے پیچ کلر کا کھلے گھیرے والا اسٹائلش فراک پہنا دیا تھا۔ اس کا پکا سانولا رنگ اور موٹاپا اس رنگ میں پوری طرح نمایاں ہو رہا تھا۔

مہوش کے نین نقش اچھے تھے مگر انہیں سنوارنے کا سلیقہ حیا میں نہیں تھا۔ اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ اس کی بڑی ہوتی بیٹی کو کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا؟ وہ کیوں سب میں گھلنے ملنے سے اجتناب کرنے

لگی تھی۔ اس کی جھجک اتنی کیوں بڑھ گئی تھی۔ اس لیے کہ وہ گھریلو محفل، میل ملاقات میں اپنی پھوپھوں، تائی اور کزنز کے چھوٹے چھوٹے مذاق کا نشانہ بنتی رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا اعتماد ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

"خیر ماشاء اللہ! ہماری مہوش قابلیت اور سلیقے میں کسی سے کم نہیں ہے۔ میٹرک میں اپنے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر مہوش کے تھے

ان شاء اللہ روشن مستقبل ہے بچی کا۔ میڈیکل میں جانے کا ارادہ ہے۔" اچانک امبر نرم لہجے میں کہتی ہوئی مہوش کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے بکھرتے اعتماد کو جیسے سہارا دیا۔

"ہاں واقعی فیشن تو ہر کوئی کر لیتا ہے۔ پڑھائی میں کم بچے اچھے نکلتے ہیں۔" ایک دوسری رشتے دار خاتون نے فوراً کہا تو کئی لوگوں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"جی بالکل! اور جہاں تک بات رہے ناچ گانے وغیرہ کی تو مہوش کے نانا جان بہت مذہبی ذہن کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان کے سب بچوں کی تربیت ان خطوط پر کی ہے کہ انہیں اپنی شرم و حیا کے ساتھ، اپنی حدود کا علم ہے۔"

امبر نے ایک طنزیہ نگاہ لڑکے اور لڑکیوں کے مشترکہ گروپ پر ڈالی جو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بے فکری سے ناچ رہے تھے۔ اپنے والدین اور بزرگوں کی موجودگی میں۔ کئی نگاہیں شرمندگی سے جھکیں اور کئی ناگواری سے مڑ گئیں۔ ہر انسان نے اپنے اپنے ظرف اور سوچ کے مطابق امبر کی بات کا اثر لیا تھا۔

امبر مہوش سے باتیں کرتے ہوئے اسے وہاں سے لے گئی۔ حیا نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ کچھ دور بیٹھی جہاں آرا بیگم کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں آرا نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے اپنی نم آنکھیں صاف کی تھیں۔ آج ان دونوں کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اگر انسان وقت پر، بار بار دیے توبہ کے موقع کو گنوا دے تو پھر قدرت کی طرف سے ملنے والا آخری جھٹکا اتنی زور کا ہوتا ہے یا تو آپ امر ہو جاتے ہیں یا مٹی......!

اس کا فیصلہ وہ ایک لمحہ ہی کرتا ہے......!

تقریب کا اختتام ہوا تو سب ہنستے مسکراتے واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہال کی طویل سیڑھیاں اترتے ہوئے حیا نے نیچے کھڑے نوید، امبر، ان کے دونوں بچوں کے ساتھ کھڑی مسکراتی مہوش، جہاں آرا بیگم اور فاروق احمد کو دیکھا تھا۔ وہ سب آپس میں ہنستے بولتے، حیا کے پاس آنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اس سے مل کر وہ اپنے گھر جائیں۔

حیا ایک ایک کر کے وقت کا زینہ اتر رہی تھی جو اسے پچھتاوے کے گہرے سمندر میں اتارنے والا تھا جبکہ دوسری طرف اس کی بیٹی کو ابھی ایک ایک کر کے عمر کا زینہ چڑھنا تھا۔ حیا کی آزمائش تو ابھی شروع ہوئی تھی۔ بہت لمبا سفر باقی تھا۔ حیا ان کے پاس آئی تو منتظر کھڑے فاروق احمد نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور جانے کی اجازت چاہی۔ سب سے مل کر حیا امبر کے پاس آئی اور بغیر کچھ کہے اس کے گلے لگ گئی۔ گاڑی کو موڑتے نوید کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ اس نے بریک مار کر اس منظر کو دوبارہ دیکھا۔ امبر نے پیار سے حیا کی کمر تھپتھپائی اور مسکراتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

وقت نے ہر چیز کا فیصلہ کر دیا تھا۔ سب کے ظرف اور سوچ کے مطابق۔ ان کی گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھ کر حیا سوچ رہی تھی کہ اس کے ابو فاروق احمد نے ٹھیک کہا تھا کہ قدرت کا سارا نظام، ہر چیز ایک اصول، ایک قاعدے کے تحت چل رہی ہے۔ ہر چیز، ہر شے اپنے اپنے وقت پر گردش کا حصہ بنتی ہے۔

"مما چلیں؟" مہوش نے ماں کے پاس آکر مخاطب کیا تو حیا نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں امید اور یقین کے کئی جگنو روشن تھے اور یہ سب امبر کے دیے اعتماد کا نتیجہ تھے۔ حیا مطمئن انداز میں مسکرا دی اور سر ہلاتی ہوئی اس سے باتیں کرتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔

گُل ارباب

سپنوں کی شہزادی

"ممّا! وہ فرینڈ آج پھر نظر آئی ہے۔ دیر تک میرے ساتھ کھیلتی رہی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے بال بگاڑے پھر میرے منہ بسورنے پر جھٹ سے ایک ہاتھ سے سنوارنے بھی لگی تھی۔" اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور چہرے پر خوشی کے جذبات صاف نظر آ رہے تھے۔

"دایان بیٹا! وہ صرف خواب ہے اور میں حیران ہوں کہ تم کیوں اس طرح ایک ہی خواب دیکھتے ہو؟" اس سوال پر وہ ہنسنے لگا۔

"ممّا! خواب تو کوئی اپنی مرضی سے نہیں دیکھتا نا۔" وہ چھوٹا سا تھا لیکن بہت ذہین اور سمجھ داری کی باتیں کرتا اکثر بڑوں کو بھی لاجواب کر دیتا تھا۔

وہ اسے سمجھانے لگیں۔

"ضروری نہیں کہ یہ سب خواب ہو، بعض اوقات انسان کا تخیل بھی یہ سب دکھاتا ہے، بندہ سمجھتا ہے خواب ہے لیکن وہ محض خیال ہوتا ہے۔" ماں کی مشکل باتیں بھی اس کی سمجھ میں آتی تھیں لیکن اس معاملے میں اسے کوئی نہیں سمجھا سکتا تھا۔

بار بار وہ خواب میں ایک بچی کو دیکھتا جو اس کی دوست ہے۔ اسے چھیڑتی ہے۔ اس کے ساتھ کھیلتی ہے۔ "ڈاکٹر صاحب ہفتے میں دو بار تو یہ اس لڑکی کو خواب میں ضرور دیکھتا ہے اور اسے فرینڈ فار ایور کہتا ہے۔ اس کی عمر کے کسی بچے کو اس طرح کے خواب نہیں آتے۔ یہ سب کیوں اور کیسے؟"

مُکمل ناول

بالآخر شگفتہ بیٹے کی طرف سے پریشان ہو کر اسے چائلڈ سائیکالوجسٹ کے پاس لے گئیں اور کچھ سیشنز کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ......

''مسز شگفتہ محمود! کچھ بچے ایوریج ذہانت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور کچھ ایکسٹرا جینئس ہوتے ہیں جو بچے اضافی ذہانت رکھتے ہیں وہ اپنی پسندیدہ تخیلاتی دنیا بنا کر اس میں رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آپ کا بچہ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے اور اس کی قابلیت نے اپنے ذہن میں ایک ایسی دوست کا کردار بنا لیا ہے جیسی اسے چاہیے تھی لیکن ویسی قریب کہیں ملی نہیں تو یہ خواب یا تصورات میں اپنی اس دوست کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہے اگر اس بچے کی کوئی چھوٹی بہن یا بھائی بھی ہوتا تو یہ اس طرح تصور یا خواب میں ایک پیکر نہ تراشتا۔''

وہ پریشانی سے سب سن رہی تھیں، شگفتہ محمود کی زندگی میں شوہر کی مصروفیات اور اس کے انتظار کے سوا ایک بچہ ہی تو تھا جس کے لیے وہ جی رہی تھیں اور یہ جان کر کہ وہ نفسیاتی طور پر الجھا ہوا ہے انہیں عجیب وحشت سی ہونے لگی تھی کیونکہ دایان کی پیدائش کے وقت کچھ ایسے مسائل پیدا ہو گئے تھے کہ وہ مزید بچے پیدا نہیں کر سکتی تھیں۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ سب خطرناک ہے کیا؟''

وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھیں

''نہیں مسز محمود! یہ بچپن کی ایک فینٹسی ہے اور بس جیسے بچے پریوں شہزادیوں اڑن قالینوں اور جادوئی چیزوں کے خواب و خیال میں رہتے ہیں ایسے ہی یہ بچہ اپنے لیے ایک الگ قسم کی فینٹسی بنا کر اس میں کچھ وقت گزارنے لگا ہے۔''

وہ کچھ مطمئن ہوئیں۔

☆☆☆

''مما! فرینڈ آئی تھی میں نے کہا، مما تم سے ملنا چاہتی ہیں تو بھاگ گئی۔ اسے آپ سے ڈر لگتا ہے، اسے لگتا ہے آپ اسے ڈانٹیں گی کہ میرے بیٹے کی پڑھائی خراب کرتی ہو، کیوں اس سے ملنے آتی ہو۔''

وہ محبت بھری نظروں سے دایان کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''تو پھر میں اپنے بیٹے کی فرینڈ کو کیسے دیکھوں گی۔ آپ کے باقی سارے فرینڈز تو مجھ سے مل چکے ہیں لیکن سب سے پکی والی فرینڈ سے نہیں مل سکی جس سے میں ضرور ملنا چاہتی ہوں۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، اس کی روشن آنکھوں میں فکر کی دھندسی پھیل چکی تھی۔

''ایسا کرتا ہوں کہ میں سب سے پہلے اسکیچ بنانا سیکھتا ہوں اور پھر میں آپ کو اس کا اسکیچ بنا کر دکھا دوں گا۔''

وہ جو کہتا تھا وہ کر کے بھی دکھاتا تھا۔

چند دن بعد ایک ایسا کلرڈ اسکیچ بنا کر لایا کہ وہ حیران رہ گئیں اور اس پیاری سی فرینڈ پر بے اختیار پیار بھی آگیا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری، سنہری بالوں کی دو چوٹیاں ماتھے پر کٹے ہوئے بال اور گہری نیلی آنکھیں سب سے بڑھ کر حسین اس کے گالوں کے ڈمپل تھے ایک طرف گہرا ڈمپل اور دوسرے گال پر اس سے ذرا سا کم۔ اس کی ٹھوڑی پر گہرا براؤن تل بھی نمایاں تھا۔

''واہ میرے بیٹے کی فرینڈ تو بہت پیاری ہے۔''

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا ماں کی یہ بات سن کر۔

''میں فرینڈ کو بتاؤں گا کہ میری ماما کو تم بہت اچھی لگی ہو۔ مما جب تک وہ آپ سے ملنے پر راضی نہیں ہوتی تب تک آپ اس کی تصویر ہی دیکھ لیا کریں۔''

وہ اسے دیکھ کر مسکرادیں۔

یہ سلسلہ بچپن سے لڑکپن تک چلتا رہا تھا رفتہ رفتہ اس کا خواب دیکھنا کم ہو گیا تھا یا وہ سمجھ دار ہو گیا تھا کہ ماں سے خواب کا ذکر نہیں کرتا تھا لیکن وہ اپنی اس فرینڈ کے مختلف اسکیچز ضرور بناتا رہا تھا جس میں اب اس کی پیشانی پر بکھرے بال سمٹ کر ہیر بینڈ کی قید میں ہوتے اور دو چوٹیاں کھلے بالوں میں بدل گئی تھیں لیکن شگفتہ نے دیکھا کہ اس کے گالوں کے وہ ڈمپل بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کہ پہلے اسکیچ میں تھے۔

وہ پہلی بار تو یہ سمجھی تھیں کہ دایان نے نیا نیا تصویر بنانا

سیکھا ہے، اس لیے ایک گال پر چھوٹا ڈمپل اور دوسرے گال پر اس سے بڑا بنایا ہے لیکن اب بھی وہ دیکھتی تھیں کہ جب اس نے بہت اچھی پینٹنگ بنانی بھی سیکھ لی تھی تب بھی وہ ڈمپل ویسے ہی بناتا تھا۔

☆☆☆

"گل لالہ عظیم خان! میں تمہارے ہر وقت کے اس رونے دھونے سے تنگ آگئی ہوں۔ زندگی میں کچھ چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ وہ مل جائیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے غیر ضروری چیزوں کے لیے رونے سے اللہ ضروری چیزیں بھی واپس لے کر ان سے محروم کر دے۔"

شاہ گل اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ جب بھی غصے میں ہوتی کہیں سے ظاہر نہ ہوتا۔ بھی آنکھیں لال نہ ہوئی تھیں نہ ہی ماتھے پر شکنیں پڑتیں، بس اس کا پورا نام لینا ہی اس کے غصے کی نشانی ہوتی۔

"شاہ گل بو! مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہے میں یہ سمجھتی ہوں کہ جس کی میرے دل میں خواہش ہے وہ میرے پاس ہونا چاہیے، مجھے حسن سے پیار ہے چاہے وہ کتنا مہنگا کتنا ظالم ہی کیوں نہ ہو۔" شاہ گل نے بھتیجی کی طرف افسوس بھری نظروں سے دیکھ کر سوچا۔

"تمہارے بابا نے بھی یہ ہی کیا تھا اور اب برسوں سے گلے میں بڑا پچھتاوے کا پھندا ڈھیلا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔"

"مجھے وہ ڈیزائنر سوٹ ہر صورت میں خریدنا ہے چاہے اس کے لیے مجھے بھوک ہڑتال ہی کیوں نہ کرنی پڑے یا پھر خودکشی کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھیں، صرف سوچا جا سکتا ہے۔"

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے بات سوٹ سے نہیں ہٹنے دے رہی تھی۔ شاہ گل اچھی طرح سے جانتی تھی کہ لالہ کی حیثیت اتنی ہے کہ وہ بیٹی کی ہر خوشی ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں لیکن...... اس لیکن سے آگے بہت کچھ تھا جو اس سے چھپا ہوا تھا۔

ضدی تو وہ ہمیشہ سے تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی خواہشات بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

"میرا بچہ! تھک جاؤ گی۔ اتنی بھاری خواہشات کا بوجھ انسان کو کبھی سکون سے جینے نہیں دیتا۔"

وہ تمام عمر دوسروں کی خاطر اپنی خواہشات سے دستبردار ہوتی آئی تھی۔ اسی لیے تو اپنے لیے جینے کے مزے کا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

"شاہ گل بو! کیا پایا آپ نے دوسروں کے لیے خود کو کھو کر۔ شادی نہیں کی کہ بھائی کی بیٹی اور گھر سنبھالیں گی، اب مجھے بھی یہ گھسا پٹا سبق پڑھاتی رہتی ہیں؟" وہ اپنی سنہری زلفوں کے ریشمی ڈھیر کو پونی میں قید کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

شاہ گل نے دل ہی دل میں اس کے کھلتے حسین چہرے کو نظر نہ لگنے کی دعا دیتے ہوئے پیار سے دیکھا۔

"صرف ان پیار بھری نظروں کی رشوت دینے سے کام نہیں چلنے والا، نہ ہی اتنے پر جان چھوٹے گی مجھے وہ جوڑا خرید کر دیں گی تب آپ کی محبت کا یقین کروں گی ورنہ مجھے لگے گا آپ صرف پھوپھو ہیں ماں نہیں۔" وہ ہمیشہ یونہی بلیک میل کرتی تھی۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں شام کو۔ لالہ آئیں تو پیسے لیتی ہوں، سو باتیں سننے کے بعد ہی تیرا باپ پیسے دے گا اسے عورتوں کا برانڈ کانشس ہونا بالکل پسند نہیں۔"

"لو یو سو مچ شاہ گل بو۔"

وہ اسے خوشی سے چھلانگیں مارتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کا بستر ٹھیک کرنے لگی۔

☆☆☆

گل لالہ عظیم خان۔ حسن کا شاہکار تھی سرخ سفید رنگت، گلابی گالوں پر کھلتی شوخیاں۔

دراز قامت کے ساتھ اس کی چال میں حسن کا ایسا غرور بھرا تھا کہ ہر ہر قدم وہ جیسے زمین کو اعزاز کے طور پر بخش رہی ہو۔

خاندان میں اس کے چاہنے والے بہت تھے لیکن وہ کسی کو در خور اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ بچپن سے اپنی

خوب صورتی کا احساس اس کے دل میں یقین بن کر بیٹھ چکا تھا اور جوان ہوتے ہی یہ یقین غرور میں بدل گیا تھا اکثر وہ اپنے حسن کے زعم میں نظریں فلک پر جمائے زمین والوں کو پاؤں تلے روند کر نکل جاتی تھی۔

اس نے کئی دل صرف اس لیے توڑ دیے تھے کہ ان دلوں کی مخالف سمت بنی جیبوں میں پیسوں کی کمی تھی اور وہ دولت کی سیڑھی پر چڑھ کر ہی محبت کے آسمان کو چھو سکتی تھی اور محبت اسے کسی اور سے نہیں فقط اپنے خوابوں، اپنی خواہشات، اپنی آرزوؤں، اپنے ارمانوں سے تھی۔

"شاہ گل بیبو! میں نے سوچ رکھا ہے کہ شادی ایسے بندے سے کروں گی جس کے پاس دولت کے ڈھیر ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر کہتی تو شاہ گل کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں مزید گہری ہو جاتیں۔

"دولت کی کوئی کمی تو نہیں ہے۔ تمہارے باپ کے پاس، کبھی کسی جائز چیز کے لیے ترسی نہیں ہو تم پھر بھی؟"

وہ نخوت بھرے انداز میں اپنے خوب صورت گھر کی طرف دیکھ کر بولی۔

"یہ خوب صورت اور بڑا گھر ہے لیکن میرے خوابوں سے بہت چھوٹا ہے۔ میرے خواب محلوں کے ہیں۔ ایسا گھر خوابوں کے اس سانچے میں فٹ نہیں آتا نا۔" وہ کیا کہتی، یہ سب کچھ تو پہلے بھی ہوتا دیکھ چکی تھی۔

"اور سن لیں آپ۔ میں اپنی شادی میں ویسا پھٹیچر جوڑا ہرگز نہیں پہنوں گی جیسا وگمہ اور شاندانہ وغیرہ نے پہنا تھا۔ اللہ معاف کرے، دبکے کے پھول یوں دور دور اور اک دوجے سے خفا خفا بنائے ہوئے تھے جیسے ہمارے ہاں سگے رشتے ایک دوسرے سے دور دور اور روٹھے رہتے ہیں

اور اف تو یہ بازار میں ہر دکان پر ڈمی نے جو سوٹ پہنا ہوتا ہے وہی آپ کے خاندان کی ہر دلہن نے پہن رکھا ہوتا ہے وہی سرخ دوپٹہ سنہری کرتی اور سرخ لہنگا بس زیادہ سے زیادہ کرتی کا رنگ بدلا ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نیا نہیں ہے۔ یہاں اور آپ کہتی ہیں کہ ارسل خان سے شادی کر لوں، بازار میں رکھی ڈمی بن جاؤں لال لہنگے پر سبز کرتی پہن کر کسی مزار کا جھنڈا لگنے لگوں ہے نا؟ یا پھر اس پتلی تماشے والے کی کرن گوٹے سے سجی پتلی بن کر جی جی کرتی کسی اندھوں میں کانی رانی قسم کی رشتے دار خاتون سے چپ چاپ مینا بازار کی سیل سے خریدا گیا گھٹیا قسم کا میک اپ کرا لوں؟"

شاہ گل نے دیکھا، وہ اپنے چمکیلے گلابی ناخنوں پر نیل پالش لگاتے ہوئے مسلسل ہل ہل کر بول رہی تھی۔ بول کیا رہی تھی۔ خاندان والوں کو خوب تول ہی رہی تھی۔

"یہ تم ہر وقت ہلتی کیوں رہتی ہو؟"

اس کی بے تکی باتیں وہ یونہی نظر انداز کر دیتی تھی۔

وہ شاہ گل کے سوال پر ہنسنے لگی۔

"آپ ہلنے کی بات کرتی ہیں، میں تو ہر وقت اڑنا چاہتی ہوں ہواؤں میں، فضاؤں میں۔ اور آپ کے سارے ٹبر سارے نامور قبیلے میں کوئی ایک ایسا سورما نہیں جو میری پرواز کے شوق کو اپنے کندھوں پر خوشی خوشی اٹھا سکے۔"

شاہ گل نے اس کے گلابی ہونٹوں پر کھلتی مسکان دیکھ کر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"جو پرواز کا شوق رکھتے ہیں انہیں کسی کے کندھوں کی نہیں اپنے پروں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں مرغی یا چوچے کے پروں کی بات نہیں کر رہی میں باز بن کر کسی کے کندھوں پر بیٹھنا چاہتی ہوں۔ جب جی چاہا اڑنے لگی جب تھک گئی تو کندھا حاضر۔" وہ لاجواب کرنے کے فن سے واقف تھی بلکہ ایک یہ ہی فن تو اسے آتا تھا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم خود کچھ بن کے دکھاؤ۔ پڑھائی میں تمہارا دل لگتا نہیں۔ کتابوں سے تمہیں چڑ ہے، امتحان پاس کرنا تمہارے لیے بقول تمہارے آگ کا دریا پار کرنے جیسا ہے یا پھر کانٹوں پر ننگے پاؤں سفر کرنے جیسا مشکل ہے۔

سستی اور نالائقی کے بوجھ کے ساتھ انسان کامیابی کا کوئی پل پار کر کے ناکامی کے جہنم کا ایندھن بننے سے نہیں بچ سکتا۔" وہ نصیحت کو چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی۔

"ایک چیز ہے جو ان سب کامیابیوں کی ضمانت ہے اور وہ ہے اچھی قسمت دیکھ لیں گی آپ بھی اور آپ کے لالہ بھی کہ یہ اچھی قسمت۔ مجھے کہاں سے کہاں لے جائے گی۔"

اس کا یقین شاہ گل کو ڈرا دیتا تھا کیونکہ یقین کے نازک شیشے کو جب مایوسی کا پتھر توڑ دیتا ہے تو یہ کرچیاں دل کو لہولہان کرتی ہیں وہ ان ہی کرچیوں سے زخم کھائے ہوئے تھی۔ زخموں پر وقت نے مرہم لگا دیا تھا لیکن کسک تو ابھی باقی تھی اس لیے وہ ہمیشہ دعا کرتی کہ اس لڑکی کا یقین کبھی نہ ٹوٹے۔

"کتنی عجیب سی فقط دنیاوی خواہشات ہیں تمہاری؟ قیمتی ڈیزائنر سوٹ، ڈھیر سارے زیورات، سوئٹزرلینڈ میں ہنی مون، بہت بڑا فنکشن، گھر کی جگہ محل شوہر کی جگہ دولت اور حیثیت میں شہزادہ ہو۔"

وہ لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"تو اور کیا کہوں؟ یہ ہی تو چارم ہے شادی کا یہ ہی حسن ہے زندگی کا۔"

"شوہر میں اور کون سی خصوصیات ہوں، مزاج کا کیا ہو شکل وصورت، قد وقامت وغیرہ کچھ تو سوچا ہوگا نا؟"

شاہ گل کی بات سن کر وہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور دونوں بازو پھوپھی کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے بولی۔ "امیر آدمی خوب صورت ضرور ہوتا ہے آپ نے کہیں دیکھا ہے کسی امیر بندے کو بدصورت۔ نہیں نا؟ اس لیے تو مجھے شکل صورت، قد وقامت کی کوئی فکر ہی نہیں اس کا حل ہے میری عقل کی زنبیل میں۔"

شاہ گل نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ہاں تو اور کیا؟ اگر کالا ہوا تو گورے پن کے ٹیکے لگوا لے گا۔ موٹا ہوا تو مہنگا جم مشہور نیوٹریشن ایکسرسائز مشینیں اور طرح طرح کے ڈائٹس پلان تو موجود ہیں وہ میری محبت میں بھوکا بھی رہ لے گا۔ اور اگر ٹھگنا ہوا تو ایسی ہیلو والے برانڈڈ شوز دستیاب ہیں کہ چند انچز کا پتا بھی نہیں چلتا اور بڑھ جاتے ہیں اور میں ہیل اتار کر اور وہ ہیل پہن کر آپس میں افہام وتفہیم سے معاملات طے کر ہی لیں گے۔"

شاہ گل نے سر پکڑ لیا تھا لیکن اپنا نہیں اس کا کیونکہ وہ مسلسل اڑتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

"عظیم خان لالہ! گل لالئی نے ارسل خان کے رشتے کے لیے انکار کر دیا ہے۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی تو عظیم خان حیران ہوئے۔

"لیکن کوئی وجہ بھی تو ہو اس طرح ہر رشتے سے انکار کی، یہ لڑکی آخر چاہتی کیا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ اب تمہارے لیے مشکلیں کم ہوں اور اس انسان کا جوگ بھی ختم ہو جس نے ساری زندگی اس لڑکی کے لیے تیاگ رکھی ہے جسے اس کے علاوہ کوئی نہیں سمجھا سکتا؟"

عظیم خان نے الجھے ہوئے انداز میں بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ سی نظریں جھکائے اپنے ناخنوں کو دیکھتی رہی۔

"اصل میں اس کے کچھ خواب ہیں لالہ! وہ بہت اونچی اڑان کے سپنے ہی نہیں دیکھتی ہے بلکہ اپنے پروں کو پھیلا کر اڑنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ بس اسے آسمان مل جائے تو پر اس کے پہلے سے موجود ہیں اور بقول اس کے ایسا کوئی نہیں اس خاندان میں۔ جو اسے شادی میں اس کے خوابوں کی تعبیر کا تحفہ دے سکے۔"

وہ سر جھکائے بول رہی تھی کیونکہ بار بار رشتے سے انکار بھائی تک پہنچا پہنچا کر شرمندہ سی تھی اور عظیم خان اسے دیکھ کر سوچ رہے تھے۔

"خواب تو تم بھی بہت دیکھتی تھیں شاہ گل۔ تعبیروں کے لیے تم بھی تو بہت پرامید ہوا کرتی تھیں لیکن کیا ہوا۔ بی بی جان کہا کرتی تھیں۔" شاہ گل کے گالوں کے ڈمپل ہر وقت نمایاں رہتے ہیں میری تو نہیں مانتی تم ہی اسے سمجھاؤ۔ ہر وقت مت ہنسا کرے کہیں میری نظر ہی اسے نہ لگ جائے۔" اور

اب دیکھو ایک مدت سے کسی نے میری گڑیا سی بہن کے گالوں کے وہ ڈمپل دیکھے ہی نہیں۔ نہ وہ مسکراتی ہے نہ ہی ہنستی ہے ایک عورت اس کا سب کچھ چھین کر لے گئی نہ وہ مسکان رہی نہ وہ ارمان رہے؟“

شاہ گل نے بھائی کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے احترام میں جھکی آنکھیں اٹھا کر انہیں بغور دیکھا۔

”میری قسمت کا غم نہ کیا کریں لالہ! ان شاء اللہ تعالیٰ گل لالئی کے نصیب بہت اچھے ہوں گے۔“

وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو کر بھی بھائی کو امید دلا رہی تھی۔ عظیم خان بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔

”شاہ گل! اسے سمجھاؤ کہ خواب تتلیوں جیسے ہوتے ہیں ان کے تعاقب میں بچے اکثر کھو جاتے ہیں اور کھو جانے والوں کے لیے واپسی کے رستے میں منزل نہیں تھکن باقی رہ جاتی ہے۔“

”میں اسے نہیں سمجھا سکتی، وہ اپنی ماں کی طرح زور آور ہے۔ بپھرے سمندر کی طرح چھوٹی بڑی ہر چیز بہا کر لے جانے والی۔“

شاہ گل کی آواز میں درد تھا۔

”ٹھیک ہے پھر خاندان سے باہر کا کوئی لڑکا ہی دیکھنا پڑے گا۔ خاندان کے سب ہی لڑکوں کے لیے تو وہ انکار کر چکی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس کی شادی کر دوں۔ تمھاری ساری عمر یونہی اس کے لیے خوشیاں اور آسانیاں ڈھونڈنے میں گزر گئی ہے اب میں مزید خود غرض نہیں بن سکتا۔“

وہ فیصلہ کن انداز میں بولے تو شاہ گل نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لالہ! میری فکر نہ کریں، میں ٹھیک ہوں۔ اور اس کے لیے ماشاء اللہ اب تک تو سب ہی رشتے اچھے کھاتے پیتے لوگوں کے آئے ہیں لیکن گل لالئی اس سے بہت زیادہ امیر بندہ چاہ رہی ہے۔“

وہ انہیں سمجھا رہی تھی کہ وہ بی بی جان والی غلطی نہ دہرائیں کیونکہ ایک غلط فیصلہ کئی زندگیوں کی بربادی کا سبب بن جاتا ہے یہ ان بہن بھائی سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔

”پرورش اور اچھی تربیت کے ساتھ وہ برخہ گل کی بیٹی بھی تو ہے نا، خدا نہ کرے کہ وہ ماں جیسی ہو لیکن وقت بتا رہا ہے کہ وہ تمہارے جیسی بھی نہیں ہے۔ اور سچ کہوں میری گڑیا۔ تو تمہارے جیسا بننا ناممکن ہے۔

اسی لیے میں اس سے یہ امید — کبھی بھی نہیں رکھتا تھا۔“

گل لالہ نے سر جھکا لیا، وہ بھائی سے کہنا چاہتی تھی کہ ”لالہ بیٹی میں ماں صاف نظر آتی ہے لیکن میں اس کے چہرے پر پردہ ڈال دیتی ہوں تاکہ آپ کا دکھ تازہ نہ ہو جائے یہ جانتے ہوئے بھی کہ نہ درد تھمتا ہے نہ ہی شفا ملتی ہے مسیحائی وقت کے ذمے تھی لیکن وقت خود رکا ہوا ہے چلتا تو مسیحائی بھی کرتا۔“ اس نے ایک آہ بھر کر لالہ کی طرف دیکھا۔

وہ خاموشی سے پرسوچ انداز میں آرام کرسی پر سر رکھے چھت کو گھورنے لگے۔

☆☆☆

”تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟“ یہ ارسل خان تھا جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ سوال پوچھ رہا تھا جس کا جواب سننا اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا۔

”اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں خود کو ناچیز سمجھتی ہوں یا پھر معمولی سی انسان وغیرہ وغیرہ تو یہ ماننے والی بات ہرگز نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلے تو کوئی یقین ہی نہیں کرے گا اس لیے سچ کہوں کہ میں خود کو کیا سمجھتی ہوں؟“

وہ شان بے نیازی سے بول رہی تھی۔

”ہاں مجھے پتا ہے کہ تم پریوں کی رانی ہو۔ حسن کی ملکہ ہو بلکہ دلوں کو فتح کرنے والی ایک مہارانی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔“

اس کا لہجہ طنزیہ تھا لیکن دل ہی دل میں وہ اعتراف بھی کر رہا تھا کہ جو الفاظ بولے ہیں، وہ اس کی شخصیت سے میچ بھی کرتے ہیں۔

”جب سب جانتے ہو تو پھر وجہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

ارسل نے سر جھکا لیا مبادا اس کی آنکھوں سے چھلکتی محبت کی توہین نہ ہو جائے۔

وہ گھر کے صحن میں شاہ گل کے تخت پر بیٹھی تھی اور ارسل خان اس کے سامنے رکھی کرسی پر۔

''گل لالہ بی بی! دنیا میں سب سے نایاب چیز محبت کی دولت ہوتی ہے۔ جس کے پاس یہ دولت ہو، وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔''

وہ گود میں گاؤ تکیہ رکھے زور زور سے ہنسنے لگی۔

''نایاب چیز؟ مجھے تو کبھی نایاب نہ لگی یہ کلموہی محبت۔ سچ کہوں تو مجھے راستے میں جگہ جگہ پڑی ہوئی مل جاتی ہے۔ کہیں فنکشن میں جاؤں تب چار چھ بندے آنکھوں میں یہی نایاب محبت بھرے گھور رہے ہوتے ہیں۔ کہیں بازار جاؤں تو لوگ مڑ مڑ کر وہی محبت لٹانے کے لیے لائن میں ہاتھ باندھے تیار کھڑے ہوتے ہیں۔

اور تو اور اسکول کالج کے باہر اسی محبت سے بھرپور دل ہتھیلی پر سجائے پریمی ٹھنڈی آہوں سے بھرپور پیکیج لیے اپنے منتظر ملتے ہیں۔ نایاب چیزیں ایسی ہوتی ہیں کیا؟''

ارسل خان لاجواب سا اسے دیکھنے لگا۔

''تم میری محبت کی توہین کر رہی ہو صرف اس لیے کہ میرے پاس اتنی دولت نہیں جتنی تمہاری خواہشات کے پیمانے میں پوری اتر سکے۔ تمہارے خوابوں کو اپنی حیثیت کے چھوٹے سے فریم میں فٹ نہیں کر سکتا کیونکہ تمہارے خواب بہت بڑے ہیں۔ اور چھوٹی حیثیت میری مجبوری ہے۔''

وہ گال کو چومتی لٹ کو سر کے خفیف جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

''اگر مزید سچ کی تلخی بھی پی سکتے ہو تو سنو! کہیں سے بھی تم میرے آئیڈیل سے میچ نہیں کھاتے۔ میری خواہشات میرے خوابوں کے پہاڑ کو سر کرتے کرتے تمہاری سانس پھول جائے گی۔''

وہ گھرے لہجے میں بولتی اجنبی سی لگ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔ کیونکہ محبت کرنے والے بددعا دے ہی نہیں سکتے ——— لیکن ان کی دعا محبوب کے حق میں قبول نہیں ہوتی جانتی ہو، کیوں قبول نہیں ہوتی؟ اس لیے کہ دعا کے دیے میں درد کا تیل ملا ہوتا ہے۔

دیے کے تیل میں پانی ملا ہو تو جلدی بجھتا نہیں لیکن ویسا جلتا بھی نہیں جیسا اندھیرے کا سینہ چیرنے کے لیے جلنا چاہیے ہوتا ہے۔'' ارسل خان کی آواز میں نمی سی گھل چکی تھی۔

''میرے لیے بہت سارے ایسے ہاتھ بھی دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہیں جن کی آنکھوں میں آنسو نہیں محبت کی روشنی ہے۔ مجھے ان کی دعاؤں پر پورا بھروسا ہے۔''

وہ الوداعی نظروں سے اسے دیکھ کر جا چکا تھا۔

''میں ایک دن ضرور بلندی پر پہنچوں گی۔ بلکہ چاند بن کر زندگی کے آسمان پر چمکوں گی اور چھوٹے چھوٹے ستارے میرے گرد ہالہ بنا کر مجھ سے میری روشنی مانگا کریں گے۔''

گل لالہ آسمان پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ گل اپنے کمرے میں مسہری پر نیم دراز بظاہر کھڑکی سے جھانکتی روشنی کی کرنوں کو گھور رہی تھی لیکن اصل میں سوچ کی لرزتی انگلیاں ہے یادوں کے البم کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ پہلی تصویر سامنے آتے ہی وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔

''لالہ! بھابھی کتنی پیاری ہیں ان کے گال اور بال تو بالکل میری گڑیا جیسے سنہری اور پیارے ہیں۔'' وہ دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھتے ہی خوشی سے چہکنے لگی تو بھائی کے ہونٹوں پر بھی فخریہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

پرخہ گل خاندان سے باہر کی تھی۔ اس کو ایک تقریب میں دیکھ کر بی بی جان نے عظیم خان کے لیے پسند کیا تھا اور جب عظیم خان نے اس کی بے دھیانی میں لی گئی تصویر ——— دیکھ کر اسے دل کی سلطنت کی رانی کا مکمل اور بااختیار عہدہ دے دیا تو کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہوئی۔

مگر شادی کے بعد سب ہی جان گئے کہ وہ بیوی کے سامنے دل و جان ہار چکا ہے اور اسے کچھ بجھائی نہیں دیتا سوائے پرخہ گل کے حسین رنگ و روپ اور دلبرانہ اداؤں کے۔
وہ شام کو کہتی خان جی صبح ہے تو اس کا بس نہ چلتا کہ شام کو صبح بنا دے۔
وہ کہتی سر میں درد ہے تو عظیم خان اسے گولی بعد میں کھلاتا۔ پہلے خود ضرور کھاتا کیونکہ بیوی کا سر درد اس کے درد دل کا سبب بن جاتا تھا۔
بی بی جان کی زیرک نگاہیں بظاہر نظر آنے والے حالات سے آگے بھی کچھ دیکھ رہی تھیں اور یہ کچھ انہیں بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔
''عظیم خان! یہ جمال خان کیوں روز آجاتا ہے؟''
انہوں نے ایک دن بیٹے سے یہ سوال کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔
''بی بی جان! آہستہ بولیں، مہمان سن لے گا اور اسے یہ سوال برا لگ سکتا ہے۔''
وہ دھیمی آواز میں بولا تو ماں کا پارہ چڑھ گیا۔
''عظیم خان سوال کسی ایرے غیرے نے نہیں کیا بلکہ اس گھر کی مالکن نے کیا ہے اس لیے کسی کو برا لگے یا اچھا مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر کسی کو فرق پڑتا ہے تو وہ اس سوال کی نوبت ہی کیوں آنے دے رہا ہے؟''
وہ ماں کے جلال سے ڈر گیا۔
''بی بی جان! وہ پرخہ کا بچپن کا ساتھی ہے اور دونوں میں بہت اچھی دوستی تھی۔ وہ اب بھی ایک دوسرے کو اسی طرح عزیز رکھتے ہیں جیسے بچپن سے لے کر جوانی تک رکھتے آئے ہیں۔ اب میں انہیں منع تو نہیں کر سکتا اسے کتنا دکھ ہوگا یہ سوچ کر کہ میں اس پر اعتماد نہیں کرتا۔''
وہ بیٹے کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔
''بی بی جان جیسی غیرت مند ماں کا دودھ پی کر بھی تجھ میں یہ صفت نہ آئی؟ ہمارے مذہب میں معاشرے میں اور خاص طور پر قبیلے میں کبھی مرد اور عورت کی دوستی کو جائز سمجھا گیا ہے؟ اگر ایسا ہوا ہے کہیں تو اس عورت سے تعلق رکھنے والے سارے مرد بے غیرت اور گناہ گار سمجھے گئے ہیں۔'' ماں نے غصیلے لہجے میں کہا تو وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔
جمال خان اونچا لمبا حسین نوجوان تھا اور اس کا بچپن کا ساتھی بھی، اگر اس میں کوئی کمی تھی تو وہ پیسے کی تھی۔ وہ مختلف کاروبار کر کے اپنی ساری زمین منافع کے بجائے بھاری نقصانات میں گنوا کر تہی دامن ہو چکا تھا اور ایسے مرد سے پرخہ گل محبت تو کر سکتی تھی لیکن شادی ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے وہ اس رشتے کے لیے انکار کر کے جمال خان کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔
''تو تم نے عظیم خان کے نام کی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی ہے؟'' وہ غصیلے لہجے میں پوچھ رہا تھا، اس کی گہری سبز آنکھوں میں شکوہ بھی تھا اور غصہ بھی۔
''صرف انگوٹھی نہیں پہنی بلکہ یہ دس تولے کے کڑے اور لاکٹ بھی ملا ہے منگنی میں جو تم کبھی بھی نہیں پہنا سکتے تھے۔'' اس کی آنکھوں میں پہلے ہی کیا کم چمک تھی جو سونے کے ساتھ ساتھ لالچ اور خوشی کی چمک بھی شامل ہو گئی تھی۔ خوشیاں تو اس کی دولت سے ہی مشروط تھیں۔
جمال خان نے اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر بے اختیار نظریں جھکالی تھیں۔
''لالچ کی جیت ہو گئی اور محبت ہار گئی۔'' اس کے کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
''جمال خان پھر نہ کہنا کہ تمہیں محبت نے موقع نہیں دیا تھا۔ میں تمہارا بہت انتظار کر چکی ہوں جب تم ہر کاروبار میں خسارا کر کے خالی ہاتھ رہ گئے تب میں نے عظیم خان کے رشتے کے لیے ہامی بھری ہے۔ میں حقیقت پسند ہوں اور یہ کوئی خامی نہیں خوبی ہے۔''
''خالی ہاتھ تھا خالی دل تو نہیں تھا؟''
جمال خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ ناگوار انداز میں اسے گھور کر بولی۔

”تمہارے دل کی امارت سے نہ پیٹ بھرے گا نہ ہی اچھا لائف اسٹائل مل سکے گا پھر میں نے اس دل کی امیری سے کیا لینا تھا؟“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت لٹاتی نظروں سے چند پل اسے دیکھتا رہا۔

پھر بوجھل لہجے میں بولا۔ ”پرخہ گل! تم واقعی اسم بامسمی ہو پھول پر چمکتی شبنم جیسی۔ میں نہیں چاہتا کہ دکھ کا سورج تمہاری یہ تازگی اور ٹھنڈک چھین لے، اس لیے بتا رہا ہوں کہ میری محبت تمہارے لیے ٹھنڈی چھاؤں جیسی ہے تم اس چھاؤں کے بغیر کچھ نہ رہو گی جیسے پرخہ (شبنم) چھاؤں کے ہونے تک ہی پھول پر رہتی ہے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ”دیکھ لوں گی کہ میرا شوہر بھی چھایا جیسا ہے کہ نہیں؟ نہ بھی ہوا تو میں اس کے پیسے کی چھتری تان کر اپنی تازگی بچا کر رکھوں گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سوچوں گی کہ مجھے جمال خان کی چھاؤں میں آنا چاہیے یا نہیں۔“

وہ کھل سا گیا۔

”مطلب میں تمہارے لوٹنے کی امید رکھوں؟“

وہ خوش گمان تو تھا ہی اس وقت پرامید بھی ہو گیا تھا۔

وہ بنا کوئی جواب دیے مسکرا کر چلی گئی۔

دل میں سوچ رکھا تھا کہ خود کو آزمائے گی اگر جمال خان کی محبت کے بغیر اس کا گزارا ہوتا رہا تو پھر اس سے رابطہ ختم کر دے گی اور اگر اس کی کمی جان کا روگ بن گئی تو پھر اس کو مسیحا بنا کر دوبارہ زندگی میں واپس لے آئے گی۔

چھوڑنا یا توڑنا اس کے لیے بڑی بات نہیں تھی۔

شادی کے بعد عظیم خان نے اسے اتنی محبت اور عزت دی کہ وہ اس کے جنون سے گھبرانے لگی۔

وہ اس کے صحیح کو تو صحیح کہتا تھا اس کے غلط کو بھی صحیح کہنے لگا تھا۔ جمال خان کی یاد اسے اس وقت بہت ستاتی جب اس کا دل چاہتا کہ کوئی اس سے لڑے، جھگڑے، ضد کر کے اپنی بات منوائے اور اسے غلط ثابت کرنے کے لیے بحث و مباحثہ کرے۔ عظیم خان تو سر تسلیم خم ہی کیے رہتا تھا ہر دم اس کے سامنے بھی اور اس کی غیر موجودگی میں دوسروں کے سامنے بھی۔

”آپ میری ہر فرمائش پر سر جھکا دیتے ہیں کبھی میری کسی بات پر غصہ بھی نہیں آتا۔ یہ بہت عجیب سا رویہ ہے؟“

وہ ایک دن پوچھ ہی بیٹھی۔

”تم نے شاید محبت نہیں کی ورنہ جان لیتیں کہ جن سے محبت ہو جائے۔ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ سو میں تمہارے حسن کے سامنے ہتھیار ڈال کر بے دست و پا ہوں تم جو چاہو سرکار کرو۔“ اس کی آواز میں محبت کی چاشنی تھی مگر پرخہ ان لوگوں میں سے تھی جنہیں صرف مٹھاس اچھی نہیں لگتی۔ وہ دو تین ذائقے ملا کر کھانے کے عادی ہوتے ہیں سو جلد ہی اس کا جی بھر گیا اس ذائقے کی یکسانیت سے۔

”جمال خان! کب آ رہے ہو میرے گھر؟“

اس کے فون پر وہ کھل سا گیا تھا۔

”میں تو ابھی آ جاؤں لیکن تمہارا شوہر کہیں مجھے قتل ہی نہ کر دے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ طنز بھری ہنسی۔

”وہ اگر مجھے کسی کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں بھی دیکھے گا تو یہی کہے گا کہ یہ میری آنکھوں کا دھوکا ہے پرخہ تو پاک ہے، پاکیزہ ہے۔“

اس کے لہجے میں بجائے خوشی اور فخر کے افسوس تھا۔

”تمہیں اپنے شوہر کی قدر کرنی چاہیے لیکن تمہارے انداز سے تو لگتا ہے اس کے اندھے بھروسے اور لامحدود محبت کو عیب سمجھ رہی ہو۔“ وہ اسے اچھی طرح سے جانتا تھا۔ جمال خان، پرخہ سے ملنے آتا اور اس کا شوہر آنکھیں بند کر کے ان کی ملاقاتوں کو صاف ستھری دوستی کا نام دیتا اور اپنے دل کے ساتھ گھر والوں کو بھی تسلی دیتا رہتا تھا۔

کم عمر اور نا سمجھ سی شاہ گل کو بھی بھائی کا اس طرح بھابھی کے ساتھ اس کے نوجوان کزن کا کمرے میں بیٹھ کر گپ شپ اور قہقہے لگانا قطعی پسند نہیں تھا اور وہ کئی بار دبی زبان میں بھائی کو اپنی ناپسندیدگی کا بتا بھی چکی

تھی لیکن وہ تو پرخہ گل کے حسن کی روشنی سے چندھیائی ہوئی آنکھوں کو کھولنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

آنکھیں تو اس دن کھلیں جب گل لالہ نے دنیا میں آکر ان کے خاندان کو مکمل کیا۔ عظیم خان اپنی خواب جیسی محبت کی جیتی جاگتی تعبیر دیکھ کر بہت خوش تھا۔ شاہ گل بھی ننھی پری کو گود میں لے کر بار بار چوم رہی تھی لیکن پرخہ کے ماتھے پر پڑے بل بتا رہے تھے کہ اسے نہ بیٹی سے دلچسپی ہے نہ ہی باپ سے۔

اس دن ہاسپٹل سے گھر آتے ہی پرخہ نے جمال خان کو بلا لیا تھا۔ عظیم خان بیوی اور بچی کو کمرے میں چھوڑ کر مہمان کی تواضع کے انتظام کا کہنے کے لیے باہر نکلا اور جب وہ چند منٹ بعد واپس آیا تو ساکت سا وہیں کھڑا رہ گیا کیونکہ اندر سے آتی آوازیں اسے زندہ درگور کردینے کے لیے کافی تھیں۔

"جمال خان! مجھے اس گھٹن زدہ ماحول سے نکال کرلے جاؤ۔ میرا دم گھٹ جائے گا اور میں ایک دن مر جاؤں گی اس گھر میں۔ پھر میری لاش پر روتے رہنا۔"

"میری جان پرخہ! بس چند دنوں کی بات ہے، پہلے تمہارا غلط فیصلہ پھر پریگنینسی پھر ڈیلیوری اور اب چھلہ، ہماری راہ کی یہ ساری رکاوٹیں ایک ایک کرکے ختم ہو رہی ہیں بس اب چند دن۔ پھر خلع کے لیے کیس کردیں گے۔"

جمال خان کی آواز نے اس کی آخری سانسیں بھی چھین لیں۔ وہ مکمل مر گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واپس جاتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ بغیر روح کے جسم کا بوجھ اٹھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اب بھی دعا کر رہا تھا کہ "کاش یہ سب خواب ہو اور آنکھ کھلتے ہی برے خواب سے نکلنے کی خوشی اس خواب کے حقیقت نہ ہونے کا سکون رگوں میں اتر کر زندگی کا احساس دلا دے۔"

لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا، وہ تو اپنی بچی کی طرف بھی نہیں دیکھتی تھی اور جب پرخہ نے اسے دودھ پلانے سے انکار کرتے ہوئے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا تو وہ گنگ رہ گیا۔

نند نے حیرانی سے پہلے اپنے غیرت مند بھائی کی خاموشی کو محسوس کیا پھر تحسین و جمیل بھابھی کی آنکھوں میں بے گانگی دیکھی۔

"بھابھی! بچی بہت بھوکی ہے اسے دودھ پلا دیں پلیز، رو رو کر اس کا گلا بیٹھ گیا ہے۔" وہ بھوک کی شدت سے تڑپتی بچی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

"میں صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ مجھے اس بچی سے اور اس کے باپ دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں، حق مہر میں جو کچھ لکھا ہے، وہ مجھے طلاق کی صورت میں مل سکے گا۔ اس لیے مجھے غربت کا ڈر بھی نہیں رہا اگر تم اپنے محبت کے دعوے میں سچے ہو تو مجھے طلاق دے دو میں خلع لے کر یہ سب چھوڑنا نہیں چاہتی اور تمہاری مجبوری یہ ہے کہ تم اپنی اولاد کے لیے میری ہر شرط مانو گے اور میری شرط یہ ہے کہ طلاق اور حق مہر دے کر تم اپنی بیٹی لے لو۔

میں اعتراف کرتی ہوں کہ میرا دل ہمیشہ سے اس کے لیے ہی دھڑکتا تھا جس کے پاس محبت کی دولت تو ہے لیکن پیسے نہیں ہیں۔"

وہ صاف گو تو ہمیشہ سے تھی۔ کچھ عرصہ منافقت میں گزارنا اور شوہر کے اعتماد کو دھوکا دینا اس کی مجبوری تھی اور جب وہ مجبوری نہ رہی، تب وہ سچ بولنے پر مجبور ہوگئی۔ اس نے گھٹن میں وقت گزارنا قبول نہ کیا۔

شادی کے بعد اس نے جتنا خرچ کیا، اتنا سنبھالا بھی تھا کیوں کہ شوہر نے اسے ہر چیز کا حق دے رکھا تھا کبھی اس سے یہ نہ پوچھا کہ تم نے اتنا کہاں خرچ کیا؟ اچھا خاصا بینک بیلنس اور بری کے زیورات کے ساتھ ساتھ تحائف میں ملے وہ سارے زیورات بھی اس کے پاس محفوظ تھے جو شادی کے بعد مختلف مواقع پر اسے عظیم خان نے لا کر دیے تھے۔

شہر کے مہنگے علاقے میں خریدا گیا وہ فلیٹ جو اس کی پسند کے مطابق فرنشڈ بھی کیا گیا تھا۔ اس کا تھا۔ اس فلیٹ کے کاغذات اس کے نام تیار ہوئے تھے۔ عظیم خان نے اسے فلیٹ کے کاغذات دیتے ہوئے

یہ درخواست کی تھی کہ بی بی جان کو اس کے بارے میں خبر نہیں ہونی چاہیے۔

"مجھے تو اس بات پر حیرانی ہے کہ اس سارے معاملے میں آپ کی والدہ کا کیا کام ہے کہ وہ خفا ہوں گی۔ یہ سب آپ کا ہے اور آپ کی ہر چیز میری ہے۔"

عظیم خان اس کے منہ سے یہ بات سن کر ہی کھل گیا تھا کہ وہ اسے خود سے الگ نہیں سمجھتی۔

"جب میں تمہارا ہوں تو میری ہر چیز بھی یقیناً تمہاری ہی ہے۔"

اور آج وہ پرخہ گل کی طلاق والی ڈیمانڈ سن کر بھی اس کے منہ پر ایک تھپڑ نہ مار سکا۔ غیرت اور محبت دونوں کے ہاتھوں مجبور جو تھا۔

غیرت کہتی تھی اس بے وفا اور لالچی عورت کو مار دو مگر محبت اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی اور کہتی "عظیم خان! پہلے مجھے قتل کرو پھر اسے مار سکو گے۔"

اور محبت کو مارنا اس کے بس میں نہ تھا کیونکہ وہ آب حیات پی کر دلوں میں اتر آتی ہے۔ طلاق کے ساتھ حق مہر کی وصولی اور بیٹی سے اس شرط پر مکمل دست برداری کہ وہ بری کے ساتھ گفٹ کے سارے زیورات کی ملکیت کو چیلنج نہیں کرے گا۔ اس نے گل لالہ عظیم خان کو شاہ گل کی گود میں دے دیا۔

بن ماں کی بچی کو گود میں اٹھاتے ہی وہ الھڑ پنے کے حسین خواب جیسی زندگی سے نکل کر بدصورت ترین حقیقت میں داخل ہو گئی۔ کئی راتیں اس نے آنکھوں میں کاٹ کر گزاریں۔ بی بی جان اس صدمے کے اثر سے نکل ہی نہیں رہی تھیں بلکہ نکلنا ہی نہیں چاہ رہی تھیں۔ جس معاشرے میں وہ رہتی تھیں وہاں ایسی باتوں پر قتل ہو جاتے تھے۔ قتل تو اب بھی ہوئے تھے لیکن لاشیں زندہ ہونے کی اداکاری میں مصروف تھیں۔ اس لیے نہ کسی پر فرد جرم لگانا ہی کوئی سزا وار ٹھہرایا گیا۔

بی بی جان کی طبیعت بہت بگڑ چکی تھی۔ وہ اسپتال کے بیڈ پر لیٹی چھت کو تک رہی تھیں۔ عظیم خان نے دیکھا بستر کی سفید چادر کے ہم رنگ چہرے پر ہمیشہ مسکرانے والی دو آنکھیں آج ویران بھی تھیں اور جل تھل بھی۔

"بی بی جان! بھول جائیں سب، ایک برا خواب سمجھ کر۔"

عظیم خان کے ارادے کو بہن نے زبان بخش دی تھی

"کیسے بھول جاؤں۔ لوگ اس کم بخت بہو کو بدکردار اور خراب عورت کہیں تو کہیں، اس سے رشتہ ختم جو ہو گیا ہے لیکن میری پوتی کو میری نسل کو اس عورت کی گالی سننی پڑے گی، یہ کیسے برداشت کروں؟ اور......اور میں بے غیرت بیٹے کی ماں ہونے کا طعنہ کیسے برداشت کروں؟ میں بے غیرتی کا طعنہ نہیں سن پاؤں گی۔"

وہ پرانے زمانے کی خاتون تھیں ان کے لیے یہ سانحہ ایسا ہی تھا جیسے کسی نے ان کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو اور واقعی عزت پر ہاتھ ڈالا تو گیا تھا لیکن عزت کی صلاح عزت کی مرضی اس میں شامل تھی ورنہ تو یہ دراز بازو کاٹ دینے کی طاقت اس قبیلے کے بچے بچے میں موجود تھی کیونکہ ان کو گھٹی میں ہی گھول کر روایات کی پاس داری کا عہد پلایا جاتا تھا اور پہلی بار اس عہد سے بدعہدی کرنے والا ان کا اپنا بیٹا تھا۔ وہ اسے کیسے معاف کرتیں؟

"کیا کروں بی بی جان! بہت کوشش کی کہ اس عورت کو سزا دوں لیکن پھر ہاتھ رک جاتے ہیں کہ سزا اور جزا کا حق جس کا ہے اسی پر چھوڑنا چاہیے کیونکہ وہی تو ہے جس نے عورت کو یہ حق دے رکھا ہے کہ وہ طلاق یا خلع لے کر اپنی پسند کی زندگی گزار سکتی ہے۔ قبیلوں کے قانون اس کے قانون کے سامنے جھوٹے ہیں، کمزور ہیں، یہ آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں؟"

وہ بمشکل اپنے آنسو روک پایا تھا کہ ماں کہیں مزید بزدلی کے طعنے نہ دینے لگ جائے۔

"میری بات سنو تم لوگ۔ سارا قبیلہ جانتا ہے کہ بی بی جان کی بہو سے ان بن رہتی ہے، سب کو یہ ہی خبر ہونی چاہیے کہ۔۔۔ اس بات کو وجہ بنا کر ہمارے گھر میں لڑائی جھگڑے ہوتے تھے اور بالآخر ایک

دن وہ گھر چھوڑنے کی دھمکیاں دینے لگی اور ان حالات سے تنگ آکر غصے میں عظیم خان نے اسے طلاق دے دی۔ اس طرح کم سے کم ماؤں کے پاس بیٹوں کو دینے کے لیے ایک مثال تو ہوگی نا۔ اور اس بچی کو یہ نہ بتانا کہ اس کی ماں بدکردار تھی۔ باوفا نہیں تھی۔ اس کے غیرت مند باپ نے اسے اس کی خوشی کے لیے چھوڑا تھا، اپنی ماں کے لیے نہیں۔ اسے بھی وہی کہنا ہے جو زمانے کو بتاؤ گے۔"

ننھی گل لالہ رو رہی تھی اور شاہ گل اسے ہلا ہلا کر چپ کرانے میں مگن تھی۔

"سنو شاہ گل! اسے اپنے جیسا بنانا صابر، قناعت پسند، غیرت مند اور باکردار و باحیا۔"

بی بی جان اسے حکم دینے کے ساتھ اس کی وہ خوبیاں بھی گنوا رہی تھیں جس کا اعتراف پہلے کبھی نہیں کیا تھا وہ ماں کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"مجھے کیوں یہ کہہ رہی ہیں؟ جیسی تربیت شاہ گل کی ہوئی ہے ویسی اپنی پوتی کی بھی کریں گی آپ ان شاء اللہ۔"

وہ پل بھر کے لیے گل لالہ کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے چپ کرانے کے لیے فیڈر اس کے منہ میں رکھا۔

اسپتال کے اس کمرے میں وہ کل چار افراد تھے۔

لیکن اگلے ہی پل اک ہچکی نے انہیں تین کر دیا۔

موت کی وہ ہچکی دو زندہ لوگوں کی زندگیوں کو مزید دکھی کر گئی تھی۔ عظیم خان کو یقین تھا کہ اس کی بہادر، غیرت مند اور بارعب بی بی جان اس سے بہت خفا گئی ہیں اور یہ دکھ محبت کے زندہ درگور ہونے سے بھی بڑا تھا وہ شاید مر ہی جاتا اگر اسے شاہ گل اور گل لالہ کی طرف سے یہ اطمینان مل جاتا کہ ان کی حفاظت کرنے والا کوئی اور ہے۔

☆☆☆

"گل لالہ! آنکھیں کھولو میری جان!" وہ سخت گھبراہٹ میں بار بار یہ کہہ رہی تھی لیکن بخار میں تپتی ہوئی معصوم بچی ساکت پڑی تھی۔ اس کی سانس کو محسوس کرتے ہوئے وہ زور زور سے آوازیں دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پلیز پیاری ڈول آنکھیں کھول دو ورنہ شاہ گل بھی مر جائے گی پلیز...... پلیز۔" وہ سسکنے لگی تھی۔

دایان محمود اسے یوں روتے دیکھ کر اپنے مطلوبہ کمرے کا رستہ ہی بھول گیا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگا، وہ شہر کے سب سے بڑے ہاسپٹل میں تھی دو تین دن سے گل لالہ کی طبیعت خراب تھی اور قریبی ڈاکٹر نے بخار کی دوا اور سمپل اینٹی بائیوٹک دے کر تسلی دی تھی کہ فکر کی بات نہیں ہے، بخار اور نزلہ زکام ہے ایک دو دن میں ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

لیکن بخار تھا کہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔

وہ بھتیجی کی مزید خراب ہوتی طبیعت دیکھ کر بار بار اپنے لالہ کا نمبر ملا رہی تھی لیکن ان کا فون بند آ رہا تھا اس نے گل لالہ کے سر پر پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے اسے ہاسپٹل پہنچانے کا فیصلہ کیا اور ڈرائیور کے ساتھ اس معصوم کو لے کر یہاں آ گئی۔

چند ٹیسٹ ہوئے اور وہ نیم بے ہوش گل لالہ کو گود میں اٹھائے رپورٹس کا انتظار کرنے لگی، ایمرجنسی ٹریٹمنٹ کے بعد وہ ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ شاید میڈیسن کے زیر اثر ہی گل بالکل بے سدھ پڑی تھی ڈاکٹر کی تسلی کے باوجود بھی مطمئن نہ ہوئی تھی لیکن اس کا ننھا سا دل کانپ رہا تھا۔ اس ہر دم ہنستی مسکراتی معصوم گڑیا کی طرف دیکھ کر۔

دایان محمود اپنے جگری دوست ڈاکٹر سرمد کی عیادت کے لیے ہاسپٹل آیا تھا لیکن اسے یوں روتے دیکھ کر جیسے اس کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا تھا۔ وہ باوجود کوشش کے وہاں سے ہل نہیں سکا۔

"یہ...... یہ تو فرینڈ ہے" اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔

"میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"

اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بے یقینی سے سوچا۔ آس پاس کا منظر حقیقی تھا۔ اس نے بغور دیکھا۔ وہ لڑکی کہیں سے بھی اس بچی کی ماں نہیں لگ

رہی تھی جو آنکھیں بند کیے اس کی گود میں لیٹی تھی۔
لڑکی کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں لگ رہی تھی اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ اس کے اندازے سے بھی کم عمر کی ہے۔
وہ بے اختیار اس کی طرف چل پڑا اسے یاد ہی نہ رہا کہ ہاسپٹل آنے کا مقصد کیا ہے۔
"میم! کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"
وہ نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ شاہ گل کو لگا جیسے وہ مسیحا ہے اور اس کے سب درد وہی دور کر سکتا ہے۔
"پلیز ڈاکٹر صاحب! اس کو بچا لیں۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے میں اسے آوازیں دے رہی ہوں لیکن یہ بالکل آنکھیں نہیں کھول رہی۔"
دایان محمود نے دل میں لاحول پڑھتے ہوئے سوچا۔
"پیاری فرینڈ! میں اب تمہیں کیا بتاؤں کہ اس ڈاکٹری سے جان چھڑانے کے لیے میں نے کون کون سے ڈرامے کیے ہیں۔"
اسے اپنا انٹری ٹیسٹ کا جان بوجھ کر خالی چھوڑا پیپر یاد آ گیا اور وہ دو تین لڑکے بھی جن کو سارا پیپر اس نے کرایا اور وہ سب ہی میڈیکل کالجز تک پہنچ گئے تھے لیکن وہ فیل ہو گیا اور فیل ہونے اور امتحان دے کر آنے کی اپنی وہ اداکاری بھی اسے اچھی طرح سے یاد تھی جس کے بعد مما نے اسے ملامت کرنے کے بجائے حوصلہ دیا تھا۔
"جی آپ پریشان نہ ہوں بی بی۔ آپ کی بچی جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے میڈیسن دی ہیں اس لیے یہ سکون سے سو رہی ہے اسے یوں آوازیں دے کر ڈسٹرب نہ کریں۔" وہ یہ سب کہتے ہوئے دل ہی دل میں دعا بھی کر رہا تھا کہ خدا کرے بچی سچ مچ سوئی ہوئی ہو۔ اس کے چہرے پر پھیلے خوف و دہشت کے تاثرات کم ہوئے اور تنے ہوئے نقوش واپس اپنی جگہ پر آنے لگے تھے
"آپ کیسی ماں ہیں کہ آپ کو بچی کی نیند اور بے ہوشی کا فرق بھی نہیں پتا؟" اس نے یہ سوال اس موہوم سی امید پر کیا تھا کہ شاید وہ بچی کی ماں ہونے سے انکار کر دے۔ دایان محمود آس بھری نظروں سے اس کے کالی اوڑھنی سے جھانکتے سنہری بالوں والے سر کی طرف دیکھنے لگا لیکن وہ سر نفی میں نہ ہلا تو وہ یاس سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"ڈاکٹر صاحب! ٹیسٹ رپورٹ کتنی دیر میں آ جائے گی؟" وہ گل لالہ کو یوں خود میں سمو رہی تھی جیسے ڈر ہو کہ اسے کوئی چھین کر نہ لے جائے۔ اس کی سوالیہ نظروں کا مرکز دایان محمود تھا، اس پریشانی میں بھی وہ سامنے بیٹھے مہربان ڈاکٹر کی ڈیشنگ شخصیت کی دل ہی دل میں تعریف کیے بنا نہ رہ سکی۔
"نام بتائیں میں پتا کرتا ہوں؟"
وہ جلدی سے بولی۔
"جی میرا نام شاہ گل ہے۔" وہ جلدی سے بولی تو دایان اس کی سادگی پر مسکرا دیا۔
"شاہ گل!" اس نے خود کلامی کے انداز میں اس نام کی مٹھاس اپنے لبوں پر محسوس کی۔ شاہ مطلب بادشاہ اور گل کا مطلب پھول، مطلب پھولوں کا بادشاہ۔ اک مدت سے تم فرینڈ ہو آج تک مجھے تمہارا نام معلوم نہ ہو سکا اور جب بھی پوچھا تم نے یہ کہہ دیا کہ کسی دن بتا دوں گی ابھی تو میں صرف فرینڈ فار ایور ہوں اور آج اچانک ہی بنا پوچھے نام بتا رہی ہو۔
"مریضہ بچی کا نام پوچھا ہے بی بی؟"
وہ شرمندہ سی جھٹ سے بولی۔
"بچی کا نام گل لالہ ہے سر!"
وہ باوجود وہیں اس کے سامنے بیٹھے رہنے کی شدید ترین خواہش کے بادل نخواستہ اٹھ کر سرمد کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں اسد بھی بیٹھا ہوا تھا اور دونوں نے گپ شپ لگا رکھی تھی سرمد اور اسد اس کے وہ دوست تھے جنہیں اس نے نقل کرا کے اس انٹری ٹیسٹ میں کامیاب کرایا تھا اور بعد میں ہر ہر مرحلے پر دونوں اسے کوستے رہتے تھے کہ نہ وہ نقل کراتا نہ وہ میڈیکل کالج میں پھنستے۔ پڑھا کو ہو کر بھی وہ روتے

رہتے تھے۔
اس کا نام سرمد نے نیرو رکھ دیا تھا اور وہ اکثر جل کر کہتا۔
”تو ہمارے جلنے اور جل کر بھسم ہو جانے تک چین کی بانسری بجاتا رہ نیرو۔“ اندر داخل ہوتے ہی ٹانگ پر پلاسٹر اور سر پر پٹی باندھے بیڈ پر لیٹے اپنے جگری یار سرمد کی طرف اس نے کوئی توجہ ہی نہ دی جس کا آج صبح اسپتال آتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور سرمد کے ایکسیڈنٹ کی خبر نے اس کے ہوش و حواس ہی اڑا دیے تھے تبھی تو وہ چین سے آئے وفد سے میٹنگ کل پر رکھ کر بھاگا بھاگا اسپتال آیا تھا
”یار اسد! دیکھو جلدی سے لیبارٹری سے معلوم کرو کہ گل لالہ نامی بچی کے ٹیسٹ کب تک آئیں گے اور ٹیسٹ کا رزلٹ کیسا ہے؟“
وہ سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی جلدی بول رہا تھا۔
”سانس تو لو یار! ابھی پتا کراتا ہوں۔“
وہ بڑبڑاتے —— گنگناتے ہوئے نمبر ملانے لگا وہ اسی ہاسپٹل میں جاب کرتا تھا۔
”ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں محترم جناب دایان محمود صاحب! اک نظر کرم دکھی لوگوں پر بھی کر ہی دیں، مریض کہہ رہا ہے کہ خدارا میری عیادت کرو کہ ان کے پوچھے سے منہ پر رونق ہی آجائے۔“
سرمد کے یوں کہنے پر وہ جھٹ سے بنا اس کی طرف دیکھے بولا۔
”یار تنگ نہ کر، زندگی میں پہلی بار ڈاکٹر نہ بننے پر افسوس اور پچھتاوا شروع ہوا ہی تھا کہ تو نے درمیان میں ٹوک دیا تو بول رہا ہے ہنس رہا ہے ٹھیک ہی ہوگا۔“ سرمد صدمے کی کیفیت میں اس کی پشت جو گھورے جا رہا تھا۔
”کوئی سیریس ایشو نہیں ہے، بچی کا ٹائیفائڈ پازیٹو ہے، ابھی ڈاکٹر جلال میڈیسن دے دیں گے۔“ وہ تیزی سے بھاگنے کے انداز میں واپس نکل گیا وہ دونوں ہکا بکا سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔
”یہ تو پاگل ہی ہو گیا ہے۔“
”بی بی بچی کو کوئی سیریس مسئلہ نہیں ہے صرف ٹائیفائڈ ہے جس کی میڈیسن ابھی ڈاکٹر جلال دے دیں گے۔“
وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ شاہ گل اس کی بات پر جیسے اچھل پڑی۔
”کیا ٹائیفائڈ؟ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اتنی چھوٹی بچی کے لیے ٹائیفائڈ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے اور پھر بھی آپ کہہ رہے ہیں، کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ کہیں آپ دماغی امراض کے ڈاکٹر تو نہیں ہیں؟“ اس کے انداز میں شک تھا۔ دماغی امراض کے ڈاکٹر دماغی مریض نہیں ہوتے۔ یہ بات اب وہ اسے کیسے سمجھاتا؟
اسی وقت نرس نے اسے ایک فائل لا کر دے دی جس میں ٹیسٹ کا رزلٹ تھا۔
گود میں لیٹی گل لالہ نے کسمسا کر آنکھیں کھول دی تھیں اور بے اختیار وہ بچی کو دیکھ کر مسکرا دی۔
دایان نے دیکھا، فرینڈ کے دونوں گالوں پر ڈمپل بن گئے تھے دائیں گال پر بڑا ڈمپل اور دوسرے گال پر قدرے چھوٹا، وہ ہو بہو دانی تھی۔
بچی کے ہوش میں آنے کی خوشی شاہ گل سے بھی زیادہ دایان محمود کو محسوس ہو رہی تھی۔
”بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب آپ نے مشکل وقت میں تسلی کے حرف کہے۔“
وہ مسکرا دیا اندر ہی اندر خود کو ملامت کرتے ہوئے۔
”یہ تو میری فرینڈ ہے اس لیے بے اختیار ہو گیا ورنہ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا، یونی میں کیسی کیسی لڑکیاں تھیں ناز درانی جیسی لڑکی جو میری اک نظر کرم کے لیے کیا کیا نہ کرتی تھی؟ اور سدرا منیب جس نے کہا تھا میں اپنی نس کاٹ کر مر جاؤں گی دایان محمود! اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو۔ لیکن میں تو کبھی ایسا

بے اختیار نہیں ہوا تھا، اللہ جانتا ہے کہ یہ تو میرے بچپن کی ساتھی ہے، میرے خوابوں میں ساتھ کھیلنے والی میری فرینڈ۔ ہم نے ساتھ مل کر تتلیاں پکڑی ہیں، جگنوؤں کو مٹھی میں بند کر کے دن کی روشنی میں دیکھا ہے ساتھ جھولے جھول کر بڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں جانتی تو کیا ہوا میں تو فرینڈ کو جانتا ہوں لیکن۔ اس نے شادی کر لی اور مجھے بتایا بھی نہیں یہ تو فرینڈ شپ نہ ہوئی نا؟" وہ خود سے ہی سوال کر رہا تھا۔

"آج احساسات کی دنیا میں ہلچل مچائی بھی تو کس نے اس فرینڈ نے جواب ایک بچی کی ماں ایک شادی شدہ عورت ہے۔ پہلی نظر میں ہی خود کو خود سے بچھڑتے دیکھا بھی تو کس کے سامنے؟" وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"خیریت تو ہے نا ڈاکٹر صاحب آپ گم صم سے کھڑے ہیں؟" وہ اس کے یوں پوچھنے پر سنبھل گیا تھا۔

"یار دایان! سرمد بلا رہا ہے تجھے، کہاں غایب ہو گئے تھے؟"

پیچھے سے ڈاکٹر اسد کی آواز سنائی دی اور وہ مڑ گیا، اسد مشکوک نظروں سے اس لڑکی کو دیکھنے لگا تھا جو گود میں ایک بچی کو لیے بیٹھی تھی۔ دایان کی لڑکی کی طرف پیٹھ ہو گئی تھی لیکن اسے اسد کے ساتھ جاتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی دو آنکھیں ہیں بلکہ اس کا تو سارا وجود ہی آنکھوں میں بدل گیا تھا وہ مڑے بغیر بھی اسے نظر آ رہی تھی، اسد نہ جانے کیا کہہ رہا تھا اسے سنائی نہ دیا۔

"دایان محمود صاحب! کیسے ہیں آپ؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے سرمد کی جلی بھنی طنز بھری آواز سنائی دی۔

"ابھی ابھی میں تجھ سے بھی بڑے حادثے سے گزر کر آیا ہوں۔ اور کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا ابھی سے سمجھا رہا ہوں۔" اس نے دھمکی آمیز انداز میں پلنگ پر لیٹے سرمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اسد اور سرمد ایک دوسرے کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے۔

وہ سرمد کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں تو کر رہا تھا لیکن اس کی ساری حسیات باہر ویٹنگ روم کی طرف لگی تھیں۔

جب سرمد دواؤں کے زیر اثر غنودگی میں چلا گیا تو اسد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے باہر نکلنے کا کہا اور دونوں باہر آ گئے۔

"میں نے سرمد کے گھر والوں کو فون کر دیا ہے۔ وہ لوگ کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں اور میری بھی آج نائٹ ہے۔ میں ادھر ہی ہوں، تم گھر چلے جاؤ آنٹی تمہاری طرف سے پریشان ہوں گی۔" سرمد کے والد دل کے مریض تھے۔ اس لیے انہیں فوری خبر نہیں دی گئی تھی بلکہ سرمد کے مکمل ہوش میں آنے کے بعد انہیں بلایا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے یار! سرمد کا خیال رکھنا۔"

وہ تیزی سے باہر نکل کر ویٹنگ روم کی طرف آیا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھی۔

وہ ہمیشہ کا نفاست پسند انسان چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوکروں کی شامت لے آتا۔

"یہ دیکھیں شریف چاچا! اس پلیٹ کو خشک کیے بغیر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا ہے آپ نے ایسا کریں آپ میری جگہ آفس چلے جایا کریں۔ میں یہاں بیٹھ کر برتن سکھایا کروں گا۔"

ماں آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کرتیں۔

"اور زرینہ ماسی! جب کہا ہے کہ میری بیڈ شیٹ روز بدلا کریں تو آج بھی کل والی بیڈ شیٹ میرے بیڈ پر کیوں پڑی ہے؟"

"قسم لے لیجیے صاحب! میں نے بدلی ہے لیکن آپ ایک ہی رنگ کی دو بیڈ شیٹس لائے تھے تو دوسری والی بچھائی ہے۔"

اور وہ ہی نفیس اور صفائی پسند انسان سیدھا اس کرسی کی طرف آیا جس پر کچھ دیر پہلے شاہ گل بیٹھی تھی اور اس کی ساتھ والی کرسی سے وہ ٹشو اٹھا کر جیب میں

ڈال لیا جس میں اس کے آنسوؤں کی نمی رہ گئی تھی۔
"دایان محمود صاحب وہ نہ سہی اس کے آنسو ہی سہی کچھ تو رہ گیا ہے تیرے پاس۔" اس نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹشو کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے سوچا اور وہاں سے نکل گیا جہاں اس نے اپنا آپ پل بھر میں کھو دیا تھا" جانے اب خود کو ڈھونڈنے میں کتنا وقت لگے؟"

☆☆☆

"لالہ! آپ سارا دن کہاں ہوتے ہیں۔ آج گل لالئی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ آپ کا نمبر بھی بند تھا، میں اسے لے کر اکیلی ہاسپٹل گئی اور یقین کریں اس کی حالت دیکھ کر میرے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔"
رات گئے عظیم لالہ لوٹے تو انہیں اس معصوم سی بہادر بہن پر پیار کے ساتھ ترس بھی آیا۔
"پرخہ تمہارے دیے ہوئے زخموں کی تکلیف مجھے اپنی طرف ہی متوجہ رکھتی ہے میں اپنے علاوہ کچھ دیکھنا ہی نہیں چاہ رہا۔ اس معصوم سی شاہ گل کے ساتھ کتنی زیادتی ہو رہی ہے۔ پہلے اس سے تم نے ماں چھین لی اب اس سے بھائی چھین رہی ہو اور اس کی بے فکری تو تم نے اسی وقت چھین لی تھی جب گل لالہ دنیا میں آئی تھی۔"
وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھے اس سے گل لالہ کی بیماری کی تفصیل پوچھ رہے تھے اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی لیے وہ سب بتا رہی تھی جو اس پر بیتی تھی۔
"ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا میرا بچہ۔"
انہوں نے بچی کو گود میں اٹھا کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے دعا مانگی۔
"کاش تم ماں جیسی خود غرض کبھی نہ بنو۔"

☆☆☆

"میں جانتا تھا کہ تم لوگ اعتبار کے قابل نہیں ہو اور کسی بھی وقت یہ سب کسی تک پہنچ سکتا ہے اس لیے میں نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو سب پہلے سے بتا دیا تھا۔"
"تجھے تو عشق و محبت کی کئی کہانیاں پہلے سے اسے سنانی ہوں گی کیونکہ تیری بیوی کو جو ہم نے بتانا ہے اس کے بعد مشکل ہے کہ وہ تیرے ساتھ گھر بسائے۔"
اسد نے دایان کو دھمکی آمیز انداز میں مخاطب کیا تو وہ اک آہ بھر کر بولا۔
"جس کے ساتھ گھر بسانے کی خواہش دل نے کی ہے وہ تو پہلے سے ہی کسی اور کا گھر بسا چکی ہے۔"
وہ دونوں افسوس سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

☆☆☆

"شاہ گل ببو۔ شاہ گل ببو!"
گل لالہ کی پکار نے اسے ماضی کے الجھے ہوئے رستوں سے واپس حال میں لا کھڑا کیا تھا۔
شاہ گل نے دیکھا۔
گل لالہ آج بہت خوش لگ رہی تھی۔
"پتا ہے شاہ گل ببو! آج مجھے میرے خوابوں کا شہزادہ نظر آیا ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہ فقط خوابوں کا ہی نہیں حقیقت میں بھی شہزادہ ہے اتنا بڑا محل ہے اس شہزادے کا کہ میں تو اس کی راہداریوں میں گم ہی ہو گئی تھی اور اس کی دولت کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ کہتے ہیں وہ ملک کے بڑے بڑے صنعت کاروں میں سے ایک ہے اس کے محل میں ساری دنیا سے لائی گئی ایسی ایسی نادر اشیا سجی ہوئی ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔" وہ بول رہی تھی اور شاہ گل اس کی آنکھوں میں اک عجیب سی چمک دیکھ کر ڈر سی گئی تھی۔
"یہ چمک تو بہت مانوس سی ہے کہاں دیکھی ہے میں نے؟"
وہ سوچنے لگی اور جب یاد آ گیا کہ یہ چمک کہاں دیکھی ہے تو وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔
"اور شاہ گل ببو! اس شہزادے کی شخصیت تو ایسی ہے کہ بس بندہ اسے دیکھے جائے دیکھے جائے

جی ہی نہیں بھرتا دیکھتے رہنے سے۔ بڑے بڑے انٹرنیشنل برانڈز پہنتا ہے اور اتنا جچتا ہے اس پر سب کچھ کہ لگتا ہے بس اسی کے لیے بنا ہے۔“

وہ مسلسل بول رہی تھی اس کے گال شدت جذبات سے تپنے لگے تھے اور آنکھوں کی چمک سے نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں وہ ایسی ہی تھی شدت پسند اور آخری حد تک جانے والی۔

”ایک ہی دن میں تمہیں اس شہزادے کے بارے میں اتنی معلومات کیسے ہو گئیں؟“ شاہ گل نے بڑی نرمی سے ریشمی زلفوں کی آوارہ لٹ اس کے تپتے گال سے ہٹا کر اس کے کانوں کے پیچھے کی اور محبت سے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”شہزادوں کے خواب صرف شہزادیوں کی آنکھوں میں سجتے ہیں پیاری۔ اور ہم زمین زادیاں ہیں۔“

وہ اسے سمجھا رہی تھی جو خود کو بہت سمجھ دار سمجھتی تھی۔

”تو کس نے کہا آپ سے کہ شہزادے آسمانوں پر رہتے ہیں اور یہ بھی کس نے کہا ہے آپ سے کہ میں شہزادی نہیں ہوں اور ایک بات بتا دوں میری آنکھوں میں کسی شہزادے کے خواب بھی نہیں سجیں گے۔ جانتی ہیں کیوں؟ اس لیے کہ وہ شہزادہ میرے خواب دیکھے گا اور خواب کو آپ نے کبھی خواب دیکھتے دیکھا ہو تو ٹھیک میں نے کبھی دیکھا نہ سنا۔“ اس کے انداز میں خود پسندی اور غرور تھا۔

وہ دل ہی دل میں ہنس دی۔

”گل لالہ! تمہیں کیا پتا کہ تم اسی خواب سے مخاطب ہو جس نے کبھی بہت خواب دیکھے تھے لیکن تعبیروں کو بڑی بے دردی سے رد کر دیا تھا اور جن خوابوں کو تعبیروں نے رد کیا ہو وہ بھلا کیوں نہ ٹوٹیں گے؟“

”چلو ٹھیک ہے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو گی ہمارے لیے کہ ایک شہزادہ ہماری شہزادی کے خواب دیکھتا ہوا ہمارے دروازے تک پہنچ جائے اور ہماری

پرنس کو اپنے محل کی رانی بنا کر لے جائے۔“ وہ ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں سے زخمی بصارتوں کو خود سے بھی چھپا رہی تھی۔

”شاہ گل بوا! اک بات پوچھوں؟“

وہ پرسوچ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو چکی تھی۔

”تمہیں اجازت کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟“

”آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟“

”محبت پھول سی
اور میں کانٹوں پہ
چلتی ہوں
محبت چھاؤں سی
اور میں دھوپ میں
جلتی ہوں“

وہ لاجواب سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔

”آپ جیسا حسن ہمارے قبیلے میں کسی کو نہ ملا اور نہ ہی مل سکتا ہے۔ کوئی کتنا بھی حسین ترین پیدا ہوا آپ جیسا حسین نہیں ہو سکتا“ وہ محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ گل کے گال لال ہو گئے اور گالوں کے ڈمپل مزید گہرے ہونے لگے۔

”اپنے بارے میں کیا کہو گی؟“

شاہ گل نے میٹھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

”میں اس قبیلے کی بات کر رہی ہوں پریوں کی شہزادی کی نہیں جو آپ مقابلہ کریں گی۔“

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگی۔

”اچھا سا پاستا مل جائے گا شاہ گل بوا۔“ وہ اس کے پوچھنے پر مڑی۔

”جی نہیں۔ کنیز پریوں کو حکم دو کہ وہ تمہارے لیے پرستان کے شاہی محل سے اسپیشل کھانا لے کر آئیں۔“

گل لالہ پھوپھی کی شرارت پر کھسیانی سی ہو کر آنکھیں بند کر چکی تھی آج بھی حسب سابق شاہ گل

بو نے اسے ٹال دیا تھا۔

☆☆☆

''مما! شادی کے لیے بہت زور ڈال رہی ہیں اور میں ان کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کیے رہتا ہوں لیکن یہ حکم مجھے نہیں منظور۔''

وہ دونوں دوستوں سے ہی تو دل کی حالت بیان کر سکتا تھا سو مشورے کے لیے وہیں چلا آیا تھا۔

''نہ تو مجھے بتا کہ تیرا کیا خیال ہے اس کا شوہر عین جوانی میں مر جائے گا وہ بیوہ ہو کر تیرے سامنے آئے گی اور تو اپنی پہلی نظر کی محبت کو خوشی خوشی اپنے گھر لے آئے گا۔'' اسد نے کہا اور دایان کے ہاتھ میں پکڑے ایش ٹرے کی چوٹ سے بچنے کے لیے سر نیچے کر لیا ایش ٹرے میں پستے کے چھلکے پڑے تھے جو قالین پر جگہ جگہ گر گئے تھے۔

ڈرائنگ روم اسد کا تھا اور ثمن سے اس کی شادی ہو چکی تھی اور شادی کا سب سے دردناک نتیجہ یہ تھا کہ ثمن کو صفائی کا فوبیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اسد کو بھی رگڑ رگڑ کر فنائل لگاتی اور دھو نے نچوڑنے کے بعد اسے چھت پر ڈال کر دھوپ میں سکھاتی اور پھر تہہ لگا کر الماری میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیتی۔ اسد خوف زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی جلدی قالین پر بکھرے پستے کے چھلکے چننے لگا۔

''تم دونوں کو شاید اندازہ نہیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ میں جانتا ہوں میں لاحاصل کی تمنا میں سب کو تکلیف دے رہا ہوں۔ لیکن یار تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہو کہ سب سے زیادہ درد تو میں خود سہہ رہا ہوں۔ مجھے اپنی خواہش کی شدت پر شرمندگی بھی محسوس ہوتی ہے ایک شادی شدہ لڑکی کے لیے ایسے جذبات، ایسی خواہش کوئی کمینہ انسان ہی رکھ سکتا ہے۔''

اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر ایسے جذبات تھے کہ دونوں دوستوں کے دل اس کے لیے دکھی ہو گئے۔

''یار ایسا ہوتا ہے اکثر کہ ہمیں لگتا ہے یہ انسان نہ ملا تو زندگی بے رنگ ہو جائے گی لیکن پھر آہستہ آہستہ زندگی کا پھیکا پن ختم ہونے لگتا ہے کچھ اور رنگوں سے جیون سج جاتا ہے۔'' یہ اسد بول رہا تھا جس سے شہوار جدا ہوئی تھی۔ وہ شہوار جو کبھی اس کی زندگی تھی اور اب وہ اس کے جانے کے بعد بھی زندگی کے بغیر زندہ تھا۔

☆☆☆

''جی دایان محمود بول رہا ہوں آپ کون؟'' وہ آفس میں بیٹھا تھا کہ ایک اجنبی نمبر سے کال اور پھر دوسری طرف سے لڑکی کی آواز میں ہیلو سن کر بولا۔

''آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟'' اس کی خوش فہمی کو ٹھیس لگی تھی۔ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے خوش گوار انداز میں بولی۔

''جی ہم دو بار مل چکے ہیں۔ جناب میرا نام گل لالہ عظیم خان ہے کچھ دن پہلے آپ ہمارے کالج میں مہمان خصوصی بن کر آئے تھے۔ تقسیم اسناد کی ایک تقریب تھی۔ میں بھی پوزیشن ہولڈرز میں شامل تھی اور پرسوں آپ نے ہم سب پوزیشن ہولڈرز کو اپنے گھر دایان محل میں انوائٹ کیا تھا۔ مزے دار کھانا اور پھر دایان محل کی سیر بھی کرائی تھی۔''

پہلی بار وہ کسی کو یوں یاد کرا رہی تھی ورنہ تو جو اس سے ایک بار مل لیتا۔ وہ اسے یاد کراتا کہ فلاں جگہ آپ کو دیکھا، فلاں کے پاس آپ کی پکچر تھی، فلاں کی شادی میں آپ پہلی روکی تیسری کرسی پر بیٹھی تھیں اور آپ کے ہاتھ میں موتیوں والا پاؤچ تھا وغیرہ وغیرہ۔

''اور دو ملاقاتوں کے بعد بھی اسے میں یاد نہیں عجیب آدمی ہے۔''

''اوہ مس! سوری مجھے اتنے سارے طلبا و طالبات میں سے آپ کیسے یاد رہ سکتی ہیں؟''

وہ دل ہی دل میں سخت چڑتے ہوئے بولی۔

''اتنے سارے؟ سر ہم صرف چھ لوگ تھے میرے علاوہ پانچ مزید لوگ جس میں تین لڑکے تھے

لڑکیاں صرف تین تھیں۔" وضاحت دیتے ہوئے اس کا جی چاہا کہے جو باقی دوا یویں سی نیلی پیلی لڑکیاں تھیں ان میں سے میں آپ کو یاد نہیں رہی؟ یعنی کہ میں گل لالہ عظیم خان؟"

"جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ ملک کا بہت بڑا صنعت کار ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل ورک کے سلسلے میں کافی مصروف رہتا تھا۔

"شاید آپ کو کچھ جلدی ہے؟" وہ اس کے رسمی سے انداز کو ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔

"آپ نے کام نہیں بتایا مس عظیم!"

"جی سر! آپ نے کہا تھا کہ آپ غریبوں کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں بشرطیکہ وہ حقیقی ضرورت مند ہوں۔ تو میرے گاؤں میں بہت غربت ہے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں اس بارے میں۔"

وہ جلدی سے بولی تو دوسری طرف سے سنجیدہ انداز میں پوچھا گیا۔

"مس عظیم خان! یہ ضرور ہے کہ میرے پاس وقت کم ہوتا ہے لیکن غریبوں کی مدد کے کسی بھی معاملے میں۔ میں ہر وقت۔ وقت دے سکتا ہوں۔"

"تو میں کب آؤں؟"

وہ شاید سیکرٹری سے شیڈول پوچھنے لگا تھا۔

"کل صبح گیارہ بجے آپ میرے آفس آجائیں۔ میں نے لکھوا دیا ہے کہ آپ سے ملاقات اہم ہے۔"

وہ چاہ رہی تھی کہ بات ختم نہ ہو بلکہ بات لمبی ہوتی جائے اور باتوں باتوں میں وہ اس کی پسند ناپسند پوچھے اس کی خوب صورتی کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور پھر ملنے پر اصرار بھی کرے۔ لیکن اس نے تو بات ختم کرتے ہی اگلے پل فون بند کر دیا تھا اور ایسا بھی پہلی بار ہو رہا تھا کہ اس سے گفتگو کرتے ہوئے فون دوسری طرف سے رکھا گیا تھا۔

وہ کڑوا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

"دیکھتی ہوں مسٹر دایان محمود آپ میں کتنا دم ہے آپ کو بے دم کر کے نہ چھوڑا تو میرا نام بھی گل لالہ عظیم خان نہیں۔"

☆☆☆

"مما! پلیز شادی کے علاوہ بھی تو کسی موضوع پر بات کریں نا۔" وہ ماں کے پاؤں دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو بیٹا! تمہارے باپ کی وفات کے بعد میں نے بڑی مشکل سے دل کو تمہارے ساتھ اور تمہارے لیے جینے پر راضی کیا تھا ورنہ تو وہ میری زندگی بھی ختم ہی کر گئے تھے۔ لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ اب کوئی اور بھی ہو اس گھر میں۔ میرے پوتے پوتیاں میری بہو اور......"

وہ ہنس پڑا۔

"سچ سچ بتا دو دانی! میں ماں ہوں تمہاری۔"

"کچھ نہیں ہے ایسا جو میں آپ سے چھپا سکوں۔" وہ نظریں چرا رہا تھا۔

"پھر کون ہے وہ شاہ گل بی بی جس کے لیے یوں خود کو اجاڑ رہے ہو؟"

ماں نے گھورا تو ان کی بات سن کر دایان محمود کی رنگت متغیر ہو گئی۔

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا، دونوں ہاتھ ماں کے گھٹنوں پر تو تھے لیکن لب ساکت تھے۔

"بولو نا اب چپ کیوں ہو؟"

وہ کیا کہتا خاموش ہی رہا۔

"شادی شدہ عورت سے عشق اور وہ بھی۔ محمود احمد اور شگفتہ محمود کے بیٹے کو؟ جانتے ہو نا تمہارے باپ کے کردار کی ایک زمانہ تعریفیں کرتے نہیں تھکتا اور تمہاری ماں نے جیسی تربیت کی ہے، اس کا حق ادا نہ کر سکے تم۔" وہ شرم سار ہو رہا تھا

"مما! دل نہیں مانتا، میں کیا کروں؟" وہ ماں کے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگا اور شگفتہ بیگم ہکا بکا سی اپنے باہمت بیٹے کی یہ دیوانگی دیکھنے لگیں

''اک شادی شدہ عورت کے لیے میرا دایان یوں سسک رہا ہے۔ کیوں اتنے کمزور پڑ گئے ہو دانی؟'' وہ افسردہ سی اس کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''مما وہ...... وہ میری وہی فرینڈ ہے، بچپن والی، لڑکپن والی، خوابوں والی۔''

ماں ساکت سی اسے دیکھے گئیں۔

''فرینڈ فار ایور؟'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولیں۔

''جی مما! وہی فرینڈ جس نے مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑا تھا اور اب وہ کسی اور کی ہوگئی ہے، وہ اجنبیت سے دیکھتی رہی اور مجھے پہچانا ہی نہیں۔ اور جب سے میں نے اسے دیکھا ہے، وہ میرے خواب میں بھی نہیں آئی۔ مجھے معاف کر دیں پلیز۔ لیکن جب تک میرا خود پر اختیار واپس نہیں آتا میں تب تک شادی نہیں کر سکتا۔ میں کسی لڑکی کے ساتھ منافقت والی زندگی نہیں گزار سکتا اور مما میں مکمل اس کے اختیار میں ہوں جسے میرے جنون کی خبر بھی نہیں۔'' ماں نے دکھ سے اسے دیکھا، سرخ متورم آنکھیں اور چہرے پر کشمکش کے تاثرات جیسے اسے خود سے کوفت ہو رہی ہو، وہ ڈر گئیں کہ جوان بیٹا کہیں ذہنی دباؤ کی وجہ سے کچھ الٹا سیدھا نہ کر دے۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا میرے بچے وقت بہت اثر انگیز مرہم ہے ہر زخم کا زخم بھر دیتا ہے۔''

وہ اپنی آنکھیں آستین سے رگڑتے ہوئے بولا۔

''محبت چوٹ ہے نہ گھاؤ محبت تو عطا ہے اور عطا کو شفا نہیں چاہیے ہوتی بلکہ شفا کے لیے عطا ضروری ہوتی ہے۔''

وہ ہنسنے لگیں۔

''بے وقوفی کی حد ہے ویسے ماں کے سامنے محبت کی تشریح کر رہے ہو۔ کوئی شرم ہوتی ہے۔ کوئی حیا ہوتی ہے بیٹا جی۔'' وہ بھی ہنسنے لگا۔

''چلو مٹی پاؤ مما جی۔''

دونوں بظاہر تو مسکرا دیے مگر دونوں اندر سے پریشان تھے۔

''اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو میں اسے تیری دلہن بنانے میں ایک پل نہ لگاتی بلکہ اس کے سامنے جا کر تیری محبت کی، تیری بے چینیوں کی ساری کہانی خود سنا دیتی۔''

وہ ماں کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر چکا تھا اور شگفتہ بیٹے کے الجھے بالوں کو سلجھاتے ہوئے سوچ رہی تھیں

کاش میں تیری الجھنیں بھی یونہی تیرے الجھے بالوں کی طرح سلجھا سکتی۔

☆☆☆

''بڑی تیار شیار ہو رہی ہو خیر تو ہے نا؟''

شاہ گل نے اسے معمول سے کہیں زیادہ تیار دیکھ کر پوچھا۔

وہ لمبے گھنے بالوں کو برش کرتے ہوئے مسکرا دی۔

''شاہ گل بو! سچ بتائیں میں زیادہ پیاری ہوں یا میری ماں زیادہ حسین تھی؟'' اس کے سوال نے شاہ گل کی رنگت متغیر کر دی تھی۔

''بچپن سے جب جب ماں کے بارے میں پوچھا ہے ہمیشہ آپ لوگوں نے چپ کی چادر میں خود کو چھپا کر میرے سوال سے خود کو بچا لیا ہے۔

لیکن آپ لوگوں کی طرح گم گل سادہ یا معصوم کوئی نہیں۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ مجھے ساری کہانی خاندان میں کہیں نہ کہیں سے معلوم ہو جائے گی۔ میں اچھی طرح سے جان چکی ہوں کہ میری ماں سے دادی کو خواہ مخواہ کا بیر تھا اور ان دونوں کی روز روز کی ان بن سے گھر کا ماحول اتنا خراب ہوا کہ بابا نے انہیں طلاق دے دی۔ جس کے بعد وہ گھر سے نکل گئیں اور دادی نے انہیں بیٹی یہ کہہ کر نہیں دی کہ ہمارے خاندان کی بیٹیاں طلاق یافتہ مائیں پالیں، یہ ہمیں گوارا نہیں۔'' گلابی ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتے ہوئے چپ ہوئی تو شاہ گل نے چپ کی چادر اتارتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''جس نے تمہیں یہ سب بتایا ہے اس سے پوچھو کہ میری ماں جیسی رحم دل اور وقار والی عورت پورے قبیلے میں کوئی دوسری ہے یا تھی تو اس کا نام بتا دے۔ تم خود کو سمجھ دار سمجھتی ہو لیکن ہو نہیں، کسی بھی ماں کے بارے میں جاننا ہو تو اس کی بیٹی کو دیکھ لو بیٹیاں ماؤں کا پرتو ہوتی ہیں بے وقوفوں کی رانی۔ تیری شاہ گل بو سے بھی کہیں اچھی تھیں تیری دادی۔''

وہ جذباتی ہو گئی تھی، کیسے سن لیتی ماں کی برائی۔

لیکن اس وقت حالات ایسے بن گئے تھے کہ ماں کی وصیت کے مطابق ان بہن بھائی نے پرخہ کی بے وفائی اور بے غیرتی پر پردہ ڈال کر گھریلو جھگڑوں کو وجہ طلاق بتا کر اٹھتی ہوئی انگلیوں سے جان بچالی تھی۔

پرخہ باہر سے بیاہ کر لائی گئی تھی خاندان میں کسی کو اس نے بھی منہ نہیں لگایا تھا اس لیے سسرالی فیملی سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

اور انہیں خبر ملی تھی کہ شادی کے بعد وہ لوگ کسی اور جگہ شفٹ ہو چکے ہیں۔ چونکہ پرخہ کے والدین مر چکے تھے اور وہ اکلوتے بھائی کے پاس رہتی تھی جو اس کی شادی کے بعد دوبئی شفٹ ہو گیا تھا اس لیے گل لالہ کا کوئی تعلق کسی ننھیالی رشتے سے بھی نہیں تھا لیکن بچپن سے وہ ماں کے بارے میں سوال پوچھتی تھی جس کا جواب ہمیشہ گہری چپ ہوتا کیونکہ سچ بہت تلخ تھا۔

''ایک تو پتا نہیں میرا باپ اتنی دولت کہاں لے کر جائے گا ایک ڈھنگ کا جوڑا نہیں میرے پاس۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

شاہ گل نے حیرانی سے بیڈ پر پڑے بیس پچیس ہینگر لگے سوٹوں کی طرف دیکھا اور کچھ نہ کہا۔

''تو شاہ گل بو! آپ نے کہا کہ بیٹیاں ماں کا پرتو ہوتی ہیں تو آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ میں بھی بالکل اپنی ماں جیسی ہوں۔''

''اللہ نہ کرے۔''

وہ بے اختیار کہہ گئی گل لالہ نے اسے گھورا۔

''اتنی بری تھی میری ماں؟''

''یہ بات نہیں گل لالئی! تربیت تو تمہاری میں نے کی ہے نا؟''

وہ نازک سا کپڑوں سے میچ پاؤچ ہاتھ میں پکڑے کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''خدا نہ کرے کہ میں آپ پر جاؤں آپ جو عظیم خان کی لاڈلی بہن ہی نہیں خود بھی عظیم ہیں کیونکہ آپ نے اپنی بن ماں کی بھتیجی کو ماں بن کر پالنے کے لیے ساری عمر اچھے سے اچھا رشتہ ٹھکرا دیا اور ہمیشہ کہا کہ میری زندگی کا مقصد اس بچی کی اچھی تربیت کرنا ہے۔'' وہ جاتے جاتے مڑی۔

''بابا پوچھیں تو آپ بتا دینا کہ اپنی سوشل ورکر دوستوں کے ساتھ ایک شہزادے کے محل جا رہی ہوں جہاں کچھ غریبوں کے مسائل پر بات ہو گی۔'' وہ جواب سنے بغیر نکل گئی۔

اور شاہ گل حیرانی سے سوچنے لگی۔ ''تمہیں تو غریبوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے، تمہیں کیا خبر ان کے مسائل کی اور غریبوں کے مسائل شہزادے کے محل میں کیا کر رہے ہیں؟''

☆☆☆

''میں ہوں گل لالہ عظیم خان!'' اس نے دایان محمود کے کھڑے ہو کر استقبال کرنے پر اپنا تعارف یوں کرایا جیسے کہہ رہی ہو۔

''مجھ سے ملیں مسٹر دایان محمود! میں اس دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہوں۔''

اس کے ساتھ دو کلاس فیلوز تھیں گو اتنی عام شکلوں کی مالک نہیں تھیں جتنی اس کے ساتھ بیٹھی لگ رہی تھیں وہ تو ویسے بھی سب میں نمایاں نظر آتی تھی لیکن آج تو اس کی تیاری بھی عروج پر تھی اسی لیے ستاروں میں چاند کی طرح نمایاں اور روشن لگ رہی تھی لیکن دایان محمود نظریں اٹھاتا تو یہ چاند تاروں کا فرق اسے دکھائی دیتا، وہ تو سامنے رکھی تفصیلات

پڑھنے میں محو تھا۔
جن دونوں کو وہ ساتھ لائی تھی، وہ سوشل ورک کرتی تھیں اور بڑی سنجیدگی سے علاقے کے غریبوں کی مدد کے لیے ہر مشکل سے گزرنے کے لیے تیار بھی رہتی تھیں زمینی حقائق سے بھی بخوبی آگاہ تھیں۔ لیکن انہیں اچھے خاصے فنڈ کی لالچ دے کر چپ رہنے اور خود ہی بولنے کا معاہدہ طے کر کے ہی وہ ان کے ساتھ آئی تھی اور اب چہرے پر دکھ کے تاثرات طاری کیے وہ بول رہی تھی۔
وہ چند سیکنڈ اس کی بات سنتا رہا اور پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"مس خان! تو آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس علاقے میں مفت علاج معالجے کی سہولیات تو میسر ہیں کچھ فلاحی اداروں اور مخیر حضرات کی طرف سے۔ لیکن موت کی صورت میں غریب لوگوں کے لیے بہت مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ کفن دفن قبر کی کھدائی اور مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے گھر میں پڑی میت کو بھول کر لوگ کئی بار تو آدھی آدھی راتوں کو آس پڑوس کے گھروں کے دروازوں پر دستک دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں ہمیں ان کے لیے کچھ کرنا ہوگا کہ......" وہ دھیان سے اس کی بات سننے کی اداکاری کرتے ہوئے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"تو آپ کے فیلڈ ورک کا تخمینہ کیا کہتا ہے۔ کہ ایک میت کے کفن دفن اور دیگر چیزوں پر کتنا خرچا آتا ہے؟" وہ گہری سنجیدگی سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا
"جی میں نے معلومات حاصل کر کے تخمینہ لگایا ہے تقریباً تین لاکھ بنتے ہیں میت کے پہلے دن کے۔" اس نے جھٹ سے بنا سوچے سمجھے بول دیا۔
وہ حیرانی سے منہ کھولے اسے دیکھنے لگا اس کی حیرانی دیکھ کر وہ گڑبڑا سی گئی کہ شاید کچھ غلط بول دیا ہے
"سوری جناب جلدی میں...... میں نے کم پیسے بتائے ہیں چار لاکھ لگتے ہیں ایک غریب گھرانے کی میت کے پہلے دن۔" دونوں لڑکیاں بھی اسے دیکھتے ہوئے پریشانی سے پہلو بدل رہی تھیں۔
"مس خان! ایک قبر کے بنانے میں پانچ سو سے سات سو اینٹیں لگتی ہیں۔
اور کفن دفن پر بھی چند ہزار۔ رہ گیا کھانا اور دیگر چیزیں تو سب ملا کر تقریباً پچاس ساٹھ ہزار روپیہ لگتے ہیں۔ آپ سے اس بچکانہ حرکت کی توقع نہیں تھی شکل سے تو آپ کافی سمجھدار لگتی ہیں۔" اس کے بڑی محنت سے پیازی کیے گئے گال تپ کر احساسِ توہین سے جلنے لگے تھے۔
دل ہی دل میں وہ غرائی۔
"مسٹر پرفیکٹ میں شکل سے صرف سمجھدار لگ رہی ہوں؟ حسین ترین، پری چہرہ، خوش جمال و با کمال کچھ نہیں؟"
اس نے سامنے رکھے سنہرے ڈیکوریشن پیس پر لگے ایک بٹن کو دبایا تو ایک بھاری بھرکم خاتون ہانپتی کانپتی اندر آ گئیں۔
"مینو آنٹی! آپ کا وزن اور کولسٹرول روزانہ کی بنیاد پر بڑھتا جا رہا ہے۔ مہمانوں نے کچھ کھایا ہے؟" وہ آنٹی صاحبہ کھانے کی تفصیل بتانے لگیں۔
"ٹھیک ہے۔ اب ایسا کریں کڑک قسم کی چائے بنا کر لائیں دماغ کی دہی جم گئی ہے آج تو۔" وہ سمجھ گئی کہ اسے ہی سنا رہے ہیں۔
"جی نہیں سر ہم چائے نہیں پئیں گے۔" وہ جلدی سے بولی تو دایان نے اس جلد باز لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔
"چائے میں اپنے لیے منگوا رہا ہوں۔" احساسِ توہین سے اس کے گال پھر سے تپ گئے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی دایان نے کہا۔
"آپ لوگوں کے لیے کھانا ڈائننگ ہال میں لگ گیا ہے پلیز کھانے کے لیے تشریف لے جائیے۔"

ایک نوکر انہیں اندر کی طرف لے جانے لگا۔

اسی اثنا میں مینو آنٹی اندر آتی دکھائی دیں۔

"مینو آنٹی آپ کھانے کے بعد انہیں اپنے محلے میں لے جائیں پلیز۔ اور آج جن کی میت کی قُل تھی آپ انہیں اس آدمی کے گھر ضرور لے کر جائیں ان کی بیوہ سے ملوانے کے لیے تاکہ یہ زمینی حقائق سے واقف ہو جائیں پھر بات آگے بڑھائی جائے گی۔" وہ وہیں کھڑی تھی اور دایان محمود باہر نکل چکا تھا

کھانے کے بعد وہ تینوں مینو آنٹی کے ساتھ ان کی بستی کے لیے نکلیں تو باہر گل لالہ کا ڈرائیور کھڑا تھا۔

وہ تینوں ان کی تقلید میں ایک گندے سے پھٹے پرانے پردے کے پیچھے دروازے پر کھڑی تھیں پہلی بار وہ ایسی کسی جگہ پر کھڑی تھی، جہاں جگہ جگہ ننگ دھڑنگ بچے گندی نالیوں سے ابلتے پانی میں کھیل رہے تھے، قریب ہی کوڑے کا ڈھیر تھا۔

"مینو باجی اندر آجائیں۔" دروازے کے پیچھے کھڑی وہ درمیانی عمر کی خاتون تھیں جو سامنے آنے پر ان کا استقبال ایک حیرانی بھری نظر سے کر رہی ہیں۔

"مینو باجی! کون ہیں یہ؟" وہ انہیں اندر آنے کا کہہ کر آگے چل پڑی تھی اور اب سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ گل لالہ نے ناک پر ٹشو پیپر رکھا ہوا تھا کراہیت کا شدید احساس اسے یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر رہا تھا لیکن باقی دو کو بالکل نارمل حالت میں دیکھتے ہوئے وہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔

"بیٹا! غریبوں سے ایسی نفرت غرور میں آتی ہے اور غرور بڑی بری چیز ہے۔ انسانوں کو برباد کر دیتا ہے۔" اور کوئی وقت ہوتا تو وہ اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو دو چار سنا دیتی لیکن اس وقت اسے یہ ڈر تھا کہ اگر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو منہ میں وہ جراثیم چلے جائیں گے جو صحن میں پڑے گندے برتنوں پر بھنبھناتی مکھیوں کے منہ سے یقیناً نکل رہے ہوں گے۔

مینو آنٹی نے تعارف کرایا۔ "یہ لڑکیاں صاحب جی کے پاس غریبوں کے لیے چندہ مانگنے آئی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ تم سے ملاؤں کچھ سوال پوچھنے ہیں تم انہیں جواب دو میں اتنی دیر میں چھنو آپا کا حال احوال پوچھ آتی ہوں۔" وہ بمشکل تمام بھاری بھرکم جثے کو تقریباً کھینچ کر اٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" گل لالہ نے جلدی سے سوال پوچھنے شروع کر دیے دایان محمود کی نظروں میں خود کو غریب پرور اور زمینی حقائق سے آگاہ ثابت کرنا تھا ورنہ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ایسی جگہ بھی جائے گی۔

"جی میرا نام پرخہ گل ہے۔" ہڈیوں کے ڈھانچے نے نام بتایا تو گل لالہ نخوت بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نام رکھتے ہوئے اپنے ماحول اپنے رہن سہن وغیرہ کی طرف دیکھ لینا چاہیے۔ میری ماں کا نام بھی پرخہ گل تھا لیکن وہ بہت خوب صورت تھیں یہ نام ان پر بجتا بھی تھا جیسے میرا نام مجھ پر بجتا ہے۔" وہ منہ کھولے اس کی بات سن رہی تھی۔

"افسوس آپ نے کھنڈر دیکھا ہے محل نہیں۔ لیکن ذوق نظر رکھنے والے کھنڈر دیکھ کر محل کی خوبصورتی کا اندازہ ضرور لگا لیتے ہیں۔"

وہ شاید انڈین ڈراموں کی شوقین تھی۔

گل لالہ نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

"چند دن پہلے آپ کے شوہر فوت ہوئے تو آپ نے قبر کفن دفن اور دیگر اخراجات کا حساب ضرور رکھا ہوگا تو کتنا خرچا ہوا تھا پہلے دن کا؟" وہ دونوں لڑکیوں کو چپ دیکھ کر پوچھنے لگی وہ دونوں تو اچھی طرح سے جانتی تھیں کیونکہ فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں

"ہاں، ہم غریبوں کے ہاں سب کچھ حساب کتاب سے ہی ہوتا ہے چالیس ہزار میں سب کچھ

ہو گیا تھا اللہ بھلا کرے دایان صاحب کا انہوں نے سب کیا ورنہ تو میں کفن دفن بھی نہ کر پاتی اور محلے کے لوگ سب غریب ہیں، کسی کی مدد کے لائق نہیں۔" وہ دونوں گل لالہ کی طرف دیکھنے لگیں جو شرمندگی کے تاثرات چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔

"بی بی آپ کا شوہر کام کاج نہیں کرتا تھا اور بچے کتنے ہیں؟"

اب دونوں لڑکیاں ہسٹری لے رہی تھیں۔

"شوہر نشئی تھا، پہلے چرس پھر افیون اور شراب کا عادی ہوا اور اب آئس پیتا تھا، سنا ہے ہر نشے کی کیفیت الگ ہوتی ہے لیکن سچ کہوں تو ہر نشے میں مرد بیوی پر ہاتھ ضرور اٹھاتا ہے شاید نشہ مردانگی کو مار دیتا ہے کیونکہ جو مرد ہوتے ہیں وہ بڑی بڑی خطائیں بھی معاف کر دینے کا ظرف رکھتے ہیں، چائے ٹھنڈی ہونے اور روٹی گول نہ ہونے کا بہانا بنا کر مارتے نہیں ہیں۔"

گل لالہ نے بیزاری سے اسے دیکھا اور انگلش میں کلاس فیلوز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آج کل ہر جاہل اور ان پڑھ عورت ڈرامے دیکھ دیکھ کر ڈائیلاگ مارنا سیکھ چکی ہے، گھر میں کفن دفن کے پیسے نہیں ہوں گے لیکن کیبل اور ٹی وی ضرور ہوگا مجھے اس کے ڈائیلاگ ذرا اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔" وہ دونوں مسکراہٹ چھپا گئیں۔

پرخہ گل نے تلخی بھری نظروں سے اسے گھورا اور انتہائی غیر متوقع طور پر شستہ انگریزی میں بولی۔

"آپ کسی کو ایک پل میں کتنا جان سکتی ہیں۔ یہ ڈائیلاگز نہیں ہیں وہ زندگی ہے۔ جو آپ دور سے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں اور ہم گزار رہے ہیں مس گل لالہ!"

وہ شستہ انگریزی میں بول رہی تھی تینوں اتنے خوب صورت لب و لہجے میں فر فر انگریزی سن کر ساکت سی ہو گئی تھیں اور ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگیں۔

"آپ پڑھی لکھی ہیں؟" گل لالہ نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا تو وہ افسردگی سے بولی۔

"ہاں! ماسٹر کیا ہے انگریزی میں۔"

اب تو اچھلنے کی باری تینوں کی تھی۔

"ماسٹر ہولڈر خاتون اس حال میں کہ شوہر کے کفن دفن کے پیسے بھی نہ ہوں اور اس میں اور ان پڑھ لوگوں میں کوئی فرق بھی نظر نہ آتا ہو؟" وہ واقعی حیران تھیں۔

"وہ نشہ کرتا اور کہتا میرے لیے کما کر لاؤ، مینو آپا کے توسط سے بڑی مشکلیں جھیل کر جاب ملی تھی، شاید آپ لوگ جانتے نہیں کہ میں دایان صاحب کے ادارے میں کام کرتی ہوں۔ کمائی وہ نشے میں اڑا دیتا تھا دن کو کارخانے میں کھانا مل جاتا تھا، اسی پر اکتفا کرتی اور دوسرے دن آفس میں کھانے تک بھوکی رہتی اسی طرح کئی سال گزارے ہیں۔" وہ چپ ہوئی تو گل لالہ نے پوچھا۔

"طلاق کیوں نہیں لی طلاق یا خلع لے کر اس سزا جیسی زندگی سے خلاصی حاصل کر لیتیں۔"

وہ کرب انگیز نظروں سے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پھیلا کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں سزا سے خلاصی نہیں چاہتی تھی کیونکہ میں نے ایک نہیں کئی جرم کیے ہیں بلکہ جرم لفظ تو چھوٹا اور بے معنی ہے میں نے گناہ کیے ہیں اور بہت بڑے بڑے گناہ......"

وہ تینوں اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو بغور دیکھنے لگی تھیں، اندر دھنسی ہوئی آنکھیں زرد رنگت متورم آنکھوں میں۔ مکمل ویرانی، پپڑی جمے ہونٹ اور خشک اور اجڑے ہوئے بال مجموعی طور پر وہ حسرت و یاس کی مکمل تصویر تھی۔

"مجھے گھٹن محسوس ہو رہی ہے، چلو چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

مینو آنٹی انہیں باہر مل گئی تھیں۔

"ہو گیا کام؟"

"جی، ہم چلتے ہیں۔"

"پرخہ گل نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ کینسر میں مبتلا ہے؟ اور کینسر بھی جگر کا۔ شوہر نے لاتیں ماری تھیں جس کی وجہ سے اندورنی چوٹیں آئیں اور وہ چوٹیں رفتہ رفتہ گہرا زخم اور پھر ناسور بنتی رہیں۔ جب تشخیص ہوئی تو آخری اسٹیج تھی لیکن اس حال میں بھی شوہر اسے مارتا کہ کما کر لاؤ، یہ تو بھلا ہو میرے صاحب کا کہ دوا دارو اور خرچ دے دیتے ہیں۔۔ ورنہ تو یہ دونوں میاں بیوی بھوکے مر جاتے۔"

وہ افسوس سے سر ہلانے لگیں۔

جاتے جاتے گل لالہ نے جانے کیوں پلٹ کر دیکھا اور دروازے میں کھڑی اس عورت نے جو پرخہ گل نام بتا رہی تھی، بھیگی بھیگی آنکھوں سے انہیں خدا حافظ کہا۔

اس دن وہ عجیب بے نام سا بوجھ دل پر لے کر گھر لوٹی تھی۔

☆☆☆

سرمد کی شادی طے پا گئی تھی اور وہ دونوں اپنے جگری دوست کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔

"مما آپ اپنی پسند کی چیزیں دیکھیں، میں اپنے لیے کچھ دیکھتا ہوں۔" وہ شاپنگ مال میں تھے دایان نے دیکھا، ایک پیاری سی بچی گلابی فراک اور ہم رنگ ہیئر بینڈ سنہری بالوں میں لگائے اس کے قریب سے گزری تو اسے بچی کی شکل کچھ مانوس سی لگی۔

وہ مڑ کر محبت بھری نظروں سے بچی کی طرف دیکھنے لگا۔

"گل لالہ! آرام سے گڑیا، گر جاؤ گی۔" اسے پیچھے سے آواز سنائی دی اور اس کے قدم اسپتال میں جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے بالکل ویسا ہی حال اب بھی ہو چکا تھا

"پلیز، راستہ دیجیے۔" وہ اس کے مقابل کھڑی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ؟" اس کی آنکھوں میں آشنائی کی چمک دیکھ کر دایان کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھل سی گئی تھی

"شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ آپ سے کچھ عرصہ پہلے ہاسپٹل میں ملاقات ہوئی تھی، میرے ساتھ گل لالہ تھی میری بھتیجی۔ جو بہت بیمار تھی بلکہ بے ہوش تھی اور آپ کی تسلی سے میرے ہوش و حواس بحال رہے تھے۔" وہ بول رہی تھی اور دایان محو دا سے دیکھے جا رہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ شاید برا مان گئے ہیں۔ میرے یوں روکنے پر، سوری اصل میں مجھے کچھ عرصہ پہلے والا وہ لمحہ یاد آ گیا تھا جب میں بالکل اکیلی تھی۔" وہ خفت سے بولی تو دایان نے سر تیزی سے نفی میں ہلایا۔

"مس شاہ گل! صرف کچھ عرصہ نہ کہیں۔ دو سال تین مہینے تیرہ دن اور ساڑھے چار گھنٹے پہلے کی بات ہے یہ۔" اب ششدر ہونے کی باری شاہ گل کی تھی

"یہ بچی آپ کی کون ہے؟"

وہ پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطرے اپنی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"میرے لالہ کی بیٹی ہے میری بھتیجی۔"

"یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟" وہ بے اختیار تیز لہجے میں کہہ گیا۔

"جی؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھی۔

وہ کہنا چاہتا تھا۔ "میں نے ہر پل وہ اذیت سہی ہے جو پھانسی پر لٹکا وہ مجرم سہتا ہے جو مجرم نہیں فقط ملزم ہوتا ہے۔ بنا قصور کے سزا پانے والے ہی اس اذیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ تمہیں جب جب سوچتا تھا ایک کسک سی دل میں جاگتی تھی ایک احساس ندامت کچوکے لگاتا تھا، محبت میں ندامت کی ملاوٹ اس کا ذائقہ کڑوا کر دیتی ہے مگر یہ کڑوا گھونٹ ہر صورت پینا ہی پڑتا ہے۔"

"دایان کیا ہو رہا ہے بیٹا؟" وہ چونک گیا مخاطب ماں تھی۔

ان کی آواز سنی تو وہ مڑا۔
"السلام علیکم۔" وہ ڈیسنٹ سی خاتون کو سامنے دیکھ کر گڑبڑا گیا تھا۔ دایان محمود نے دیکھا اس کی مما اسے بغور دیکھتے ہوئے محبت بھری مسکراہٹ لبوں پر سجا چکی تھیں۔
"تم شاہ گل ہو نا بیٹا؟"
"آپ...... آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟" وہ حیرانی سے بولی۔
شگفتہ بیگم نے دایان کی آنکھوں میں اور پھر انگلیوں کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ "ان آنکھوں میں تمہیں بارہا دیکھ چکی ہوں جو میرے بیٹے کی ہیں اور ان انگلیوں نے کئی بار تمہاری تصویر بنائی ہے جن کا لمس مجھے زندگی کی خوبصورتی کا احساس دلاتا ہے۔"
"بس پہچان لیا۔ کیسے؟ اس سوال کا جواب وقت آنے پر ملے گا اور نہ ملا تو سمجھ لینا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔"
وہ گل لالہ کو گود میں اٹھا چکی تھی اور عظیم خان کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے کچھ شاپرز ہاتھ میں لیے ادھر آ رہے تھے۔
"بیٹا! تم کہیں سے بھی اس بچی کی ماں نہیں لگ رہی ہو یہ کون ہے تمہاری؟" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ بول پڑا۔
"مما! یہ ان کی بھتیجی ہے۔" اس کی آواز کی مٹھاس میں خوشی کی مقدار کا اندازہ لرزش سے لگایا جا سکتا تھا۔
"گل لالئی! وہ دیکھو بابا آ رہے ہیں" بسورتی بچی کو بہلانے کے لیے اس نے عظیم خان کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی اور شگفتہ بیگم وقت ضائع کیے بغیر تیزی سے عظیم خان کی طرف بڑھیں۔ شاہ گل حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی چند لمحوں بعد عظیم خان نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکالا اور انہیں دے دیا۔
"آپ کو یہاں دیکھ کر جو خوشی ہوئی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خوشی یہ جان کر ہوئی ہے کہ آپ شادی شدہ نہیں ہیں۔" اس کے یوں کہنے پر وہ دایان کو گھورنے لگی۔
"آپ سے کس نے کہہ دیا ہے کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ گل لالہ میری بھتیجی ہے۔ شادی کا تو آپ نے پوچھا ہی نہیں تو بتاتی کیسے؟" اس کی رنگت اتنی تیزی سے بدل کر متغیر ہوئی کہ وہ اس کی حالت کے پیش نظر مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔
"بیٹا! آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ آپ سے مل کر مجھے کیسی خوشی ہوئی ہے۔ چلو بیٹا چلتے ہیں ان ان شاء اللہ جلدی ہم اپنی بیٹی کے گھر آئیں گے۔" شگفتہ نے اسے گلے سے لگا کر محبت سے کہا تو وہ دونوں بہن بھائی حیران پریشان ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

☆☆☆

"دایان محمود! میں نے آج تک جو چاہا ہے وہ ضرور حاصل کیا ہے اور تم چاہے کتنا بھی مجھ سے بھاگو میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گی۔" اس نے ٹی وی بند کر کے ریموٹ صوفے پر اچھال دیا۔ ٹی وی پر ایک پروگرام میں وہ صنعت کاروں کے حق میں بول رہا تھا جن پر کچھ نئے ٹیکس لاگو ہوئے تھے جن سے کاروباری طبقے کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا اور اب کئی جگہوں پر ہڑتالیں ہنگامے وغیرہ شروع ہو چکے تھے۔
وہ بول رہا تھا اور گل لالہ عظیم خان اس کی باتیں سننے کے بجائے اس کی بولتی آنکھوں میں کھوئی ہوئی تھی۔
"کیا ہو رہا ہے شہزادی؟" شاہ گل نے پوچھا تو وہ چونک گئی۔
"شہزادی خواب دیکھ رہی ہے اک شہزادے کے۔" وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولی تو شاہ گل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
"اچانک یہ معاملہ الٹا کیسے ہو گیا ہے؟ تم تو کہتی تھیں کہ تم وہ خواب ہو جس کی تلاش میں تعبیریں قافلوں کی صورت پھرتی رہتی ہیں اس طرح تو

شہزادے کو شہزادی کا خواب دیکھنا چاہیے؟"
"شہزادے کو بھی یہ ہی گھمنڈ ہے کہ تعبیریں اس کی آنکھوں کے خواب ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ سچ کہوں تو وہ شہزادہ کچھ زیادہ ہی شہزادہ ہے۔" وہ شریر ہوئی

"تو اسے خبر نہیں کہ تم بھی صرف شہزادی نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی شہزادی ہو؟" شاہ گل نے بھی شرارت سے کہا۔

وہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے بولی۔

"اک بات پوچھوں شاہ گل بو؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور گل لالہ نے اس کے شانے پر سر رکھتے ہوئے وہ سوال کیا جو وہ اکثر کرتی آئی تھی۔

"میری مما سے آپ سب کا رشتہ ٹوٹا تھا نا؟ پھر وہ میرے لیے کیوں اجنبی ہو گئی ہیں۔ ان کو میری یاد کیوں نہیں آتی اگر وہ بابا سے، بی بی جان سے ڈرتی ہیں تو پھر بھی چھپ کر مجھ سے ملنے آسکتی تھیں۔ ایسا کیوں نہ کیا انہوں نے؟"

"ویسے میں نے تمہیں کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ لیکن حیران ہوں کہ آج اچانک تم اتنی کچھ دار کیسے ہو گئیں؟" وہ اپنی پریشانی چھپا کر شریر ہوئی۔

"بس شادی کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے اور ایسے موقعوں پر ماں کی یاد تو آتی ہے نا؟" اس کا یوں کہنا شاہ گل کو حیران و پریشان کر گیا۔

"ماں کے علاوہ بھی کچھ لوگ تمہارے لیے اہم ہونے چاہئیں وہ لوگ جن کے لیے تم اور تمہاری خوشی دنیا میں سب سے زیادہ اہم ہے۔"

اس نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھ کر کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

"ارے ابھی تو یہ صرف میرا فیصلہ ہے۔ دوسری طرف تو ایسا کوئی سین نہیں ہے۔ جب دوسری طرف بھی آگ لگے گی تب میں سب کو بتاؤں گی۔"

وہ تفصیلات پوچھتی رہی کہ کون ہے وہ؟ لیکن گل لالہ نے ہنس کر ٹال دیا۔

☆☆☆

"آپ یہاں؟" وہ کل سے اس لمحے کی قید سے حیرانی کے تاثرات کے ساتھ نکلنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

اس کے سنہرے خوابوں حسین خیالوں اور امیدوں کو وقت نے اپنی مٹھی میں قید کر کے کچی عمر میں صبر قناعت اور قربانی اس کے پلو سے باندھ دی تھی۔ جب چند دن کی گل لالہ روتی تو وہ جھولتے ہوئے نیند سے اٹھ کر اپنے ہی غم میں ڈوبے بھائی کو ٹیرس پر سگریٹ کے دھوئیں کے اس پار سے دیکھتی اور ٹھنڈی آہ بھر کر اس کا فیڈر بنانے لگتی۔

"جی، میں نے بہت انتظار کیا ہے اب درمیان میں پوری رات تھی۔ آپ نہیں جانتیں، انتظار کی راتیں بہت لمبی ہوتی ہیں۔"

وہ بول رہا تھا اور شاہ گل اس کے پیچھے آتی شگفتہ بیگم کو دیکھ کر مزید حیران ہوئی۔ اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا اور ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھ گئی۔

"لالہ! ڈاکٹر صاحب اور ان کی والدہ آئی ہیں، آپ کہاں ہیں؟" وہ دونوں اس کے ڈاکٹر صاحب کہنے پر مسکرانے لگے۔

"جی۔ آپ لوگ بیٹھیں پلیز۔ لالہ قریب ہی ورک شاپ تک گئے ہیں ابھی آتے ہیں۔"

وہ اسے دیکھے جا رہا تھا اور اس کی نظروں کی تپش سے شاہ گل کے گال تپنے لگے تھے۔

"بیٹا تمہارے بھائی کے آنے سے پہلے چند باتیں کرنی ہیں تم سے۔ اجازت ہے؟"

وہ ان کے یوں پوچھنے پر شرمندہ ہوئی۔

"جی آپ جو کہنا چاہتی ہیں بلا جھجک کہیں۔ آنٹی۔"

وہ ہمہ تن گوش تھی۔

"سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی کہ یہ ڈاکٹر ہے،

ختم ہونی چاہیے۔ بیٹا یہ میرا جگر گوشہ محمود صاحب کے بہت بڑے بزنس کا اکلوتا مالک ہے دایان محمود۔ یہ ڈاکٹر واکٹر نہیں، ہاں اس کے جگری دوست دونوں ڈاکٹر ہیں جن سے ملنے یہ ہاسپٹل گیا تھا جہاں تمہیں غلط فہمی ہوئی اور اس نے وضاحت نہیں دی یا غلط فہمی دور نہیں کی کیونکہ بقول اس کے تمہیں ڈاکٹر کی تسلی سے ہی اطمینان ہو سکتا تھا جس کی اس وقت اشد ضرورت تھی۔ تمہاری اور دایان کی اتفاقی ملاقات دو بار ہوئی ہے لیکن یہ پہلے دن سے ہی یہ طے کر چکا تھا کہ جس لڑکی کا اسے انتظار تھا وہ تم ہی ہو۔"

وہ منہ کھولے سن رہی تھی اور دایان دلچسپی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اسی وقت عظیم خان کمرے میں داخل ہوئے۔

"معذرت چاہتا ہوں کہ میں کچھ لیٹ ہو گیا۔ اصل میں آپ کی آمد کی اطلاع نہیں تھی۔"

اتنا تو وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ لوگ رشتے کے لیے ہی آئے ہیں۔

اور رات شاپنگ مال سے واپس آتے ہوئے انہوں نے باتوں باتوں میں غیر محسوس انداز اختیار کرتے ہوئے بہن سے یہ ضرور پوچھ لیا تھا کہ تم ان لوگوں کو کس طرح جانتی ہو؟

عظیم خان کی نظروں نے دایان محمود کی وارفتگی دور سے دیکھی تھی لیکن بہن کے معصوم چہرے پر ایسی کوئی کیفیت انہیں دکھائی نہیں دی تھی اس لیے انہیں یہ اطمینان تو تھا کہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے لیکن جب شگفتہ محمود نے اپنا تعارف کرایا تو وہ انہیں پہچان گیا تھا اور کاروباری طبقے میں شاید ہی کوئی ان سے انجان تھا۔

"کوئی بات نہیں بھائی صاحب! ہم تو سوالی ہیں اور سوالی اس وقت تک دروازے پر آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں جب تک گھر والے ان کے خالی کشکول میں کچھ ڈال نہ دیں۔"

ان کی عاجزی عظیم خان کو بہت اچھی لگی تھی۔

وہ اٹھ کر اندر جا چکی تھی اور اب کچن میں کھڑی ہو کر اپنی نگرانی میں چائے بنوا رہی تھی۔

"بو! مجھے گودی میں اٹھا لو۔" وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹی اپنی توتلی زبان میں کہہ رہی تھی۔

"جرمنے ترور! آپ چائے بنائیں میں ذرا کپڑے بدل لوں اور ہاں، میرے آنے تک گل لالئی کا خیال رکھنا۔" وہ اندر چلی گئی۔ وہ ابھی رات سونے کے کپڑوں میں ہی ملبوس تھی کہ وہ لوگ آ گئے تھے۔

اسی لیے کپڑے بدل کر شال سلیقے سے کندھوں پر ڈالی۔ کمرے سے نکل رہی تھی کہ گل لالہ کے رونے کی آواز سن کر وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھی اور سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے ہوش ہی اڑ گئے۔ جرمنے ترور کے ہاتھ میں چھری تھی اور وہ ننھی گل لالہ پر وہ چھری تانے کھڑی تھی جس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ ڈر کے مارے اپنی سسکیوں پر کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی جس کی وجہ سے ہلکے ہلکے جھٹکے کھا رہی تھی۔

"چپ کر جاؤ تم تو مصیبت بنی ہوئی ہو میرے لیے، اپنی ماں تو چھوڑ کر بھاگ گئی اور مصیبت ہمارے گلے میں ڈال گئی۔ شاہ گل نہ ہوتی تو میں تیری بوٹیاں بنا کر تاج کو ڈال دیتی، اپنے پھول جیسے بچے چھوڑ کر آتی ہوں یہاں تیرے نخرے اٹھانے اب چپ ورنہ اس چھری سے ذبح کر دوں گی اگر تم نے چوں چاں کی۔" یہ سب سن کر اور گل لالہ کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اس نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا اور بظاہر نارمل انداز میں کچن کے اندر آ گئی۔

"ترورے! آپ چائے اندر لے جائیں۔"

اس کے جانے کے بعد وہ اسے گود میں اٹھائے کمرے میں آ گئی۔

"کیا ہوا میرے بچے کو؟" شاہ گل نے اس کی پیشانی چوم کر پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میری گڑیا پر کوئی غصہ تو نہیں کرتا؟" اس نے موٹے موٹے آنسو بہاتے ہوئے پھر نفی میں سر ہلایا

تو وہ سمجھ گئی کہ اتنی سی بچی بھی خوف زدہ ہو کر بات چھپا سکتی ہے۔

شاید یہ فیصلے کی گھڑی تھی پہلا فیصلہ جرمنے ترور کو نوکری سے نکالنا تھا اور دوسرا مشکل ترین فیصلہ اس کے لیے بالکل مشکل نہ رہا۔ وہ کشمکش کے بھنور سے نکل کر فیصلے کے ساحل تک پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

"لالہ! ان کو انکار کر دیں۔ میں نے تب تک شادی کے بارے میں نہیں سوچنا جب تک گل لالہ اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو عظیم خان پریشان ہو کر بہن کی طرف دیکھنے لگے۔

"وہ بڑی چاہت سے مانگ رہے ہیں اور ایسے لوگ ہیں کہ ہم ان کے سامنے کچھ نہیں۔ میری گڑیا وہ تجھے شہزادی بنا کر رکھیں گے، ہر لحاظ سے تیرے قابل ہیں وہ لوگ۔ جیسی میری بہن ویسا ہی دایان محمود بھی ہے۔ رہی گل لالہ تو وہ میری ذمہ داری ہے۔ میں اسے سنبھال لوں گا تم اس کے لیے اپنی اور اس لڑکے کی زندگی کیوں خراب کرتی ہو؟"

عظیم خان ان ماں بیٹے کی خواہش کی شدت محسوس کر چکے تھے اور انہیں اپنی بہن کی خوشیاں اپنی خود غرضی کی بھینٹ نہیں چڑھانی تھیں۔

"لالہ! آپ نہیں جانتے کہ گل لالہ کو میری کتنی ضرورت ہے۔ آپ اگر شادی بھی کرلیں۔ میں تب بھی اسے سوتیلی ماں کے سپرد کر کے نہیں جاؤں گی۔ مجھے مجبور نہ کریں کیونکہ مجبوری کے رشتے کا انجام آپ دیکھ چکے ہیں۔ کل کو کئی زندگیاں خراب کرنے سے آج کی وقتی تکلیف بری نہیں ہے۔"

وہ دھن کی پکی تھی، کسی طرح بھی قائل نہیں ہو رہی تھی۔

عظیم خان خاموش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ شاہ گل ضد کی کتنی پکی ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کو وہ خود چلا آیا تھا۔ نوکر نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا۔ شاہ گل بڑی خود اعتمادی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"بیٹھ جائیں پلیز۔" وہ اس کے مقابل کھڑا تھا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ انکار کی وجہ کیا ہے؟" وہ یک ٹک اس کے پریشان چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

"میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی تو دایان محمود کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"آپ میرے متعلق جانتی بھی کیا ہیں؟ یہ دیکھیں اور مجھے جانیں۔ مما نے سمجھایا ہے کہ میں آپ کو ساری بات ضرور بتاؤں۔"

وہ تیزی سے کچھ اسکیچز کھول رہا تھا۔

"کیا بتائیں گے مجھے؟" وہ حیران تھی۔

"یہ پہلی پرچھائیں ہے۔ پہلا نقش تو دل پر بنا تھا اور دل سوائے ماں کے اور کسی کو کھول کر دکھایا نہیں جا سکتا۔ یہ اسکیچ بنانے کے لیے مجھے کافی ٹائم تک یہ سب سیکھنا پڑا تھا۔" اس نے اپنی ننھی سی فرینڈ کی تصویر اسے کھول کر دکھائی وہ جو حیرانی سے سب سن رہی تھی اسکیچ دیکھنے لگی۔

"یہ تو میرے بچپن کی تصویر ہے؟"

وہ اس پہچان پر کھل گیا۔

"دیکھ لیں، میں کہتا تھا نا کہ میرے آپ سے بڑے پرانے رشتے ہیں۔

یہ دیکھیں چند سال بعد میں نے اپنی فرینڈ کی تصویر بنا کر مما کو دکھائی تھی کیونکہ مما اسے دیکھنا چاہتی تھیں کہ وہ بڑی ہو کر کیسی لگ رہی ہے۔"

وہ باری باری سارے اسکیچز دیکھتی رہی اور احساس ہوا کہ یہ سلسلہ جذباتی نہیں روح کا ہے۔

"مجھے افسوس ہے کہ اب آپ کی وہ پاگل سی فرینڈ آپ کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔" وہ ساری کہانی الف سے ی تک سن چکی تو افسوس بھرے انداز میں بولی۔ "بقول آپ کے آپ نے دو ڈھائی سال اس

بات کو تسلیم کرتے ہوئے گزارے ہیں کہ میں ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ تو اب اس کے جوان ہونے تک آپ یہ ہی سمجھتے رہیں کہ ایک ماں اپنی بیٹی کو محفوظ ہاتھوں میں دے کر کسی اور طرف دیکھے گی۔"

"شاہ گل آپ ان دو ڈھائی سالوں کے ہر پل کا درد سہہ لیں تو اندازہ ہو کہ وہ دو ڈھائی صدیاں تھیں۔ کیا آپ کے دل میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے؟"

اس نے آس بھرے انداز میں اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ نظریں چرا کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میرے لیے زندگی کے معنی صرف اپنی خوشی نہیں بلکہ دوسروں کی خوشیاں ہیں اور یہ دوسرے میرے اپنے ہیں، غیر نہیں۔"

"اس طرح تو میری خوشیاں بھی مجھے ملنی چاہئیں بقول آپ کے دوسروں کی خوشیاں آپ کے لیے بہت اہم ہیں۔" وہ مصر تھا کہ کچھ نرم پڑ جائے۔

"یہ خوشی دوسروں کی تو نہیں ہے میری اپنی بھی ہے۔" وہ بے خیالی میں اعتراف کر گئی جس کا احساس ہوتے ہی زبان دانتوں تلے دبا لی۔

"کیا کہے گا یہ شخص کہ میں اس کے عشق کے سمندر میں گوڈے گوڈے ڈوبی ہوئی ہوں؟"

"آپ سچ کہہ رہی ہیں نا؟" وہ تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔

"میری بچپن کی دوستی سے لے کر سوا دو سالوں کی دیوانگی تک کسی چیز نے آپ کو متاثر نہیں کیا؟" وہ ہر لحاظ سے بہترین انسان اس کے سامنے دست سوال دراز کیے ہوئے تھا۔

"میں مجبور ہوں دایان محمود صاحب! اور مجبوروں کو بہت دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ کوئی دوسرا بھی ان سا مجبور ہے دنیا میں۔" وہ افسوس سے بولی۔

"محبت اور مجبوری میں کچھ بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ یہ دو الگ چیزیں ہیں جہاں محبت ہوگی وہاں مجبوری قریب نہیں بھٹکے گی۔

وہ نظریں اپنے ناخنوں پر جمائے ہوئے تھی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں کہ اپنی بھتیجی گل لالہ کے جوان ہونے اور اس کی شادی تک کسی بھی قسم کے رشتے میں نہیں بندھ سکتی۔" وہ کہہ ہی گئی ایک بار پھر زور دے کر دل کی بات جو عظیم خان انہیں بتا نہ پائے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے سب انہیں خود غرضی اور بے حسی کا طعنہ دیں گے۔

دایان محمود نے اس کی بات سن کر اطمینان سے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے رب کا شکر ادا کیا کہ وجہ کوئی اور نہیں، ایک چھوٹی سی بچی ہے ورنہ تو ان چند دنوں میں اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑی ہوئی تھی یہ سوچ سوچ کر کہ وہ کسی اور کی وجہ سے اسے انکار کر رہی ہے، اس کی رگ رگ میں اذیت دوڑنے لگی تھی۔

"میں گل لالہ کو اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گا، میرا وعدہ ہے یہ۔" وہ بے قراری سے بولا تو اس نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"وہ بہت بدقسمت ہے، اس کی سگی ماں اسے چھوڑ گئی ہے اور میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہے اس کے بعد تو میں اسے پل بھر کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتی اور نہ ہی میں اس کے سر سے اس کے بابا کا سایا چھین سکتی ہوں، ماں کے جیتے جی وہ بن ماں کے پل رہی ہے اب باپ کے جیتے جی بنا بابا کے کیسے پلنے دوں؟"

"اس کی شادی ہونے تک میں انتظار کر لوں گا۔" وہ یہ جان چکا تھا کہ وہ کسی صورت گل لالہ کو نہیں چھوڑے گی اس لیے جلدی سے انتظار کی تجویز پیش کر دی تھی

"یہ بہت لمبا وقت ہے۔ بڑی مشکل سے گزرے گا۔"

وہ ڈرا رہی تھی کہ وہ اس بچکانہ فیصلے سے باز آ جائے لیکن وہ بھی دایان محمود تھا دل کے ہاتھوں مجبور۔

"یہ تو چند سال ہیں، میں تو صدیوں تک آپ

کا انتظار کر سکتا ہوں۔" وہ پیار لٹاتی نظروں کا مقابلہ نہ کر پائی اور گلابی گالوں کی تپش چھپانے کے لیے چائے کا کہنے اٹھ گئی۔
"سنیں؟" اس نے پیچھے سے پکارا تو وہ رک گئی۔
"ایک شرط میری بھی مانیں گی؟"
وہ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔
"رابطے میں رہیں گی، فون پر بات ہو گی اور کبھی کبھی مل لیا کریں گے۔ انتظار کی گھڑیاں ہجر کی سوئی پر رک جاتی ہیں۔"
وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔
"دایان صاحب! میرے لیے عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ میں ایک غیر مرد کے ساتھ رابطے اور تعلق میں رہوں محض اس لیے کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہے اور اپنے قبیلے کی روایات کے ساتھ اپنے بھائی کا شملہ بھی جھکاتی رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا کبھی نہیں ہو گا۔" وہ پریشانی سے اسے دیکھے گیا۔
"میرے لیے اس طویل سفر میں کچھ تو زاد راہ کے طور پر ہونا، منزل ملے نہ ملے سفر تو طے کرنا پڑتا ہے۔"
وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔
"میں رابطے والی شرط ختم کر کے ہی اطمینان سے رہ سکتی ہوں آپ بے شک انتظار نہ کریں جب مرضی شادی کریں، اپنی زندگی جیتے رہیں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی میرا منتظر ہے یا نہیں، آپ کی ماں کے کچھ خواب ہوں گے آپ کو لے کر آپ کا پورا حق ہے اپنی زندگی پر۔ آپ جب تک چاہیں انتظار ـــــ کرتے رہیں اور جب بے اطمینانی ہونے لگے تو ختم کر دیں۔"
وہ ہنس دیا۔
"سب لوگ ہی دنیا میں دوسروں کے لیے نہیں جیتے۔ میں سراسر اپنے لیے جینا چاہتا ہوں، وہ بھی پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ۔"
وہ اندر چلی گئی اور دایان محمود باہر، لیکن شاہ گل نے اسے جاتے ہوئے مڑ کر ضرور دیکھا تھا اور اس کے دل میں اٹھتی ٹیسیں یہ کہہ رہی تھیں کہ انتظار اور وہ بھی اتنا طویل بہت تکلیف دہ تو ہو گا لیکن انتظار میں اک لذت بھی تو ہے۔
"تو بالآخر تمہیں بھی محبت ہو ہی گئی شاہ گل بی بی؟"
اس نے باہر نکلتے ہوئے دراز قد دایان محمود کی پشت کو گھورتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر سوچا۔

☆☆☆

"تم نے اچھا نہیں کیا شاہ گل! وہ بہت محبت کرنے والے لوگ تھے اور محبت کرنے والے وفادار لوگ نصیب سے ملا کرتے ہیں۔"
عظیم خان کو بہت افسوس تھا اس کے جذباتی فیصلے کا۔
"میں نے انہیں خالی ہاتھ تو نہیں لوٹایا۔ انتظار کا دیا ہاتھ میں تھما دیا ہے اب تند ہواؤں سے موسموں کے تغیر سے اس دیے کو محفوظ رکھنا ان کی ذمہ داری ہے۔" وہ سر جھکائے سوچ رہی تھی۔
"ہمیں فی الحال آپ کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے لالہ۔ آخر کب تک اس کے کیے کی سزا خود کو دیتے رہیں گے؟"
وہ بھائی کی تنہائی اور تکالیف دیکھ دیکھ کر دکھی ہوتی رہتی تھی۔
"اک عورت نے اس رشتے سے اعتماد ہی ختم کر دیا ہے۔ اب شادی کروں بھی تو میں بیوی پر بھی بھروسا نہیں کر سکوں گا اور بے اعتباری کیسے انسان کو اندر سے خالی کر دیتی ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔"
وہ افسوس سے بھائی کے اداس چہرے اور ویران آنکھوں کی طرف دیکھتی رہی۔
"کیسی قسمت ہے ہم دونوں بہن بھائی کی۔ مکمل خوشی ہمارے قریب آ کر ہمیں دور سے ہی اپنے رنگ دکھا کر تتلی کی طرح اڑ جاتی ہے۔"

☆☆☆

وقت کی رفتار کبھی تیز اور کبھی رینگنے والی رہی۔

کئی بار دایان کا جی چاہا کہ اسے فون کرے میسج کرے لیکن وعدہ نبھانا محبت کے قانون میں لازم ہے اس لیے وہ خود پر مکمل کنٹرول رکھتا رہا تھا۔

کبھی کبھی عظیم خان سے بات ہو جاتی تھی۔ وہ تازہ ترین صورت حال بتا کر کہتے۔

''میں چاہتا ہوں گل لالہ کی جلدی شادی کر دوں۔ تاکہ شاہ گل کی باقی ماندہ زندگی بے فکری میں گزرے۔'' وہ ایک طرح سے خاموش تسلی یا حوصلہ دیتے کہ کہیں دایان محمود تھک نہ جائے۔

''آپ میری فکر نہ کریں لالہ! میں بڑا پکا ہوں، آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

عظیم خان کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل جاتی وہ سوچتے۔

''پرخہ گل ایک تمہاری خود غرضی کی وجہ سے کتنے لوگ اذیت کا شکار ہیں۔'' عظیم خان نے باوجود اس عورت سے کراہیت کے کبھی اسے بددعا نہیں دی تھی۔

انہیں پرخہ کے کردار اور عمل سے کراہیت کا احساس ہوتا تھا جب بھی سوچتے حیرانی ہوتی کہ کوئی عورت محبت عزت دولت ہر چیز پا کر بھی اس حد تک گر سکتی ہے؟

''عورت تو میری ماں بھی تھی جس کی غیرت یہ سب برداشت نہ کر سکی اور وہ دنیا ہی چھوڑ گئی اور عورت تو میری بہن بھی ہے جس کی پاکیزگی کی گواہی اس کی روشن پیشانی پر سجا وہ سجدوں کا نشان ہے۔ اور کچھ عورتیں تم جیسی ہوتی ہیں جو پیشانی پر کلنک لگا کر بھی خوش رہتی ہیں کیونکہ وہ صرف اپنے لیے جیتی ہیں۔ اگر عورت ذات پر میرا اعتماد قائم ہے تو اس کی وجہ میری ماں اور بہن ہیں ورنہ تم نے تو دنیا کی ساری عورتوں سے میرا اعتبار اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

عظیم خان کبھی بھی صاف لفظوں میں دایان کو اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں نہیں بتا پائے تھے وہ صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان اختلافات کی وجہ خواتین کے گھریلو جھگڑے تھے جن کو بنیاد بنا کر طلاق لی گئی ہے یا دی گئی ہے اور گل لالہ کی ذمہ داری مرتے ہوئے اس کی دادی اپنی بیٹی پر ڈال گئی تھیں، بیٹی اپنی ماں کی وصیت کی وجہ سے اپنی زندگی کی خوشیاں دان کرتے ہوئے بھتیجی کی پرورش کر رہی تھی۔

☆☆☆

''بابا کہتے ہیں، شاہ گل کے کئی رشتے بہت اچھے آئے لیکن وہ انکار کرتی رہیں کہ جب تک گل لالہ کا رشتہ نہیں ہوتا، تب تک وہ شادی کے بارے میں سوچیں گی بھی نہیں۔ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ جب تک میں بڑی ہو کر شادی کروں گی۔ آپ کی عمر کے سنہرے سال گزر چکے ہوں گے ظاہر ہے پھر کسی رنڈوے یا طلاق یافتہ کا رشتہ ہی مل سکتا ہے۔ اور کسی ایسے مرد سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ آپ بھی شادی ہی نہ کریں۔''

اس کی باتیں سن کر شاہ گل کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم میرے بارے میں سوچ کر اپنا وقت ضائع کر رہی ہو میری بچی! اپنے بارے میں سوچو۔ ہم دونوں نے اپنی زندگی کے سنہری دن اس لیے نہیں دیے ہیں کہ تمہاری زندگی میں اجالے رہیں۔''

وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

''آپ ادھر آئیں، پکچر لیتے ہیں شاہ گل بو۔''

وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور موبائل میں پکچر لینے لگی۔

شاہ گل کی نظریں آئینے پر نظر آتے دونوں کے عکس پر پڑیں۔ وہ گل لالہ کے ساتھ کھڑی ادھیڑ عمر کی عورت کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھوں کی چمک کچھ ماند پڑ گئی تھی اور روشن پیشانی پر چند ہلکی سی شکنیں دور سے نظر آ رہی تھیں۔

گلابی ہونٹوں اور گالوں پر کھلتے گلابوں میں اب وہ تازگی اور خوبصورتی نہیں رہی تھی۔ وقت کے ظالم ہاتھوں نے بہت کچھ چھین لیا تھا۔

گل لالہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''شاہ گل بیو! خبردار مسکرانا بالکل نہیں ہے، آپ جب مسکراتی ہیں اور گالوں پر یہ دو۔ بلکہ ڈیڑھ حسین ترین ڈمپل پڑتے ہیں تو ان کے سامنے میری ساری خوبصورتی صفر ہو جاتی ہے، اس لیے نو اسمائیل، او کے۔'' وہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''میری مسکراہٹ تو تمہاری ماں اپنے سامان میں رکھ کر ساتھ لے گئی تھی گڑیا۔ یہ مسکراہٹ تو فقط دکھاوا ہے۔''

وہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ گل لالہ خوب تیار ہو کر دوستوں کے ساتھ نکل جاتی ہے اور رات گئے گھر لوٹتی ہے۔ پوچھنے پر کندھے اچکاتے ہوئے برا سا منہ بناتی اور کہتی ''یار شاہ گل بیو! سوشل ورک میں مصروف ہوں اس شہزادے کے دل تک پہنچنے کے لیے مجھے انسانیت کی فلاح و بہبود کے رستے پر چلنا پڑتا ہے۔ اک ناکام محبت کی کہانی کے چند کردار بھی مجھے ملے ہیں۔''

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

''اصل میں ابھی تک اس بندے کی شادی نہیں ہوئی لیکن شادی تو آپ کی بھی نہیں ہوئی لیکن اس کے پیچھے کسی ناکام محبت کی نشانی دکھی کہانی نہیں ہے۔''

وہ افسردہ سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلائے ہوئے دھیرے سے بولی۔

''ہاں میری کہانی میں محبت کا بڑا کردار ہے لیکن ناکام محبت کا نہیں بلکہ ایک خود غرض عورت کی کامیاب محبت کے ثمرات ضرور ہیں۔''

''یہ بھی بتا دو کہ اسے تمہارے دل تک پہنچنے کے لیے کس رستے کی ضرورت پڑے گی؟''

وہ سوچوں سے دامن چھڑا کر بولی تو گل لالہ نے حیرانی سے اپنی معصوم پھوپھو کی طرف دیکھا۔

''ابھی تک آپ یہ نہ جان پائیں کہ میرے دل تک پہنچنے کا رستہ بہت آسان ہے دولت کے ڈھیر ہوں۔

زیورات، محل جیسا گھر، دنیا بھر کی سیر، شان و شوکت، انٹرنیشنل برانڈڈ کے سوٹ، بس یہ ہی تو میرا خواب ہے۔ یہ ہی میرے دل تک پہنچنے کے رستے کا نقشہ ہے۔'' وہ اسے دیکھتی رہی یہ نقشہ تو پرخہ جیسی عورتوں کے دل کا ہے۔

اس نے دعا کی کہ پرخہ گل کی بیٹی میری تربیت کا بھرم رکھ لے۔

☆☆☆

ثمن نے سرمد کی سالگرہ پر تینوں دوستوں کو اکٹھا ہونے کا موقع دیا۔ وہ لوگ کیک کاٹ کر مزے دار ڈنر کے بعد لان میں بیٹھ گئے۔ سرمد کے دونوں بچے بہت تمیز دار اور ماں کی طرح صفائی پسند تھے۔

جس کا اندازہ دایان اور اسد کو کھانے کے دوران ہو گیا تھا۔ عموماً وہ لوگ الگ الگ مصروفیات کے باعث گھر میں کم ہی مل پاتے تھے زیادہ تر کسی ہوٹل میں ڈنر کر لیتے یا پھر کسی ایک کے آفس میں ملتے تھے

''یار سرمد تیرے دونوں بیٹے بہت پیارے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے دایان نے حسب عادت ہاتھ سے چاول کھانے شروع کر دیے اور بیک وقت تین چمچ اس کی طرف بڑھائے گئے اس نے دیکھا ثمن اور دونوں بچوں نے چمچ پکڑے ہوئے تھے۔

''نہیں بھابھی! میں چمچ سے نہیں کھاتا، میرے کھانے کی ٹینشن نہ لیں۔'' وہ فرائیڈ چکن و یجیٹیبل رائس سے انصاف کرتے ہوئے بولا تو ایک بچے نے

فوری جواب دیا۔
"انکل! اصل میں مما کو آپ کی نہیں، ٹیبل کی فکر ہے۔ آپ نیپکن بھی یوز نہیں کر رہے اور ٹیبل چٹنی ہو رہی ہے۔"
وہ منہ کھولے اسے دیکھنے لگا جبکہ اسد نے جلدی سے چٹنی کے باؤل سے ہاتھ ہٹا لیا جس میں وہ روٹی کے نوالے ڈبو کر کھا رہا تھا۔
دونوں نے سرمد کی طرف دیکھا کہ وہ بچے کی طرف ضرور آنکھیں نکال رہا ہوگا لیکن وہ مزے اور مینرز کے ساتھ کھا رہا تھا، اسے ہر وقت کی روک ٹوک کی عادت ہو چکی تھی۔
"یار! بڑی مشکل لائف ہے تیری۔" دونوں اسے چھیڑ رہے تھے۔
"ذرا مینرز سے کھاتے ہوئے تم دونوں کو موت آتی ہے؟ بڑی بڑی بزنس پارٹیز میں کیا تو اس طرح کھاتا پیتا ہے؟ اور تجھے اتنے بڑے ہاسپٹل کا بڑا کس نے بنا دیا ہے اسد بابو؟ تیری سالن لے کر چٹنی کے پیالے میں وہی نوالہ ڈبو کر کھانے کی عادت ابھی تک نہیں گئی؟"
"او آلو! وہی ہو تم جو کیک بھی کبھی چمچ سے نہیں کھاتے تھے ہمیشہ کیک کے نوالے لیے ہیں تم نے اور یاد کر لال شربت بھی گلاس میں ڈال کر نہیں پیا تھا ہمیشہ جگ سے منہ لگا کر پیتے تھے۔ بڑا آیا ہمیں مینرز سکھانے والا؟" وہ یہ سنتے ہوئے جھینپ کر مسکراتا رہا۔
"تیرے لیے تو بہت ہی افسوس ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ ایک ہی شہر میں رہ کر بھی تم دونوں اجنبی بن کر رہ رہے ہو یار! یہ کیسی محبت ہے کہ نہ فون کال نہ ہی میل ملاقات یہاں تک کہ کبھی کبھی کا ایک میسج بھی نہیں۔"
اسد نے افسوس کا اظہار کیا۔
وہ دونوں ہاتھوں کو کرسی کی پشت پر پھیلا کر ان پر سر رکھے آسمان پر چمکتے ستاروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"میرے لیے یہ ہی بہت ہے کہ ہم ایک فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ایک شہر کے باسی ہیں۔
ہمیں ایک دوسرے کو سننے کے لیے بولنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔
ہمیں ایک دوسرے کو محسوس کرنے کے لیے لمس کی ضرورت نہیں پڑتی۔"
اس کے لہجے کی مٹھاس اس کی آواز میں محسوس ہوتا احترام اور چہرے پر پھیلا مکمل اطمینان سب یہ گواہی دے رہے تھے کہ اسے نصیب سے کوئی گلہ نہیں ہے۔
"سچ کہوں تو میرا دل بہت دکھتا ہے تم دونوں کی تنہائی دیکھ کر۔" سرمد کی بات پر دونوں نے اسے گھورا۔
"سچ کہوں تو ہمارا دل بہت دکھتا ہے تیرے گھر والوں کی صفائی اور تیری دھنائی دیکھ کر، یار کم سے کم ہم اپنی مرضی سے روٹی شوٹی تو کھا سکتے ہیں اور کبھی کبھی جب ٹشو پیپر استعمال کرنے کو دل نہ چاہے تو کھانے کے بعد ادھر ادھر دیکھ کر اپنی آستین سے منہ تو صاف کر سکتے ہیں نا؟ تیری طرح تو نہیں کہ اپنی مرضی سے دو دن تک ایک جرابوں کا جوڑا بھی نہیں پہن سکتے۔"
"اب اتنا مشکل چیلنج دو گے تو انعام میں کم سے کم گاڑی تو رکھو نا۔"
سرمد نے مظلوم سی شکل بنا کر کہا تو وہ دونوں اس کی مسکین شکل دیکھ کر ہنسنے لگے۔

☆☆☆

"سر! اس نیکی کے کام کی تکمیل کی خوشی میں ہم نے ایک ہلکی پھلکی سی تقریب رکھی ہے اور آپ اس تقریب کے مہمان خصوصی ہوں گے۔"
گل لالہ نے بڑے مان اور یقین سے اسے دعوت دی تو وہ لمحے بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کہے؟

"ٹھیک ہے مس خان! میں کوشش کروں گا۔"
وہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ یہ پیاری سی لڑکی کچھ زیادہ ہی قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ "پیاری لڑکی تم سے پہلے بھی کئی لڑکیوں نے یہ کوشش کی ہے لیکن میرے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔"
"یہ امن و سلامتی کا حساس معاملہ تو نہیں کہ آپ اس قدر سوچ و بچار میں پڑے ہوئے ہیں۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی تو سب مسکرانے لگے۔
"ٹھیک ہے، کچھ دیر کے لیے آجاؤں گا حالانکہ میں پارٹیز وغیرہ میں بہت کم شرکت کرتا ہوں۔"

☆☆☆

وہ آج بہت خوش تھی، اتنی خوش کہ شاہ گل کئی بار اس پر آیتیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہی کہ اسے نظر نہ لگ جائے۔
"نظر لگنے کا دم نہ کریں نظروں میں سمانے کی دعا دیں کاش میں اس کے دل میں اتر جاؤں۔"
وہ اس کی بات سن کر حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔
کالے رنگ کی شیفون کی میکسی، گولڈن دوپٹہ اور گولڈن اونچی ہیل والے کوٹ شوز پہنے وہ کھلے بالوں اور ہلکے میک اپ میں اتنی حسین لگ رہی تھی کہ شاہ گل کو اس پر بے اختیار پیار آ گیا۔
اس نے پیشانی پر بکھرے بالوں کو اک ادا سے جھٹکتے ہوئے سب مہمانوں کی طرف دیکھا اور مہمان خاص کی کمی محسوس کرتے ہوئے فون ملایا۔
"سر! آپ کا انتظار ہو رہا ہے اور انتظار کرنے والوں کی فہرست میں میرا نام سب سے اوپر ہے" وہ سدا کی مغرور اور خود پسند لڑکی پہلی بار اپنی انا کو مارتے ہوئے ذرا سی دکھی ہوئی، پل بھر کے لیے اس کے ہاتھ بھی کانپے لیکن یہ سوچ کر خود کو سنبھالا اور اسے فون کر دیا کہ بہت کچھ پانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کھونا پڑتا ہے۔

"سوری بچوں! میں کچھ لیٹ ہو گیا ہوں لیکن دیر آید درست آید سمجھ کر درگزر کر دیں۔"
اس سمیت سب ہی لڑکوں لڑکیوں کو بچوں کہہ کر — مخاطب کرنا — گوارا نہ تھا لیکن خون کے گھونٹ پی کر وہ اس کا بیٹا بیٹا کہنا بھی برداشت کر لیتی تھی۔
"سر! ہم یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس ہیں اور آپ ماشاءاللہ اتنے ینگ اور اسمارٹ ہیں کہ ہم میں سے ہی لگتے ہیں تو اس طرح ہمیں بچوں نہ کہا کریں۔"
کھانا کھاتے ہوئے وہ پلیٹ ہاتھ میں پکڑے اس کے روبرو کھڑی ہو گئی تھی اور اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دل کی بات بھی کہہ رہی تھی۔
"مس خان! آپ سب مجھے اپنے بچوں کی طرح پیارے لگتے ہو اور اگر ٹھیک ٹائم پر میری شادی ہو جاتی تو آج میرے بچے آپ جتنے ہوتے۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔
"سر! ایک بات پوچھوں؟" اور اگلے ہی پل اس نے اجازت کا انتظار کیے بغیر پوچھ لیا۔
"آپ کا پرسنل معاملہ ہے لیکن پھر بھی پوچھ رہی ہوں کہ آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی؟"
وہ پل بھر کے لیے گم صم سا اسے دیکھنے لگا لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نرمی سے مسکرا دیا۔
گل لالہ کا جی چاہا کہ وہ اس کی آنکھوں میں اپنی زندگی سے بھرپور آنکھیں ڈال کر دھیرے سے کہے
"میں تمہارے انتظار میں تھا، تم دیر سے ملی ہو لیکن مل تو گئی ہو نا، اس لیے اب مجھے اس دیر کا افسوس نہیں ہے۔"
لیکن خلاف خواہش وہ بولا۔
"اک لڑکی سے انتظار کا وعدہ کیا ہے اور وہ جب تک چاہے گی، انتظار کی گھڑیاں گنتا رہوں گا۔"
وہ یہ کہہ کر لڑکوں کی طرف متوجہ ہوا۔ گل لالہ عظیم خان اس اجنبی لڑکی کے بارے میں سوچ کر جل بھن رہی

تھی۔

دایان محمود نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ وہ کالی میکسی میں جو کچھ دیر پہلے تک اپنی مسکراہٹیں بکھیرتی محفل کا سنگھار لگ رہی تھی۔ اب بالکل بجھ سی گئی تھی اس نے افسردگی سے سوچا۔ "کاش کہ اس کے دماغ میں موجود فتور ختم ہو جائے باقی تو ہر فن مولا ہے یہ لڑکی۔"

☆☆☆

"کیوں اداس ہو گئی دنوں سے کہیں گئی بھی نہیں اور سر جھاڑ منہ پھاڑ کمرے میں ہی گھسی ہوئی ہو خیر تو ہے نا؟" شاہ گل نے اس کے بجھے بجھے چہرے پر پریشانی بھری نظر ڈالی۔

"شاہ گل بُو! آپ کیا سمجھیں گی آپ نے کبھی محبت نہیں کی نا، ورنہ آپ کو میرا درد میرے چہرے پر تحریر ملتا۔" وہ دل میں اٹھتی ٹیسیں دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"محبت بڑی بُری بلا ہے۔ دیتی کچھ نہیں ہے لیکن چھینتی سب کچھ ہے۔"

وہ عام سے لہجے میں بولی تو گل لالہ ہنسنے لگی۔

"بندر کیا جانے ادرک کا سواد پیاری شاہ گل بُو!" اس نے تکیہ اسے مارنے کے لیے اٹھایا۔

"شریر لڑکی اپنی پھوپھی کو بندر کہہ رہی ہو؟"

وہ کان پکڑ کر شرارت سے بولی۔ "سوری جی! میں آپ کو بندر نہیں کہہ رہی کیونکہ مجھے بندریا اور بندر کے فرق کا اچھی طرح سے پتا ہے۔" اب وہ تکیہ اسے مار چکی تھی۔

وہ ہنستے ہوئے تکیے کی نرم چوٹ سہہ گئی۔

"جانتی ہیں میری محبت سب سے الگ سب سے منفرد ہے۔ کیونکہ میری محبت کا نام دولت ہے جس سے محبت نقصان کا نہیں فائدے کا سودا ہے۔"

"محبت سودا نہیں ہوتی بیٹا۔" وہ اسے سمجھانے لگی۔

"میں سب سے الگ سب سے منفرد ہوں پھر اس کی نظروں میں کیوں نہیں سماتی؟" وہ منہ بسورے پوچھ رہی تھی۔

"کیا کہتا ہے وہ اس سے پوچھ لیتیں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ کہتا ہے میرے دل میں ہمیشہ سے کوئی لڑکی بسی ہوئی ہے اور اب تک میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ یہ سن کر پریشانی سے بھتیجی کی شکل دیکھنے لگی۔

"کسی اور کی مجال ہے جو اس کے دل کی مکین بنے۔"

"تم نے دولت سے محبت کا دعویٰ کیا ہے اور پیسہ کبھی وفا نہیں کرتا۔"

"مجھے وفا بے وفائی سے کچھ نہیں لینا۔ بس حاصل کرنا ہے۔"

وہ الجھی ہوئی تھی، موبائل کی اسکرین پر اک نمبر چمک رہا تھا۔

اس نے جلدی سے فون اٹھایا۔

"میں مسز شگفتہ محمود بات کر رہی ہوں دایان محمود کی والدہ۔"

وہ خوشی سے تقریباً اچھل ہی پڑی۔

"جی جی آنٹی میں نے پہچان لیا ہے۔"

شاہ گل باہر نکل گئی تھی۔

"بیٹا میں نے گھر میں ایک دعوت رکھی ہے آپ سب ہی بچیاں بہت محنت سے یہ کامیابی حاصل کر پائی ہو اس لیے دایان اور آپ سب کے لیے یہ دعوت ہے میں سب سے مل بھی لوں گی اور کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔ کل شام کو ہے یہ دعوت آپ باقی ساتھیوں کو بھی میری طرف سے انوائیٹ کر لو او کے؟"

وہ سر ہلاتے ہوئے فون بند کرتے ہی خوشی سے ناچ اٹھی۔

"میں نے اب آپ کی ماں کو مٹھی میں کرنا ہے دایان محمود صاحب اب دیکھتے جائیے۔"

☆☆☆

"اب عظیم خان سے بات کرو بیٹا! اس کی بیٹی

شادی کے قابل ہو چکی ہے اور اگر تم نہیں کہتے تو آج ہی میں انہیں کہتی ہوں کہ اب تو ہمارے حال پر رحم کرے اور ہماری امانت ہمارے حوالے کر دے۔''

ماں کے جھریوں بھرے زرد چہرے کو دیکھا اور بولا۔

''فکر نہ کریں جلد ہی ہماری عمر قید اک اور قید میں تبدیل ہونے والی ہے۔''

''وقت پر پہنچ جانا، بچیوں کی دعوت کی ہے آج۔'' وہ اسے یاد دلا رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے پھر آج دعوت کے بعد میں فون کرتی ہوں عظیم خان کو۔'' وہ چپ رہا اور شگفتہ محمود سوچ میں گم تھیں۔

☆☆☆

''بہت بہترین کھانا تھا آنٹی اور سویٹ تو کمال ہی تھی۔'' وہ سب ان کے بڑے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہ پلنگ پر بیٹھی تھیں اور ایک سرخ کمبل ان کی ٹانگوں کو چھپائے ہوئے تھا۔

''مینو! بچوں کو ذرا گھر کی سیر کرا دو کاش کہ میں انہیں اپنا گھر دکھا سکتی لیکن افسوس کہ اس بستر تک محدود ہو کر جی رہی ہوں۔ دایان بیٹا تو حسب سابق مصروف ہی ہے اس لیے میزبان مینو کو ہی سمجھیں۔''

اور سب ہی مینو آنٹی کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے مختلف خوب صورت جگہیں دیکھتے ہوئے اس نے دایان محمود کا کمرہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مینو آنٹی انہیں ادھر لے گئیں۔

''سنا ہے، پوری دنیا سے منگوائی ہوئی سجاوٹ کی چیزیں اس گھر میں موجود ہیں لیکن سر دایان کا کمرہ سادگی کی مثال ہے اور انہیں اپنے کمرے میں کسی ۔ کا آنا جانا بھی پسند نہیں ہے؟''

وہ اس کے متعلق بہت معلومات رکھتی تھی۔

''جی۔ میرے علاوہ کمرے میں کوئی بے دھڑک نہیں جا سکتا۔ میں ہی صفائی وغیرہ کراتی ہوں اور ان کا فارغ وقت کمرے میں ہی گزرتا ہے۔''

وہ بڑے سے لکڑی کے منقش دروازے سے اندر داخل ہوئے تو جہازی سائز کمرے میں جس چیز نے سب کو متوجہ کیا۔ وہ کمرے کی سادگی اور کم سامان تھا، بیڈ ڈریسنگ ٹیبل ایک پانچ سیٹر صوفہ اور قالین یہ ہی کمرے کا سامان تھا۔

''واؤ کتنی حسین پینٹنگز ہیں اور یہ اسکیچز تو کمال ہی ہیں۔'' کمرے کی سب ہی دیواروں پر اک لڑکی کی تصاویر لگی تھیں وہ قریب سے دیکھنے لگی یہ ساری تصاویر اسے کچھ مانوس سی لگیں اور جب غور کیا تو اس کے سر پر جیسے حیرت اور صدمے کا پہاڑ سا گر گیا۔

''شاہ گل بو!'' اس نے بے اختیار سر سے اٹھتی ٹیسیں دبانے کے لیے ماتھے کو دبایا۔

''خیریت، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' سب اس کی حالت سے پریشان ہو گئے تھے۔

''نہیں یار ویسے ہی سر میں درد سا محسوس ہوا تھا اب ٹھیک ہوں۔''

وہ بغور دیکھنے لگی۔

پینسل سے بنی شبیہہ بہت واضح تھی وہ سب مختلف عمر کی تصاویر تھیں۔

''یہ تو بالکل ویسی تصویر ہے جیسی بی بی جان کی گود میں بیٹھی شاہ گل بو کی تصویر ان کے بیڈ روم میں لگی ہے وہی مسکراہٹ وہی گالوں کے ڈمپل آنکھوں میں سے جھانکتی ہونٹوں پر پھیلی شرارت بھری ہنسی۔''

مینو آنٹی نے اس کی دلچسپی ان تصاویر میں دیکھ کر قریب کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ سب تصاویر ہمارے دایان صاحب نے بنائی ہیں یہ وہی لڑکی ہے جس کے لیے انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی اور اسی کے انتظار میں زندگی گزار رہے ہیں۔'' وہ دل پر شدید قسم کا بوجھ لیے دیکھتی رہی۔

''یہ ہمارے صاحب کی بچپن کی دوست ہیں لیکن ہم نے انہیں کبھی دیکھا نہیں۔ صرف اتنا پتا ہے کہ یہ انہیں فرینڈ کہتے ہیں۔''

وہ ایک پینٹنگ کے پاس کھڑی ہو گئی۔

یہ شاہ گل بوکی اٹھارہ انیس سال کی عمر کی تصویر تھی پھر اس کے بعد مختلف تصاویر لگی ہوئی تھیں ایک چیز ہر پینٹنگ میں واضح تھی اور وہ تھے ان کے گالوں کے ڈمپل اور ہر تصویر پر عنوان لکھا تھا۔ فرینڈ فار ایور وہ حیران پریشان سی وہاں سے گھر لوٹی تھی۔

دبے دبے الفاظ میں دایان کی ماں سے بھی ان تصاویر کے متعلق پوچھا تھا لیکن وہ بھی وہی بتا کر چپ ہو گئیں جو مینو آنٹی نے بتایا تھا وہ گھر تک کے رستے میں گم صم رہی تھی۔ کئی سوالات اس کے دل ودماغ میں طوفان بپا کیے ہوئے تھے لیکن یہ طوفان تھمنے کے آثار ہی نظر نہیں آرہے تھے۔

''کیا رشتہ ہے شاہ گل بو اور دایان محمود کے درمیان؟

اگر کوئی رشتہ ہے تو میں نے کبھی انہیں ملتے بات کرتے یا پھر اپنے گھر میں آتے جاتے کیوں نہیں دیکھا؟

کہیں یہ وہی عشق تو نہیں ہے۔ جس کے بارے میں لوگ قصے سناتے ہیں؟ ہاں یہ وہی ہے کیونکہ ابھی تک دونوں نے شادی نہیں کی تو وجہ کچھ ایسی ہی ہوسکتی ہے جس کو چھپانا دونوں کی مجبوری ہے۔''

وہ بنا کسی سے بات کیے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر چکی تھی۔

وہ اس وقت شاہ گل بو کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی عجیب سی بے زاری ہو رہی تھی اسے شاہ گل کی ذات سے اور یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا بچپن سے وہ جب بھی ماں کو یاد کرتی، پھوپھی اور باپ کے ساتھ ساتھ مرحومہ دادی سے بھی اسے شکوے ہونے لگتے۔

اس کے دل میں سب کے لیے عجیب سے نیگیٹو خیالات پیدا ہوتے لیکن وہ یہ سب اندر ہی اندر رکھتی تھی۔

اپنی مظلومیت کی تصویر ماں سے اسے غائبانہ ہمدردی اور محبت تھی جسے وہ کبھی ظاہر نہیں کرتی تھی۔

☆☆☆

وہ دایان محمود کے سامنے بیٹھی تھی آفس کے اس کمرے میں کوئی اور نہیں تھا اور ملنے کا وقت اس نے گھر واپس آکر بہت سوچنے کے بعد لیا تھا۔

''جی مس خان! آپ کو کچھ کہنا تھا؟'' وہ سرسری سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''سیدھی صاف بات کرنے آئی ہوں سر! اور وہ سیدھی سچی بات یہ ہے کہ میں آپ کو دل سے پسند کرتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ ہماری شادی ہو جائے۔'' دایان محمود حیرت کی شدت سے اسے کئی پل تک تکتا ہی رہا۔ کچھ کہہ نہ سکا۔

وہ یہ تو جان گیا تھا کہ یہ خوب صورت لڑکی اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہے لیکن اس طرح براہ راست شادی کی بات کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔

''دیکھیں مس خان! میری زندگی میں ایسی بہت سی لڑکیاں آئی ہیں جنہوں نے مجھے ہر طرح سے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے کسی کو آج تک مثبت جواب نہیں دیا اور نہ ہی کبھی دوں گا۔

آپ سے یہ بات ضرور کروں گا کہ میں وہ انسان ہرگز نہیں ہوں جو آپ کے لیے بنا ہے۔'' وہ بڑے بردبار انداز میں اسے سمجھا رہا تھا۔

''لیکن میں نے آپ کو چن لیا ہے اور جسے میں چن لیتی ہوں وہ میرا ہونے میں فخر محسوس کرتا ہے۔''

اس کے لہجے کا غرور اس پر جچ بھی رہا تھا۔ مغرور انداز میں اٹھی ہوئی اس کی لمبی صراحی جیسی گردن اور شانوں پر بکھرا ریشم کا ڈھیر اسے وہ حسن بخش رہا تھا کہ دل ہی دل میں دایان محمود بھی اسے سراہے بنا نہ رہ سکا۔

''میں جسے چن لیتا ہوں، اسے اپنا نہیں بناتا بلکہ اس کا ہو جاتا ہوں اور مس خان! میں برسوں پہلے کسی کو چن کر اس کا ہو چکا ہوں۔ میں اب کسی کو کیا دے سکتا ہوں جب کہ میں خود کو بھی دستیاب نہیں ہوں۔''

وہ صاف جواب سن کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

”لیکن آپ کی زندگی کی طرح آپ کی آنکھیں بھی خالی ہیں، آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کوئی ہے یا کسی کے ساتھ آپ ہیں۔“

وہ مسکرا دیا۔

”وہ آنکھوں میں نہیں دل میں رہتی ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ تہہ آب کیا ہے اور کیا نہیں تہہ میں اترے بغیر یہ سب ممکن نہیں مس خان۔“

”تو مجھے اترنے کا موقع دیں نا۔“

وہ بے اختیار کہہ گئی۔

”ایسے موقعے ڈھونڈنے والے بہت ملتے ہیں لیکن میں نے کبھی موقع پرستوں کو قریب نہیں آنے دیا۔“

اس کی رنگت احساس توہین سے سرخ پڑ گئی تھی۔

”آپ میرے جذبات کی توہین کر رہے ہیں۔“

وہ سنجیدگی سے بولی تو دایان نے بھی جواب میں اسے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”مس خان! میں آپ کو جھوٹی امید نہیں دلانا چاہتا اس لیے صاف صاف اور سخت بات کر رہا ہوں۔“

اس کا میز پر رکھا ہاتھ احساس توہین کی شدت سے بھنچ گیا تھا۔

”میں نے آج تک کسی مرد کو اس نظر سے نہیں دیکھا آپ میں کچھ ایسا ہے کہ آپ سے پہلی ملاقات کے بعد اس بے اختیاری نے میری ساری شخصیت ہی بدل دی ہے۔ آج تک میں لوگوں کو ٹھکراتی آئی ہوں لیکن آج احساس ہوا ہے کہ کوئی ایسے ٹھکرائے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔“ اس کی آواز میں درد تھا۔

”آپ ابھی بہت چھوٹی ہیں، زندگی نے آپ کے لیے بہت کچھ اچھا رکھا ہوا ہے یہ فقط ایک پڑاؤ ہے منزل نہیں، منزل پر پہنچ کر آپ کو اس پڑاؤ کی کبھی یاد بھی نہیں آئے گی۔“

وہ خود پر کنٹرول پاتے ہوئے بولی۔ ”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“

وہ ہنسنے لگا۔

”میں نے بہت سی ایسی لڑکیوں کو بعد میں اپنی زندگی میں خوش اور مسرور دیکھا ہے جو کہتی تھیں تم نہ ملے تو مر جاؤں گی، زندگی کے لیے سانسوں کی طرح لازم ہو تم۔

اور بعد میں پندرہ پندرہ بیس بیس سال سے بغیر آکسیجن کے جی رہی ہیں اور خوب مزے سے جی رہی ہیں وہ سب۔ ہونہہ کہہ کر اک ادا سے گھورتی ہیں اور شوہر حضرات کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بہ زبان خاموشی یہ پیغام دے دیتی ہیں کہ دیکھو لو ہیرے کی قدر جوہری کے پاس ہوتی ہے اور میں ان جوہریوں کو دعا دیتا رہتا ہوں جنہوں نے ہیرے کی پہچان کر لی تھی ورنہ خون ناحق میرے سر آتا۔“

وہ بول رہا تھا اور اس کی ساری باتیں اسے اندر ہی اندر آگ لگائے جا رہی تھیں وہ بمشکل خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی تھی ورنہ تو جی چاہ رہا تھا کہ ٹیبل پر پڑا ایش ٹرے اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھی اور بنا کچھ کہے اسی تیزی سے باہر نکل گئی اس کے اندر بھانبھڑ جل رہے تھے۔

کئی دلوں کو غرور سے ٹھوکریں مار کر اس نے خود کو سب سے اونچا سمجھ رکھا تھا۔ آج اس شخص کے لب و لہجے نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا اور وہ بلندیوں کے سفر میں رہنے والی کھلے آسمان پر اڑنے والی یکدم سے پرواز چھوڑ کر زمین میں دھنسی جا رہی تھی اور اس کی وجہ اس شخص کا غرور اور دولت نہیں تھی بلکہ وہ خیالی عشق تھا جو اسے شاہ گل سے تھا۔ یہ تو وہ سمجھ ہی چکی تھی کہ وہ کس وجہ سے اسے نظر انداز کرتا رہا اور کس وجہ سے اسے ٹھکرا دیا ہے۔

وہ دل و دماغ کی اس کشمکش میں اک منصوبہ بنا چکی تھی اور یہ منصوبہ اسے بہت جلد دایان محمود کے محل کی رانی بنا سکتا تھا۔

☆☆☆

"کیا ہوا ہے شہزادی کیوں رو رہی ہو؟"

وہ پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی اور رونے سے اس کا سارا وجود ہل رہا تھا۔

"اگر نہ بتایا تو میں تمہارے باپ کو فون کر کے بلاتی ہوں وہی تم سے وجہ پوچھ لیں گے۔ تم نے تو کبھی یوں آنسو نہیں بہائے ایسا کیا ہو گیا ہے آج؟"

وہ اس کے قریب بیٹھ کر بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"مجھے محبت ہو گئی ہے اس شخص سے جس کی نظر میں میری اہمیت تنکے کے برابر بھی نہیں ہے۔"

وہ سسکتے ہوئے اٹھی اور شاہ گل کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے پوری قوت سے پھوپھی کے گلے میں بانہیں ڈالی ہوئی تھیں۔ شاہ گل کا دم گھٹنے لگا تو اسے خود سے جدا کیا۔ اس کے گال آنسوؤں سے ڈھل گئے تھے اور چھوٹی سی ناک بالکل سرخ ہو گئی تھی سرخ متورم آنکھیں اور آنسوؤں کی نمی سے جڑی ہوئی پلکیں بکھرے بال شانوں پر پڑے الجھے ہوئے سے تھے۔

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لیا تھا۔

شاہ گل نے اس کے بال سمیٹ کر اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کیے اور محبت سے بولی۔

"کتنا بخت والا ہے وہ شخص جس کے لیے یہ قیمتی ہیرے موتی گر رہے ہیں۔"

وہ بدستور سسک رہی تھی۔

"کون ہے، اس کا نام بتاؤ تاکہ میں اسے کان سے پکڑ کر تمہارے سامنے لے آؤں اور کہوں اب اپنی قسمت پر رشک کرو نادان انسان کہ یہ شہزادی تیرے لیے رو رہی ہے۔"

وہ پل بھر کے لیے شاہ گل کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "اس کا نام دایان محمود ہے۔"

اس کے بال سنوارتے شاہ گل کے ہاتھ ساکت ہو گئے۔

گل لالہ کی محبت میں دھڑکتا دل بھی رکنے لگا۔ سانسیں مگر چل رہی تھیں۔

"میں نے اس سے کہا مجھے اپنا لو۔ خود کو ذلیل کیا اور اس کے سامنے جھک گئی مگر وہ کہتا ہے، میں کسی سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے اس کے لیے کئی تمہارے جیسی لڑکیوں کو ٹھکرایا ہے۔ وہ کسی اور کا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔" شاہ گل سکتے میں تھی۔

"آپ چپ کیوں ہیں؟" وہ بغور شاہ گل کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر پھیلا ہوا کرب اور آنکھوں کی حیرانی اس کی اندرونی توڑ پھوڑ کی نشان دہی کر رہی تھی۔ گل لالہ نے دیکھا پھوپھی کے حسین چہرے کی رنگت زرد تھی اور ہونٹ آپس میں یوں بھینچے ہوئے تھے کہ بالکل نیلے لگنے لگے تھے۔

"آپ بولتی کیوں نہیں کیا آپ نے دایان محمود کا نام سن رکھا ہے؟"

وہ زخموں پر نمک پاشی کر رہی تھی لیکن شاہ گل اس بات سے انجان تھی کہ بھتیجی سب جان کر بھی انجان بننے کی اداکاری کر رہی ہے۔

اس نے پل بھر میں فیصلہ کر لیا۔

رگوں میں دوڑتی دایان محمود کی محبت کس کو نظر آ رہی ہے؟ میں مر جاؤں گی کہ میرا دل بھی اس کے لیے دھڑکتا ہے۔

برسوں سے اسے ایک نظر دیکھنے اسے محسوس کرنے اسے سننے کے لیے میری تمام حسیات ترس رہی ہیں

میں مر جاؤں گی کہ کبھی کبھی ٹی وی یا اخبار میں اس کی تصویر دیکھ کر، اس کی آواز سن کر کتنا سکون ملتا ہے۔

میں نے واقعی مر جانا ہے کہ صدیوں پر محیط ہر پل میں مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔

میں مر جاؤں گی کہ وہ جب وہاں سے کھانا کھا کر نکل جاتا ہے تو میں اس میز کے پاس کھڑی ہو کر

پاگلوں کی طرح اس کی کرسی کو چھو کر اس کے جسم کی
گرمی اپنی انگلیوں کی پوروں میں بسا لیتی ہوں
میں مر جاؤں گی کہ موبائل فون میں ایک فولڈر
ایسا بھی ہے جو اس کی تصویروں سے بھرا پڑا ہے اور
سونے سے پہلے اس کی تصویروں سے باتیں کرتی
ہوں۔ صبح جاگتے ہی وہ فولڈر دوبارہ کھول کر رات کو
دیکھے سب خوابوں کی تفصیل اسے بتاتی ہوں اور پھر
دن کا آغاز کرتی ہوں۔

"شاہ گل بو!" وہ اسے جھنجوڑ کر بولی۔

"کہاں گم ہیں؟ میرے دکھ کا مداوا کیسے ہوگا۔
میں جو محروم ہوں کیسے نوازی جاؤں گی؟ کچھ تو کریں
ورنہ میں مر جاؤں گی یا پھر خود کو ختم کرلوں گی۔" وہ
تیزی سے اٹھی اور میز پر رکھی فروٹ کی ٹوکری سے
چھری اٹھا کر اپنی کلائی پر رکھ دی۔

یہ منظر دیکھ کر شاہ گل کے پیروں تلے سے زمین
کھسک گئی اور وہ تیزی سے اس پر جھپٹ پڑی۔

اسی اثنا میں عظیم خان کمرے میں داخل ہوئے
اور دونوں کو یوں گتھم گتھا دیکھ کر وہیں کھڑے رہ گئے
وہ دونوں ان کی آمد سے بے خبر ہیں۔

"یہ کیا بے وقوفی ہے۔ تم حرام موت مرنا چاہتی
ہو تا کہ تمہاری موت اور ہم دونوں بہن بھائی کی
زندگی حرام ہو جائے؟"

وہ چھری اس کے ہاتھ سے لے کر دور پھینک
چکی تھی۔

"مجھے دایان محمود نہ ملا تو میں زندہ رہ کر کیا
کروں گی، وہ یا موت۔ دو ہی راستے ہیں میرے
پاس؟"

وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکنے لگی تھی اور
دروازے میں کھڑے عظیم خان صدمے سے بت
بن چکے تھے۔

وہ تو آج یہ طے کر کے آئے تھے کہ گل لالہ کو
ساری بات بتا کر کہیں گے کہ تمہاری پھوپھو نے اپنی
ساری زندگی تمہاری خاطر تیاگ دی ہے۔ اس کا
منگیتر اور منگیتر کی ماں نے برسوں اس وقت کا انتظار
کیا ہے۔ اب تم بھی شادی کی شرط پوری کرو اور میں
دونوں کی شادی اکٹھی طے کرتا ہوں۔ وہ ارسل خان
کی سفارش بھی کرنا چاہتے تھے۔ ارسل خان نے ان
سے درخواست کی تھی کہ گل لالہ سے ایک بار پھر بات
کرلیں اور میری سفارش بھی کریں۔ میں نے کئی
رشتے ٹھکرائے ہیں اس کی خاطر، کیونکہ وہ میرے چچا
کی بیٹی ہے بچپن کی ساتھی ہے لیکن یہاں آکر جس
صورت حال کا سامنا ہوا وہ تو ان کے وہم و گمان میں
بھی نہیں تھی۔

وہ جس خاموشی سے آئے تھے اسی خاموشی سے
واپس چلے گئے۔

ایسی تکلیف پہلے بھی ملی تھی لیکن وہ تکلیف ماں
نے دی تھی۔

☆☆☆

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو شاہ گل؟ پہلے
تمہاری زندگی کے سنہرے ترین سال پرخہ گل کی
خود غرضی نے چھین لیے اور اب جب کہ تمہاری ضد
پوری ہونے والی تھی، تمہیں تمہارے حصے کی خوشیاں
واپس ملنے والی تھیں اسی پرخہ گل کی بیٹی دیوار بن گئی
ہے۔" عظیم خان سخت غصے میں تھے۔

"لالہ! پرخہ گل نے جو کیا سو کیا لیکن گل لالہ تو
تمہاری اپنی ہے۔ میری بھتیجی ہے۔ آپ کی بیٹی ہے
اسے تو ہم اس کے حال پر نہیں چھوڑ سکتے وہ نادان
ہے جذباتی ہے۔۔۔ کچھ کرلے گی اور پھر ہم دونوں
خود کو کبھی معاف نہ کرسکیں گے۔"

وہ اس نازک سی لڑکی کی طرف حیرانی سے دیکھ
رہے تھے۔

"دایان اور اس کی ماں کے بارے میں سوچو،
وہ ہر ہر پل کی خبر رکھتے ہیں رات دن گھڑیاں گنتے
رہتے ہیں تم نے انہیں پہلے ہی بغیر جرم کے کافی سزا
دے دی ہے، اب ان کی سزا ختم کرو اور اپنے گھر کی
ہو جاؤ وہ جذباتی ہے لیکن خود کو سنبھالنے کی صلاحیت
رکھتی ہے چند دن کا رونا دھونا ہوگا اور پھر اس کے لیے
راوی چین ہی چین لکھے گا۔ یہ میری دعا بھی ہے اور

امید بھی۔"

وہ نہایت عاجزی سے اسے سمجھا رہے تھے۔

"میں نے جس کے لیے ساری زندگی کی قربانی دی ہے، اسے مرنے دوں؟ میں نے اس وقت اسے نہیں چھوڑا جب میری گڑیاں مجھے بلاتی تھیں لیکن میں اسے گود میں اٹھائے رات رات بھر بہلاتی رہتی تھی کبھی پیٹ میں درد تو کبھی بخار۔ میں نے وہ سارے دکھ اٹھا کر اسے پالا ہے جو کوئی سگی ماں ہی اٹھا سکتی ہے اور مائیں بیٹیوں کی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے اپنی خواہشات کی قربانیاں دیتی رہتی ہیں — یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"اس کے انتظار کی اتنی توہین نہ کرو شاہ گل! وہ دونوں ماں بیٹا ٹوٹ جائیں گے۔" وہ آخری کوشش کرنا چاہتے تھے اس لیے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سینے سے لگا کر اس کا سر چوم لیا

وہ چپ چاپ اپنی ہتھیلیوں پر نظر جمائے بیٹھی تھی جہاں قسمت کی الجھی لکیروں میں نہ مکمل ملن لکھا تھا نہ ہی مکمل جدائی۔ وہ اس کشمکش کے بھنور سے نکلنے کے لیے جدائی کے تنکوں کو سہارا سمجھ رہی تھی

"پلیز لالہ۔ گل لالہ کو اس سارے معاملے کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ اسے معلوم ہو گیا کہ ہمارے درمیان کون سا معاملہ ہے تو وہ اپنی خواہشات اپنے خوابوں سے دست بردار ہو جائے گی اور یہ مجھے منظور نہیں ہے۔"

☆☆☆

"گل لالہ بیٹا! وہ تمہاری خاطر آج تک خوشیوں سے محروم رہی ہے، اب اس کی رکھی شرط پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ دایان محمود نے اس کے لیے بہت ساری قربانیاں دی ہیں۔

وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے لیکن ابھی تک شاہ گل کے لیے جوگ لیے بیٹھا ہے میں نے تو چند دن میں اس کی شادی کرانے کا فیصلہ کر رکھا تھا کیونکہ تم اتنی سمجھ دار اور ذمہ دار ہو چکی ہو کہ اپنے ساتھ ساتھ میرا خیال بھی رکھ سکتی ہو۔"

وہ باپ کی زبانی دایان محمود اور شاہ گل کے رشتے کے متعلق سارے چھپے ہوئے حقائق جان چکی تھی لیکن اس کا دل ابھی تک نہیں پسیجا تھا۔

"بابا! میں بھی مجبور ہوں اور اس مجبوری کی تفصیل میں آپ کو نہیں بتا پاؤں گی۔"

وہ حتمی انداز میں بولی تو عظیم خان کو پرخہ گل یاد آ گئی۔

اس نے بھی تو اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا تو وہ جھٹ سے بولی تھی۔

"مر جاؤ نا تاکہ سب کچھ میرے لیے رہ جائے۔ میں مجبور ہوں اور مجھے مجبور کرنے والی محبت ہے۔"

پرخہ کے چہرے پر لکھا تھا کہ وہ ہر قیمت پر وہی کرے گی جس کی اسے تمنا ہے۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم سب جان کر بھی اپنا فیصلہ نہیں بدلو گی۔ میرا دل دکھ گیا ہے گل لالہ۔"

وہ سوچ رہی تھی۔

"ہونہہ جو دکھ دیتے ہیں ان کے حصے میں بھی دکھ ہی آتے ہیں۔ میری ماں سے مجھے جدا کر کے کتنا ظلم کیا ہے آپ لوگوں نے۔ اب دکھوں کی کمائی سے دکھ ہی خریدے جا سکتے ہیں نا۔"

☆☆☆

"مما...... مما آج عظیم خان لالہ نے ہمیں دعوت پر بلایا ہے۔ برسوں بعد یہ دن آیا ہے۔ اب جلدی سے ٹھیک ہو جائیں کل شام کی دعوت ہے، مجھے لگتا ہے وہ لوگ ضرور شادی کی تاریخ دیں گے۔"

اس کی آنکھوں میں خوشی چمک رہی تھی اور چہرہ جیسے کھل سا گیا تھا۔

"میں یہ خبر سن کر ہی ٹھیک ہو گئی ہوں دفع کرو اس بخار شخار کو اور تیاری کرو مینو گل کے لیے میرا اچھا سا سوٹ اور شال نکالو اور ہاں کچھ فروٹس، کیک، مٹھائیاں وغیرہ لے لینا برسوں کے انتظار کے بعد تو

یہ دن آیا ہے۔" وہ بھی بہت خوش تھیں۔
"میں شکرانے کے نفل پڑھتا ہوں پھر ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔" وہ اندر چلا گیا۔

☆☆☆

وہ گھر میں داخل ہوئے تو وہ سامنے کھڑی نوکرانی کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔
شگفتہ بیگم گاڑی سے سامان نکلوا رہی تھیں اور وہ اندر داخل ہوتے ہی دھڑکتے دل کی بے قابو دھڑکنوں کو کنٹرول کرتے ہوئے اسے یوں دیکھنے لگا جیسے برسوں کا پیاسا پانی کو دیکھتا ہے یا آخری لمحات میں مرتا ہوا شخص زندگانی کو دیکھتا ہے ۔ یا پھر کوئی مشکلات میں گھرا ہوا آسانی کو دیکھتا ہے
"کیسی ہو؟" وہ قریب آیا تو شاہ گل نے سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ کرا ثبات میں سر ہلا دیا۔
وہ دیکھنے لگا، سفید کپڑوں میں وہ کچھ اجنبی سی لگ رہی تھی۔
اتنے برسوں کی تھکن نے اس کے چہرے پر اپنا اثر چھوڑا تھا۔ آنکھوں میں جلتے ستارے ماند سے پڑے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر پہلی شرارت بھری مسکراہٹ کہیں کھو گئی تھی۔ وہ شدت سے چاہ رہا تھا کہ شاہ گل مسکرائے تا کہ وہ اس کے گالوں کے وہ ڈمپل دیکھ سکے جنہیں دیکھنے کے لیے اس کی نظروں نے کئی برس کا جوگ لیا تھا، وہ دیکھ رہا تھا اس کا نازک بدن ذرا سا بھر گیا ہے اور بالوں کے درمیان سے نکلی مانگ کچھ چوڑی ہو گئی تھی۔ وقت کے مصور ہاتھوں نے تصویر میں اپنی پسند کے کچھ رنگ تیز کر دیے تھے اور کچھ ہلکے، اس کی چاہت ان تیز ہلکے رنگوں سے بہت آگے کی تھی اس لیے اسے ہر رنگ میں وہ اچھی لگتی تھی
"ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں کیسے ہیں؟" وہ اسے جی بھر کر بغور دیکھنے کی شدید ترین خواہش کو بڑی مشکل سے دبا پائی تھی اور بنا اسے دیکھے نظریں جھکائے دھیرے سے اپنی خیریت بتائی۔
شگفتہ بیگم نے اسے بانہوں میں بھر کر خوب پیار کیا۔ وہ ان کے بیٹے کا خواب تھی۔
"آیئے آنٹی! لالہ آتے ہیں آپ بیٹھیں۔"
وہ اس وقت بھی ایک پروقار اور سلجھی ہوئی لڑکی لگ رہی تھی جب برسوں پہلے وہ اسے مانگنے آئی تھیں مگر آج تو اس کی گریس فل شخصیت دل میں کھبی جا رہی تھی۔ سفید کاٹن نیٹ کے لانگ فراک کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور سفید بڑا سا دوپٹہ کندھوں پر پھیلائے سیدھی مانگ کے ساتھ بالوں کی لمبی سی چٹیا ایک سائیڈ پر ڈالے وہ کوئی پرانے زمانے کی شہزادی لگ رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹا صوفوں پر بیٹھے تھے کہ عظیم خان شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے ان کے پاس آ گئے۔ وہ اندر غائب ہو چکی تھی۔ لاؤنج میں ان کے سر پر بڑا سا جگمگ کرتا فانوس لٹک رہا تھا اور اس کے آس پاس بھی کئی رنگ برنگی لائیٹس لگی ہوئی تھیں لیکن دایان محمود کو اس کے جاتے ہی ہر طرف اندھیرا نظر آنے لگا۔ دھندلی سی روشنی اندھیرا مٹانے کی کوشش میں ناکام محسوس ہوئی۔
"بھائی صاحب ہمیں کوئی خوشی کی خبر سنا دیں ہم بہت ترس گئے ہیں خوشی کے لیے۔"
شگفتہ محمود نے منت بھرے انداز میں کہا تو عظیم خان کے اندر جھکڑ چلنے لگے۔
"میں بہت شرمندہ ہوں بہن جی۔ آپ جانتی ہیں کہ میں نے اس وقت بھی شاہ گل کے اس ناروا فیصلے کی حمایت نہیں کی تھی بلکہ اس سے اختلاف کیا تھا کہ وہ اپنے بارے میں سوچے۔ میری بیٹی سراسر میری ذمہ داری ہے، اس کی نہیں لیکن وہ نہ مانی کیونکہ اسے اپنی بھتیجی سے، بہت محبت ہے اور یہ ہی محبت آج مجھے آپ سب کے سامنے شرمندہ کیے جا رہی ہے۔" وہ سر جھکا کر بیٹھے تھے۔ دونوں ماں بیٹے کے چہرے متغیر تھے۔
"ایسا کیا ہو گیا ہے میرے بھائی؟"
وہ دونوں شرمندہ سے عظیم خان کی طرف دیکھ رہے تھے جنہیں بہن اور بیٹی نے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

”شاہ گل نے شادی سے انکار کر دیا ہے اور اس کی وجہ وہ خود آپ کو بتائے گی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں آپ جیسے پیارے لوگوں کا دل مزید دل دکھا سکوں۔ میں ہمیشہ سے بدقسمت تھا اور آج تک خوش قسمتی نے میرے دروازے پر دستک نہیں دی۔

میرے قبیلے کے سارے مرد بہت سخت مزاج ہیں وہ ماں بہن بیوی بیٹی جیسے رشتوں کی نہ سنتے ہیں اور نہ ہی ان کی مانتے ہیں۔

میں نے پہلے بی بی جان کے حکم پر سر تسلیم خم کیا اور ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کی۔ پھر بیوی کی ہر خوشی کا احترام کرتے ہوئے اسے اس کی خوشی کی خاطر طلاق دے دی۔ دولت، گھر، زیور سب اسے دے کر چھوڑا حالانکہ ہمارے قبیلے میں بیوی کو چھوڑتے نہیں ہیں۔ زندگی سے چھڑا لیتے ہیں لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا پھر بہن کی شادی تم سے کرنے کی شدید خواہش کو بھی میں پایہ تکمیل تک پہنچانے سے معذور رہا کیونکہ میں ان بھائیوں میں سے نہ تھا کہ جو بہن کو زبردستی ڈولی میں بٹھا دیتے ہیں میں نے سوچا میں زیادتی کروں گا تو ساری عمر احساس ندامت چوکے لگاتا رہے گا۔ اس لیے اس کے فیصلے کو مان لیا اور آج...... آج میری بیٹی میری بہن کے ساتھ مل کر میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں اک کمزور مرد ہوں میری ماں اگر آج زندہ ہوتیں تو مجھے میری بزدلی کا طعنہ ضرور دیتیں شاید دل ہی دل میں آپ بھی مجھے بزدل کہہ رہے ہوں گے لیکن میں اس کا برا ہرگز نہیں مناؤں گا کیونکہ سچ ہے یہ اس لیے کہ میں بزدل ہوں۔“

وہ بولتے بولتے تھک چکے تھے دایان محمود اپنی جگہ سے اٹھا اور عظیم خان کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دینے لگا۔

وہ دونوں الجھے ہوئے انداز میں یہ سب سن رہے تھے

”بھائی صاحب! اس سب کی وجہ تو بتا دیں ہمیں۔“

وہ دایان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دے کر تیزی سے اٹھا اور باہر نکل گیا خود پر مزید ضبط جو نہیں رہا تھا۔

وہ دونوں ماں بیٹا اس غیر متوقع صورت حال پر ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ دایان محمود کی ہتھیلیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ غصے اور برہمی کی شدید لہریں اس کے اندر سے اٹھ رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی اس تذلیل پر کسے مورد الزام ٹھہراتے ہوئے سزا سنائے؟ سب سے بڑا قصور وار تو وہ خود تھا لیکن جتنی بڑی سزا پا رہا تھا اتنا بڑا قصور بھی تو نہیں تھا۔

وہ چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر آتی نوکرانی کے پیچھے سے نمودار ہوئی تو اس کی آنکھیں سرخ اور ناک سوجی ہوئی تھی۔

وہ نوکرانی کو جانے کا کہہ کر چائے سرو کرنے لگی۔

دایان محمود نے اس کی پکڑائی ہوئی پیالی میز پر پٹخ کر غصیلے انداز میں کہا۔

”صاف صاف کہہ دیں کہ مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں، اس لیے برسوں سے یہ ٹال مٹول لگا رکھی ہے۔“

”میں نے کب کہا کہ مجھے آپ سے دلچسپی ہے؟“

وہ بھی جواباً تیکھے انداز میں بولی تو دایان کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی گل لالہ اندر داخل ہوئی

”ارے سر! آپ؟“ وہ حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے

”بیٹا آپ تو آئی تھیں نا اس دن دعوت پر؟“ شگفتہ محمود نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ پل بھر میں دایان محمود ساری بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا اور بات سمجھ کر اس کا دماغ مزید گھومنے لگا تھا۔

”عظمت کی بلندیوں پر کھڑی رہیں ہمیشہ مس

شاہ گل۔" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

"اوہ تو آپ ہیں گل لالہ عظیم خان۔ شاہ گل کی بھتیجی اور عظیم خان کی وہ بیٹی جسے پالنے کے لیے اس کی پھوپھی نے بہت ساری قربانیاں دی ہیں اور عظیم پھوپھی نے ایک قربانی اور دینے کے لیے اپنی لاڈلی بھتیجی کی خوشی اس کے دامن میں ڈالنا پسند کیا اور کسی دوسرے پر کیا گزرتی ہے۔ ان کی جوتی کو بھی اس بات کی پرواہ نہیں ہے۔" وہ چبا چبا کر بول رہا تھا۔

"آپ یہاں آئے ہیں، میرے گھر میں، مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔"

کھلے کھلے چہرے اور چمکتی آنکھوں میں سجے ستاروں کی روشنی نے اس کی نظریں خیرہ کردی تھیں۔ وہ اس کے تروتازہ چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن وہ تو ایک ٹک اسی کو دیکھے جارہی تھی

"تم جاؤ گل لالہ کھانے کا ٹائم ہے، ذرا چیک کرو کچن میں کام ٹھیک ہو رہا ہے؟"

وہ سمجھ رہی تھی کہ گل لالہ کو دایان محمود اور شاہ گل کی کہانی کا کچھ پتا نہیں ہے اور اگر وہ یہ سب جان گئی تو احساس جرم یا احساس ندامت اسے کچوکے لگائے گا اسے کیا خبر تھی کہ بھتیجی نے دایان محمود کے بیڈروم میں ساری کہانی تصاویر کی زبانی سن لی تھی اور پھر بھی اس کے دل پر وار کرتے ہوئے ذرا بھی اس کے ہاتھ نہ لرزے تھے۔

"جی شاہ گل بو! میں دیکھتی ہوں۔ سر بس ابھی آئی۔ آپ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ آپ کو میرے گھر کا کیسے پتا چلا؟ ضرور میری دوستوں نے بتایا ہے۔ مجھ سے تو کسی نے ذکر ہی نہیں کیا کہ آپ آرہے ہیں۔ آنٹی یہ شامی کباب لیں نا، میری شاہ گل بو بہت اچھے بناتی ہیں۔" خوشی اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی۔

وہ اسے طنزیہ نظروں سے دیکھے جارہا تھا۔

وہ کچن میں آگئی اور اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے خود کو اس قدر اچھی اداکاری پر اپنا ہی کندھا تھپک کر شاباش دی۔

"اسے کچھ خبر نہیں، پلیز کچھ مت کہیے گا۔ وہ سب جان کر کہیں ذہنی توازن ہی نہ کھو دے۔ پلیز آنٹی ان کو سمجھائیں، ایک ڈھلتی ہوئی عمر کی خزاں رسیدہ عورت کا خیال دل سے نکال کر گل لالہ کو اپنا لیں۔ دیکھ لیں کتنی حسین ہے قابلیت ذہانت، کسی چیز کی کمی نہیں۔ ہنستی مسکراتی قہقہے لگاتی ایک زندہ دل لڑکی ہی آپ کے گھر کی رونق بڑھا سکتی ہے۔" وہ کس دل سے کہہ رہی تھی اور دایان محمود کس دل سے سن رہا تھا۔ شگفتہ محمود کو خوب اچھی طرح سے اندازہ ہو چکا تھا۔

"اور شاہ گل بی بی! یقیناً آپ کو لگتا ہوگا کہ مجھے گل لالہ جیسی لڑکیوں کی کمی ہے یا کبھی ایسی آفرز مجھے نہیں ملی ہوں گی جیسی گل آپ کی بھتیجی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دی ہے تو یقیناً یہ آپ کی غلط فہمی ہے میری زندگی کے سنہرے برس برباد کر کے بھی آپ کو ذرا احساس نہ ہوا کہ میرے اور میری ماں کے ساتھ کس قدر زیادتی ہو چکی ہے پھر بھی آپ وہ سوچ رہی ہیں جو کسی صورت بھی نہیں سوچنا چاہیے تھا بلکہ ایسا کچھ بھی بولنا آپ کو زیب نہیں دیتا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں شدید غصہ اور ناراضی تھی شگفتہ بیگم حیرانی سے سب سن رہی تھیں۔ انہیں آج پتا چلا تھا کہ گل لالہ عظیم خان دایان کے عشق میں گرفتار ہے۔

"میری عمر کی شام ہونے والی ہے اور وہ صبح کے اجالوں جیسی ہے انیس بیس سال کی ایک جیتی جاگتی لڑکی ہی آپ کے ساتھ چل سکتی ہے۔ میری تو سانس پھول جاتی ہے چند قدم تیز چلتے ہوئے۔ اور...... اور ثابت کریں کہ میں نے آپ کو مجبور کیا ہو عمر کی رائیگانی آپ کا ذاتی فیصلہ تھا۔" اس نے بات کاٹ دی۔

"گل لالہ کو بلائیں میرے پاس، آپ سے بحث کرنے کی فرصت نہیں ہے۔" وہ بیگانگی سے کہہ رہا تھا اور اس کا لہجہ اسے مارے جارہا تھا۔

"بیٹا! سوچ لو کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو؟" شگفتہ کو

اس نازک سی لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔ اتنی دیر میں گل لالہ تیز تیز چلتی ہوئی اندر آ گئی تھی

"تو پھر ٹھیک ہے عظیم خان صاحب کے بقول انہوں نے مکمل اختیار گھر کی خواتین کو سونپ رکھا ہے تو ہم کب آئیں نکاح کے لیے۔ پلیز تاریخ بھی رکھ ہی لیتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس اس عمر میں گنوانے یا ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔"

شاہ گل کی رنگت متغیر ہو گئی تھی، اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔

"کس کا نکاح؟" وہ بمشکل بولی تو وہ ہنسنے لگا۔

"ارے گل لالہ کا اور میرا نکاح اور کس کا؟ آپ تو ادھیڑ عمر کی خاتون ہیں، اب اس عمر میں آپ کا نکاح تو ہونے سے رہا پھر کیوں پوچھ رہی ہیں کہ کس کا نکاح؟ میرے خیال میں اس گھر میں ایک ہی نکاح کے قابل لڑکی ہے اور وہ یقیناً آپ نہیں ہیں۔"

اس کا انداز زخم دینے والا تھا اور وہ اندر سے لہولہان ہو چکی تھی۔

جبکہ پردے کے پیچھے کھڑی گل لالہ کا چہرہ کھل گیا تھا اور اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں، یہ سوچ کر کہ اس کے سارے تیر نشانے پر لگے ہیں۔

"دایان! تم کیا کہہ رہے ہو ہم یہاں برسوں کے انتظار کے بعد اپنی بہو کو لینے آئے ہیں اور تم کیسے اسی لڑکی کی بیٹی کو اپنا لو گے جس کے لیے تم نے اپنی ساری جوانی تیاگ دی؟" شگفتہ محمود حیرانی سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"ماما! صبح، دوپہر، شام جس کے نام کا ورد میں نے برسوں کیا اسے میری اتنی سی پروا بھی نہیں ہے کہ اس کی ایسی دل دہلا دینے والی باتیں سن کر مجھ پر کیا گزرے گی تو پھر میں کیوں اس کی پروا کروں؟" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور شاہ گل بھی اس کے مقابل سر جھکائے کھڑی تھی۔

"آپ سب کے لیے وہ صرف میری بھتیجی ہے لیکن کوئی نہیں جان سکتا کہ وہ میرے لیے کیا ہے؟ گڑیوں سے کھیلنے کی عمر میں میری گود میں ایک زندہ جیتی جاگتی ننھی سی چند دن کی بچی ڈال دی گئی اور مجھے یہ کہا گیا کہ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔

وہ روتی بلکتی تھی تو اسے چپ کرانے والا میرے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہوتا تھا اسے بھوک لگتی تو وہ میرے پاس آتی تھی۔

وہ جب پاؤں پاؤں چلنے لگی تو ٹھوکر کھا کر گر جاتی تھی اور اسے سنبھالنے والی دوبارہ اٹھانے والی صرف میں ہوتی تھی۔

جب اس نے میرے سامنے اپنی جان لینے کی کوشش کی تو آپ خود سوچیں کہ میں اسے کیسے مرنے دوں گی؟ جب وہ چند دن کی بچی تھی میں نے تب اسے مرنے نہیں دیا اب جبکہ وہ میری جاگتی راتوں اور بے قرار دنوں کے ثمر میں میرے پاس ہے تو میں اسے کیسے کھو دوں؟" اس کے رخساروں پر سے آنسوؤں کے موتی پھسل پھسل کر گر رہے تھے۔

وہ جو ایک ٹشو پیپر میں اس کے آنسو سنبھال کر رکھتا تھا آج بے حسی سے اسے آنسو بہاتا دیکھے جا رہا تھا۔

"چلیں مما! یہ خاتون صرف اور صرف اپنے لیے یا اپنوں کے لیے سوچتی ہیں اور ہم ان کے اپنوں میں شامل ہیں نہ ہی ان کے اپنے دل میں ہماری کوئی جگہ ہے۔" شگفتہ محمود اسے سمجھانا چاہتی تھیں لیکن وہ یہاں ایک منٹ بھی مزید رک کر ضبط کھو دے گا۔ یہ اچھی طرح جان گئی تھیں اس لیے اٹھ گئیں۔

گل لالہ جلدی سے دروازے کی اوٹ سے نکلی اور انجان بن کر ان کے درمیان کھڑی ہو گئی۔

"سر! کھانا تیار ہے، آنٹی آپ بیٹھیں نا۔" اس نے اصرار کیا لیکن دایان، گل لالہ کے قریب آ کر بولا۔

"مبارک ہو۔ تمہاری شادی عنقریب اس ملک کے بہت بڑے صنعت کار سے ہو رہی ہے۔"

وہ کھل گئی تھی یہ سن کر۔

شگفتہ نے آگے بڑھ کر گل لالہ کا ماتھا چوم لیا اور پھر شاہ گل کو بھی گلے سے لگا کر گویا تسلی دینے لگیں کہ

اب اپنے کیے کا عذاب بھگتو۔

☆☆☆

شادی کی تاریخ طے پا گئی تھی۔ عظیم خان نے بجھے دل سے تیاریاں شروع کر دی تھیں اور شاہ گل بھی ان تیاریوں میں شامل رہتی تھی۔

وہ بہن کی مرجھائی ہوئی رنگت اور اجڑے ہوئے وجود کو دیکھ کر افسردہ سا ہو کر سوچتے رہتے کہ عمر اس کی بھی مگر بسر پرخہ گل اور اس کی بیٹی نے کر لی تم ایک زندگی بھی نہ جی سکیں اور وہ دو دو زندگیاں جی رہی ہیں ایک اپنی اور ایک تمہاری۔ وہ ماں کی قبر پر جا کر بہت روئے تھے اور یہ بھی کہا کہ ''بی بی جان آپ کے ایک فیصلے نے کئی زندگیوں کو برباد کر دیا۔''

وہ دونوں بہن بھائی گل لالہ کی خوشی میں اپنے لیے خوشی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے جو اتنی خوش تھی کہ اس سے خوشی سنبھالی ہی نہیں جا رہی تھی۔

''گل لالہ! دیکھو، کہیں بعد میں افسوس یا پچھتاوا نہ ہو کہ اپنے سے دگنی عمر کے مرد سے شادی کر کے تم نے زندگی برباد کر لی ہے۔''

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہی تھی۔ وہ صاف لفظوں میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ تمہاری ماں نے پچھتاوے کی آگ میں کئی دلوں کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔

''زندگی برباد؟ ارے دولت مندوں کی زندگی برباد نہیں ہوتی۔ وہ تو عیش و عشرت کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور میں بھی ان ہی میں سے ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولی تو وہ سرسری انداز میں پوچھنے لگی

''گل لالہ! اگر وہ غریب ہو جائے تو......؟''

اس سوال پر وہ ہنسنے لگی۔

''تو کیا ہوا؟ دنیا میں اور امیر بھی تو ہوں گے نا یا پھر سارے مال دار غریب ہو جائیں گے؟'' وہ ساکت سی اسے دیکھے گئی۔

''مطلب تمہیں صرف دولت سے مطلب ہے؟ اب بھی تو دنیا امیروں سے بھری پڑی ہے۔ پھر دایان محمود ہی کیوں؟'' لیکن وہ یہ سوال اس سے نہ کر سکی۔

''ابھی وہ آرہے ہیں مجھے لینے ہم۔ دونوں نے آج جیولر کی طرف جانا ہے اور میں نے ڈائمنڈ کے سیٹ لینے ہیں۔ بابا نے تو یہ ڈائمنڈ کے نام پر چنی منی سی انگوٹھی اور لاکٹ بنوا کر دیے ہوئے ہیں۔ اب دیکھیں، میں کیا کیا خریدتی ہوں۔'' شاہ گل کی نظریں اپنی خالی کلائیوں پر جمی تھیں اور سارا وجود پتھر کا ہو چکا تھا دل تو پہلے پتھر ہو چکا تھا۔

''آپ بڑی چپ چپ ہیں، خیر تو ہے نا؟'' وہ جانتے بوجھتے انجان بن کر پوچھ رہی تھی اسے اب مزہ آنے لگا تھا یہ سب کرتے ہوئے۔

باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور وہ خوشبوؤں میں بسی سجی سنوری تیزی سے ہاتھ ہلاتی باہر نکل گئی۔

شاہ گل نے غیر ارادی طور پر ٹوٹے قدموں سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے کے لیے لان میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور براؤن سوٹ میں ملبوس گلاسز لگائے دایان محمود کو گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے دیکھ کر دل نے مزید دھڑکنے سے انکار کر دیا۔

درد کی ایک شدید لہر سینے سے ہوتی ہوئی بازو میں سرایت کر گئی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے سینے کو مسلتے ہوئے ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا اور کھڑکی سے لگ کر نیچے ڈھتی چلی گئی

سانس لینے میں شدید تکلیف اور سینے کی گھٹن سے پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اسے لگا اب آخری وقت ہے اور آخری وقت کا آخری منظر بالکل غیر متوقع تھا۔

دایان محمود دوڑتا ہوا اسے اپنی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا یا شاید دھندلا سا عکس تھا اس کا ''نہیں یہ گمان ہے حقیقت نہیں۔ وہ تو چلا بھی گیا۔'' اس نے اندھیروں کی دھمک ساعتوں میں اترتی محسوس کی اور پھر ہوش کھو بیٹھی۔

وہ چلا رہا تھا۔ ''شاہ گل! میری فرینڈ۔ فرینڈ!''

☆☆☆

"شدید صدمے سے نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے اور مریضہ کا ہارٹ بھی متاثر لگ رہا ہے۔ انہیں کوئی ایسا شاک پہنچا ہے جوان کی برداشت سے باہر تھا بہرحال دعا کریں کہ بہتری کی امید پیدا ہو جائے۔" وہ بے ہوش تھی اور عظیم خان سفید بستر پر پڑے اس کے سفید پڑتے وجود کو اس طرح بے بس نہیں دیکھ پا رہے تھے ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی ہمت اپنے حوصلے کو یوں مرتے دیکھ پائیں۔

وہ تڑپ تڑپ کر رو رہے تھے اور دایان محمود انہیں کندھے سے پکڑ کر تسلی دے رہا تھا۔ شگفتہ بیگم اور گل لالہ دونوں سامنے بیٹھے تھے۔ عظیم خان نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

"بی بی جان کہتی تھیں کہ مرد روتے نہیں مرد تو آنسو پونچھنے والے ہوتے ہیں۔ مرد ہمت نہیں ہارتے بلکہ ہمت دینے والے ہوتے ہیں۔

ان کا بیٹا تو یہ سب نہ کر سکا نہ ہی اپنے آنسو اندر اتار پایا اور نہ ہی کسی کی ہمت بندھا پایا۔ میں وہ خود غرض انسان ہوں کہ اپنے سارے بوجھ اس ننھی سی نازک سی جان کے دامن میں ڈال کر خود ہلکا پھلکا ہو گیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ وہ یہ سب اٹھا سکتی ہے یا نہیں۔ دیکھو اتنی ہمت والی تھی کہ بوجھ نہ اٹھا سکی لیکن کمزور پڑ کر اس نے ہار بھی نہیں مانی۔ وہ لڑتی رہی اور میں نالائق بھائی اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔" وہ سسکنے لگے۔

"پلیز بابا! مت روئیں اس طرح، وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" گل لالہ کا موڈ پہلے ہی خراب تھا اچھا بھلا گاڑی میں بیٹھ چکے تھے کہ اسے یاد آیا وہ اپنا فون گھر میں ہی چھوڑ آئی ہے اور فون ضروری اس لیے تھا کہ اس میں بہت ڈھونڈ کر زیورات کے خوب صورت ڈیزائن محفوظ کر رکھے تھے وہ واپس اندر آئی تو پیچھے سے دایان محمود بھی اندر آ گیا۔ شاید وہ جل جل کر خاک ہوتی اس کمزور سی لڑکی کو جلانے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا اسے کیا خبر تھی کہ وہ تو پہلے ہی خاک ہو چکی ہے۔

وہ اندر آیا تو شاہ گل سینے کو مسلتے ہوئے دیوار کے سہارے اپنے وجود کو سنبھالنے کی کوشش میں ناکام ہو کر گر رہی تھی

دایان نے اس کا پسینے میں بھیگا وجود دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ اس وقت شدید تکلیف میں ہے، سچے فرینڈ کا درد اپنے سینے میں اٹھتا ہوا ضرور محسوس ہوتا ہے

پھر کیسے اسے بانہوں میں بھر کر وہ ہاسپٹل تک لایا اور کیسے ڈاکٹرز کی مایوس کن باتوں سے امید کی ننھی سی کرن ڈھونڈ کر ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے میں کامیاب ہوا تھا، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

گل لالہ نے دزدیدہ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔

"کیسے موت پڑ رہی ہے اس شخص کو، ایسا لگ رہا ہے جیسے اس کی جان نکل رہی ہے۔

"تم لوگ بیٹھو، میں ذرا منت کے نفل پڑھ لوں۔" شگفتہ بیگم اٹھ گئیں تو وہ بھی ان کے پیچھے ویٹنگ روم ___ کے اندر چلی گئی۔

اس کا فون وہیں رکھا رہ گیا تھا۔

دایان نے میسج کی رنگ ٹن کر چونکتے ہوئے دیکھا تو گل لالہ کا فون سامنے چیئر پر پڑا ہوا تھا۔ وہ فون اٹھا کر اسے دینے ویٹنگ روم کی طرف بڑھا اور بے خیالی میں اس کی نظر میسج پر پڑ گئی۔

کسی دوست کا میسج تھا۔

"یار! اب نروس بریک ڈاؤن اتنی جلدی تو ٹھیک نہیں ہو سکتا نا، تم لوگ نکل جاؤ شاپنگ کے لیے۔"

اس نے گل لالہ کے میسجز پڑھنے شروع کیے۔

"ان پر بھی آج ہی موت پڑنی تھی اور میرے بابا کے آنسو تو دیکھو۔

میری ماں کو جب گھر سے طلاق دے کر نکالا تھا اس وقت تو نہیں روئے ہوں گے، بہن کے لیے کیسے ٹسوے بہائے جا رہے ہیں۔

دل چاہ رہا ہے کہ کہوں بابا کچھ آنسو ان کی موت پر بھی تو بہائیں گے بچا کر رکھ لیں۔۔ شاید جلدی بہانے پڑ جائیں۔"

یہ سب پڑھ کر دایان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

اس نے مزید پڑھا۔

"اس بڑھیا کو تو دیکھو یوں پریشان ہے جیسے سگی بہو مر رہی ہو۔ اور وہ بڈھا دایان محمود اس کی تو جیسے ساری کشتیوں میں سوراخ ہو گئے ہیں اور سارا سامان تجارت ڈوب رہا ہے۔"

وہ مزید پڑھنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہا تھا۔ اسے اس لڑکی کی گھٹیا سوچ سے گھن آنے لگی تھی۔

منافق لوگوں سے وہ الرجک تھا لیکن ایسی منافقت تو کبھی دیکھی نہ سنی تھی۔

وہ جو زندگی کی ہر خوشی اس لڑکی پر لٹانے کے لیے تیار تھی اور اس کے ماتھے پر پریشانی کی ایک شکن بھی برداشت نہیں کر پاتی تھی، وہ اس کی موت کا ذکر کتنی آسانی سے سہیلی کے ساتھ کر رہی تھی

اسے شاید یاد آیا کہ فون وہیں بھول آئی ہے تب ہی وہ تیزی سے باہر آ رہی تھی۔

"ارے آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں آ رہی تھی نا اصل میں نفل پڑھنے تھے، اس لیے دھیان فون کی طرف نہ رہا۔"

اس نے منافقت کی جیتی جاگتی شکل پہلی بار دیکھی تھی وہ اسے بغور دیکھنے لگا، یہ سوچ کر کہ شاید دوبارہ کہیں ایسا نمونہ دیکھنے کو ملے نہ ملے۔

"نہیں گل لالہ جی! میں بڈھا تو ہوں مگر اتنا بھی نہیں کہ چار قدم نہ چل سکوں۔" وہ اس کی بات سن کر چونک گئی اور پھر سمجھ کر متغیر رنگت چھپانے کی کوشش کرنے لگی

"کہیں اس نے میرے میسج تو نہیں پڑھ لیے؟" اس نے اس خیال کی نفی کو سر جھٹک کر جھٹلایا اور فون لے کر اندر چلی گئی۔

وہ حیرت اور دکھ کے سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

تیسرے دن جب اس نے آنکھیں کھولیں تو عظیم خان رب کا شکر ادا کرتے ہوئے بے اختیار رو پڑے اس وقت دایان کی وہاں موجودگی اس کے لیے خطرناک تھی، وہ مزید جذباتی دھچکوں کو سہنے کے قابل نہیں تھی، اس لیے آنکھ کے اشارے سے عظیم خان نے دروازے میں کھڑے دایان کو باہر نکل جانے کا کہا۔

اور اس کا ماتھا چوم کر گلہ کیا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ کر جانا چاہتی تھیں؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تیرا لالہ بہت بزدل ہے بہت ڈرپوک ہے، وہ پھر سے بکھر جائے گا اسے تو اپنی کرچیاں چننے کا ہنر بھی نہیں آتا۔" ان کے آنسو شاہ گل کی کلائی پر گر رہے تھے۔

"لالہ! رونا نہیں ہے، یاد ہے نا بی بی جان کیا کہتی تھیں؟" وہ آنسو پونچھ کر مسکرانے لگے۔

"بی بی جان کو کیا خبر تھی کہ ان کے بیٹے کو کیسے کیسے ستم سہنے پڑیں گے اگر وہ یہ جان جاتیں کہ ان کی بیٹی کی ایسی حالت بھی ہو سکتی ہے تو پھر وہ مجھے رونے کی اجازت ضرور دے دیتیں۔"

وہ اپنی پلکوں کا بوجھ زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکی تو اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں اور عظیم خان کا دل اس کی آنکھ کے کونے سے گرتے آنسو کو دیکھ کر تڑپ اٹھا

"رو لو، جی بھر کر رو لو۔ آنسوؤں کے اندر ہی اندر گرنے سے بڑے طوفان اٹھتے ہیں ایسے طوفان جو ہر چیز کو بہا کر لے جاتے ہیں اس چہرے کو بھی جو خود کو خوش دکھانے کے لیے افسردہ چہرے پر مسکراہٹ کی صورت میں سجا لیا جاتا ہے۔"

"میں واقعی خوش ہوں لالہ۔ آپ گل لالہ کی خوشی کو میری خوشیوں سے الگ کیوں سمجھتے ہیں؟" وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

”وہ کہاں ہے؟“ اسے گل لالہ کی کمی محسوس ہوئی تو پوچھا۔
عظیم خان نظریں چرا گئے، کیسے بتاتے کہ آج اس کی سہیلی کی سالگرہ ہے اور وہ دوستوں کی ایک پارٹی میں گئی ہے، ان کے منع کرنے کے باوجود بھی۔
”لالہ! اس کی خوشیاں میری بیماری کی وجہ سے نامکمل رہ گئی ہیں۔ مجھے پتا ہے وہ میرے لیے بہت پریشان ہوگی۔“ عظیم خان دل میں اٹھتی ہوک کو دبا کر خاموش ہی رہے، کیسے بتاتے کہ وہ پرخہ گل کی بیٹی ہے بی بی جان کی نہیں کہ اس میں اپنے علاوہ بھی کسی کا احساس ہو۔
”تم زیادہ بولو نہیں۔ وہ کچھ دیر میں آتی ہے میں نے زبردستی گھر بھیجا ہے کہ آرام کرلے۔“
وہ اور کیا کہتے، اس کے پیلے زرد چہرے پر نظریں جمائے دعائیں مانگتے رہے۔

☆☆☆

وہ ہاسپٹل کے کاریڈور میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا دل تھا کہ ضد ہی کر رہا تھا کہ اندر جا کر اسے دیکھے اسے سنے اور پھر شکر مندی کے دو آنسو اس کے سامنے بہا دے جنہیں وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سکون سے آنکھیں موند لے لیکن اس کا اندر داخلہ ممکن نہ تھا۔
تیسرا دن تھا کہ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔
”اس لڑکی کے میسج اور توہین آمیز انداز اسے اندر باہر سے جلا رہا تھا لیکن وہ کچھ بھی ایسا نہیں کر پا رہا تھا جس سے شاہ گل کو اس کی فرینڈ کو تکلیف ہوتی۔
”ارے آپ ابھی تک یہیں ہیں لگتا ہے آپ کو اپنے کاروبار، مصروفیات وغیرہ کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ایک ہی فکر ہے آپ کی ہونے والی بیوی کی پھوپھو کی بیماری۔ ویسے کچھ حیرانی کی بات تو ہے نا کہ آپ میرے رشتہ داروں کی اتنی فکر کرتے ہیں۔ یہ تو اچھا ہے کہ میرے قریبی رشتہ دار زیادہ نہیں ورنہ آپ کی باقی کی عمر تو ان کی فکروں میں ہی کٹ جاتی۔“
وہ خوب بن سنور کر فل میک اپ اور بھڑکیلے لباس میں سالگرہ سے ڈائریکٹ اسپتال آئی تھی۔
اگر وہ تین دن پہلے اس کے میسجز نہ پڑھ چکا ہوتا تو اس کے رویے پر اسے حیرانی ہوتی لیکن اس وقت وہ بالکل حیران نہیں تھا بلکہ دایان کو اس سے بھی زیادہ کی توقع تھی۔
”جی کچھ لوگ میرے جیسے ہوتے ہیں جو ہر کسی کا درد اپنے سینے میں محسوس کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے درد کو بھی محسوس نہیں کرتے جو ان کی ذرا سی تکلیف کو اپنی جان کا روگ بنا لیتے ہیں۔“
وہ اس کی گہری اور طنزیہ بات کی تہہ میں اترے بغیر مسکرا دی۔
وہ دونوں وہیں کھڑے تھے کہ عظیم خان باہر آ گئے۔
”لالہ! اب کیسی ہیں وہ، انہوں نے کوئی بات کی؟“
دایان محمود کی بے قراری عظیم خان کے ساتھ گل لالہ نے بھی محسوس کرلی تھی، اسی لیے تو وہ منہ بنا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
”میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ ان کو ہوش آ جائے گا آپ یونہی پریشان تھے۔“
”وہ دواؤں کے زیر اثر ابھی پھر غنودگی میں چلی گئی ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آنکھیں کھولی ہیں اور میرے ساتھ باتیں بھی کی ہیں۔“
عظیم خان اسے نظر انداز کرتے ہوئے دایان کی طرف دیکھ کر بولے تو وہ بھی کندھے اچکا کر رہ گئی، اچھی طرح سے جانتی تھی کہ باپ کو اس کا یوں سالگرہ پر جانا اور بننا سنورنا اچھا نہیں لگا لیکن اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کسی اور کو کیا اچھا لگتا ہے اور کیا برا وہ تو ہمیشہ وہی کرنے کی عادی تھی جو اسے اچھا لگتا تھا۔
”ارے یہ تو مینو آنٹی ہیں، یہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ دایان نے مینو آنٹی کو پریشان سا ہسپتال میں

پھرتے ہوئے دیکھا تو ان کے قریب چلا گیا۔

وہ ایک اسٹریچر کے ساتھ کھڑی تھیں اور اس کے ساتھ ایک بوڑھا سا آدمی بھی تھا۔

"دایان صاحب! یہ پرخہ گل بیمار ہے آپ کو تو پتا ہے کہ یہ بیماری جانے والی نہیں لیکن آج تو بے چاری بڑی تکلیف میں ہے، اسے یہاں لے کر آئے ہیں کہ ڈاکٹر کوئی درد کا ٹیکہ لگا دے کہ بے چاری کو کچھ دیر کے لیے آرام آ جائے۔" وہ پریشانی سے بولی تو دایان اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو ترحم بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"آپ وہاں بیٹھ جائیں، میں ڈاکٹر صاحب سے بات کرتا ہوں انہیں کچھ دنوں کے لیے یہاں ایڈمٹ کرلیں گے اور روم کا بھی انتظام کر دیتا ہوں تاکہ آپ لوگوں کو تکلیف نہ ہو، آپ ایسا کریں کہ ان کے پاس کچھ دن رک جائیں میں ماما سے کہہ دوں گا وہاں سے آپ کو چھٹی مل جائے گی۔" وہ ہمیشہ کا درد دل رکھنے والا انسان تھا، اس وقت ایک بے بس عورت کی تکلیف اسے بھی اداس کر گئی وہ درد کی شدت سے تڑپ رہی تھی اور مینو آنٹی اسے تسلی دے رہی تھی۔

"دایان صاحب پلیز، آپ ڈاکٹر سے کہہ دیں کہ مجھے کوئی ایسا انجکشن لگا دے کہ میں مر جاؤں۔" وہ روتے ہوئے فریاد کر رہی تھی۔

قریبی بینچ پر بیٹھا عظیم خان یہ آواز سن کر چونک گئے۔

"یہ...... یہ تو وہ آواز ہے جسے میں لاکھوں ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں۔ پرخہ گل؟" وہ تیزی سے اٹھے اور آواز کی سمت چل پڑے۔ گل لالہ بھی باپ کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی تھی۔

"یہ آواز کہاں سے آگئی ہے؟ شاید اسٹریچر پر لیٹی عورت کی آواز ہے۔"

برسوں سے کبھی اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی نہ کہیں سر راہ ملاقات ہوئی تھی۔

"صبر کرو۔ تم تو بڑی ہمت والی ہو تمہاری قسمت اچھی ہے کہ دایان صاحب مل گئے ہیں ورنہ جانے اسپتال میں کتنی دیر رلتے رہتے ہم لوگ۔"

مینو کی بات تڑپتے ہوئے بولی۔

"آہ میں اور ہمت والی؟" اس کی آواز میں جسمانی کے ساتھ روحانی تکلیف کا درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔

مینو نظریں چرا گئی اس بات پر۔

"پرخہ گل؟" وہ اس کے قریب کھڑے تھے پرخہ نے پہچان کر منہ چھپانا چاہا لیکن ہاتھ نہ اٹھ سکے۔

اس نے برسوں تک ایک دعا مانگی تھی کہ کہیں اس کا سامنا عظیم خان یا اپنی بیٹی سے نہ ہو۔ جن آنکھوں سے کبھی محبت کی روشنیاں پھوٹا کرتی تھیں۔ وہ ان آنکھوں میں ترس نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے وہ سزا آج سامنے تھی جو بہت کڑی تھی اسے جسمانی درد بھول گئے تھے اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ بریسٹ کینسر کی مریضہ ہے اور اس وقت ڈاکٹر اسے جواب دے چکے ہیں اس کا جینا اک ایسی سزا جیسا تھا جس کی معافی نہیں ملتی۔

"یہ عورت کون ہے جس کی آواز بالکل پرخہ جیسی ہے؟" وہ دھیرے سے سوال کر رہے تھے کیونکہ جو عورت سامنے لیٹی تھی وہ کہیں سے بھی کھلتے گلابوں جیسی پرخہ گل نہیں لگ رہی تھی، جس کی آنکھوں میں جگنو چمکتے تھے اور اس کی نیم وا آنکھوں میں تاریکیوں کا راج تھا گھپ اندھیرے جیسی آنکھیں۔ اس کے ہونٹوں پر تتلیاں منڈلاتی تھیں اور اس کے نیلے ہونٹوں پر سسکیوں کی دستک تھی جو صاف سنائی دے رہی تھی۔

"آپ کون ہیں؟ پرخہ کو کیسے جانتے ہیں؟" مینو نے پوچھا تو وہ چونک اٹھے۔

"عظیم خان! تم تو بالکل بھی نہیں بدلے اور میں۔ دیکھو تو کبھی مجھے میرے حسن کی شبنم کو وقت کی دھوپ کھا گئی ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ گھیرے حلقوں والی اس کی ویران آنکھوں میں جھانک کر

پوچھتے کہ ”کہاں گئی وہ پرخہ جس کے مغرور حسن کا وہ دیوانہ تھا؟“

اسی وقت اک نرس اسے اندر لے گئی کیونکہ دایان محمود نے کہہ دیا تھا کہ اسے علاج کی ہر سہولت فراہم کی جائے۔

گل لالہ باپ کی کیفیت اور اس عورت کے لیے بے قراری دیکھ کر حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ یہ معاملہ کیا ہے؟

”میرے خیال میں آپ گھر جا کر آرام کر لیں، میں اور گل لالہ یہیں رکتے ہیں پھر آپ آجائیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔“

وہ تین دن سے ہاسپٹل میں ہی تھے اور بہن کو پل بھر کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔

”میں اسے اپنے ساتھ گھر لے کر جاؤں گا۔ مجھے وہ گھر اس کے بغیر کاٹے گا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ شاہ گل کا خالی کمرہ دیکھ سکوں۔“ وہ منتشر خیالات کے ساتھ بول رہے تھے۔

گل لالہ نے اکتائے ہوئے انداز میں دونوں کی طرف دیکھا تو دایان نے اس کی آنکھوں میں لکھی بیزاری پڑھ لی تھی۔ اس کے میسج پڑھنے کے بعد تو دایان کے دل میں اس خود غرض لڑکی کے لیے عجیب سے جذبات تھے۔ وہ اسے سبق سکھانے کے لیے پلان سوچ رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ اس کے ہر پلان کو شاہ گل ناکام بنا دے گی۔

وہ اگر اسے بتائے گا بھی کہ اس نے کیسے میسج سہیلی کو کیے ہیں تو تب بھی وہ اس کا یقین کبھی نہیں کرے گی۔

وہ کسی صورت اس سے بدگمان نہیں ہو سکتی تھی اتنا تو وہ اسے جان ہی چکا تھا۔

”گل لالہ! آپ ایسا کریں کہ مینو آنٹی کی طرف چلی جائیں، دیکھیں کہ پرخہ گل کی طبیعت کیسی ہے اور ڈاکٹرز خیال کر رہے ہیں یا نہیں۔“

وہ جو خدمت خلق کی سیڑھی رکھ کر اس تک پہنچی تھی، بے زاری سے اٹھنے لگی۔

”ایک تو مجھے اس عورت کے وجود سے عجیب سی الجھن ہوتی ہے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے۔ بابا یہ عورت فرفر انگلش بولتی ہے اور......“ عظیم خان اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولے۔

”ایم اے انگلش کیا ہے اس نے اور...... اتنی قابل تھی کہ سب مثالیں دیتے تھے کہ دیکھو، پرخہ گل بنتی سنورتی بھی ہے۔ فیشن کی دلدادہ اور غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ بھی لیتی ہے اور پھر کامیابیوں کے نئے نئے ریکارڈ بھی قائم کرتی ہے۔ ہم تو حیران ہیں کہ یہ پڑھتی کس وقت ہے۔“

وہ ان دونوں کی حیرانی دیکھ کر بھی اپنی ہی دھن میں بولے جا رہے تھے انہیں یہ یاد ہی نہیں تھا کہ اس عورت کی ایک بیٹی بھی ہے جو اس وقت قریب ہی موجود ہے اور اس سے ماں کا ماضی چھپایا گیا ہے۔

”آپ کیسے جانتے ہیں انہیں؟ کہیں یہ......؟ اوہ خدایا یہ...... یہ میری...... میری ماں ہیں؟“ وہ بینچ پر ڈھے گئی۔

دایان بھی حواس باختگی میں کبھی بیٹی کی طرف دیکھتا کبھی باپ کی طرف۔

”یہ...... وہی ہے...... لیکن نہیں یہ وہ نہیں ہے جو کبھی ہوا کرتی تھی۔“ وہ سر اٹھائے بیٹھے تھے اور ان کی نظروں کا محور وہ دروازہ تھا جس سے وہ اندر لے جائی گئی تھی۔

”گل لالہ! تم گھر چلی جاؤ۔“ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ بیٹی سے التجا کر رہے تھے۔

”کیوں...... آپ کو ڈر ہے۔ آپ کے اور آپ کی ماں بہن کے ڈھائے ہوئے ستم کھل کر میرے سامنے آجائیں گے۔ میری ماں کی اس حالت کے ذمہ دار آپ سب ہی ہیں۔ اک بیٹی کو آج تک ماں کی ایک تصویر تک نہ دکھائی۔

میں نے کبھی کہا نہیں لیکن آپ سب کو میں ہمیشہ سے اپنا مجرم سمجھتی رہی ہوں۔ کبھی میری ماں کا قصور نہیں بتا سکے آپ لوگ، جب بھی میں نے پوچھا

آپ دونوں نے یہ ہی کہا کہ گھریلو جھگڑوں نے گھر توڑا ہے۔ بابا بھی تو صاف لفظوں میں کہہ دیتے کہ میری ماں کی زیادتی اور میری کمزوریوں نے گھر توڑا تھا۔" وہ اپنے جذبات اور آنسوؤں پر اختیار کھو چکی تھی۔ اس لیے آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے اور عظیم خان اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

"کتنا غلط سوچتی ہو تم۔ کاش کہ میں ایک بیٹی کے دل کو چیرنے کی ہمت رکھتا اور صاف لفظوں میں کہہ دیتا کہ تم ایک لالچی اور بدکردار عورت کی بیٹی ہو۔"

وہ تیزی سے اٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی اس سمت جانے لگی جہاں سے پرخہ گل مینو کا سہارا لیے باہر نکل رہی تھی۔

"آپ نے مجھے پہچانا؟" وہ دکھ بھری نظروں سے آنسوؤں کی دھند صاف کرنے کے لیے ہتھیلیوں سے آنکھیں پونچھتے ہوئے پوچھ رہی تھی

"جی بیٹا! آپ اس دن گھر آئی تھیں نا، مینو بھی ساتھ تھی۔" اس کی آواز اب بھی یوں لرز رہی تھی جیسے گہری تھکن سارے وجود میں اتری ہوئی ہو۔ ذہنی و جسمانی درد ناقابل برداشت جو تھے، وہ آگے بڑھی اور بے اختیار اس کے زرد اور مضمحل وجود سے لپٹ گئی ماں نے کمزور سا ہاتھ اٹھا کر بمشکل اس کے سر پر پھیرا۔

"میں آپ کی وہ بیٹی ہوں جسے آپ سے چھین لیا گیا تھا اور چند دن کی اولاد چھین کر آپ کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ ہاں میں ہی وہ محروم بیٹی ہوں اور آپ ہی وہ مظلوم ماں ہیں۔" وہ سسکتے ہوئے بول رہی تھی۔

پرخہ گل کی شرمسار نظریں چند قدم دور کھڑے عظیم خان کی نظروں سے ٹکرائیں اور پھر اس کی آنکھوں میں چھپی حیرانی دایان محمود نے بھی دیکھ لی جیسے کہہ رہی ہو "یہ کیا کر دیا ہے عظیم خان اتنے بڑے احسان کا بوجھ میرے کمزور کندھے کیسے اٹھا ئیں گے وہ تو پہلے ہی آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔"

وہ بیٹی کو چوم رہی تھی۔ اسے سینے سے لگا رہی تھی۔ عظیم خان نے زخمی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلائے ہوئے اسے دیکھ کر سوچا۔

"کاش تم اس وقت اس کو سینے سے لگاتیں جب اسے تمہاری شدید ضرورت تھی۔ بھوک سے بلکتے اس معصوم اور کمزور وجود کے لیے بے غیرت بن کر میں نے تمہاری کتنی منت کی تھی کہ میرے لیے نہیں اس کے لیے کچھ عرصہ گھر میں رہ جاؤ تاکہ یہ ماں کے دودھ کے لیے تو نہ ترسے لیکن تم نے اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا اور اس پگلی نے دل میں کیسی کیسی کدورتیں پال رکھی ہیں یہ تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔"

پرخہ گل کے کمزور اعصاب یہ جذباتی دھچکا نہ سہہ سکے اور نیم بے ہوشی کے عالم میں کچھ مزید میڈیسن دے کر اسے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔

وہ بستر پر لیٹی تھی، دایان نے حیران پریشان سی مینو آنٹی کو شاہ گل کے کمرے میں بھیج دیا تھا اور اب وہ تینوں وہیں تھے پرخہ گل کے پاس۔

وہ ماں کے بیڈ کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی عظیم خان بیٹی کے لیے وہاں بیٹھے تھے حالانکہ دل چاہ رہا تھا اس اجڑی اور لٹی ہوئی عورت کو وہ رنگ روپ اور تازگی و شادابی کہیں سے واپس لا دیں۔

عظیم خان نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔

اس کے سوکھے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن گھسے ہوئے تھے اور ہاتھوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ ان ہاتھوں کو برتن مانجھنے اور کپڑے دھونے پڑتے ہیں، زرد رنگ پر نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں جن میں شاید ڈرپس کی وجہ سے بڑے بڑے نیل بنے ہوئے تھے ہلکی ہلکی لرزش اس کی کمزوری کا احساس دلا رہی تھی۔

ایسے عروج کا یہ زوال ان کی آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔

"شاہ گل کہاں ہے اور بی بی جان کیسی ہیں؟ وہ پیاری سی لڑکی جو مجھے بہت چاہت سے دیکھ دیکھ کر

مسکراتی رہتی تھی ویسے محبت سے مسکرا کر پھر کسی نے نہیں دیکھا۔" حسرت بھرا ایک آنسو سوکھی چمڑی کی شکنوں میں الجھ گیا تھا۔

وہ جس محبت سے اس کی دادی اور پھوپھی کا ذکر کر رہی تھی یہ دیکھ کر تو وہ ماں کی عظمت پر آنکھیں بند کیے ایمان لے آئی تھی۔

"عظیم خان! تمہاری بیٹی بہت پیاری ہے یہ بالکل اپنی دادی پر گئی ہے۔" وہ تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی

"کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں ادے؟ میں تصور میں آپ کو ہمیشہ مختلف ناموں سے پکارتے ہوئے سوچتی تھی۔ حقیقت میں جب آپ میرے روبرو ہوں گی تو میں ان سارے ناموں سے آپ کو پکارا کروں گی۔ کبھی ادے کہوں گی کبھی مورے اور کبھی مورا گئی اور جب ہم بہت خوش ہوا کریں گے اور اس خوشی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے کسی ریسٹورنٹ میں آئس کریم کھانے جایا کریں گے تو میں آپ کو مما یا پھر مام کہا کروں گی۔"

وہ بظاہر بے حس اور بے پرواہ نظر آنے والی لڑکی اتنی حساس ہے اور اس قدر گہرائی میں جا کر سوچتی ہے۔ یہ تو عظیم خان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ایک ہی گھر میں رہ کر بھی وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی اندرونی کیفیات کو آج تک سمجھ نہ سکے تھے۔

"مورا گئی! میری یاد آپ کو کبھی نہیں آئی؟ میں آپ کا انتظار کیا کرتی تھی لیکن کبھی اس انتظار کا ثمر مجھے نہیں ملا۔ اسی ڈر سے نہیں آئی ہوں گی۔ یہ لوگ مجھ سے ملنے نہیں دیں گے یہ ہی ڈر بھی ہمیں ملا نہ سکا ہوگا لیکن کسی طرح آپ میرے اسکول کالج بھی تو آ سکتی تھیں؟"

برخہ گل کی زخمی اور شرمندگی کی تپش سے جلتی ویران آنکھیں عظیم خان سے پل بھر کے لیے ملیں اور ایک بار پھر جھک گئیں۔

"مجھے کچھ کام ہے، کچھ دیر میں آتا ہوں۔" دایان محمود کو اپنا آپ یہاں اضافی محسوس ہوا تو وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

اب وہ تینوں ہی کمرے میں رہ گئے تھے۔

"عظیم خان! اور کتنے احسان کرو گے مجھ پر؟" اس کی آنکھوں کا سوال زبان پر آ گیا تھا۔

"مورے! کیا آپ بابا سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ ان کے دیے ہوئے زخم بھی آپ کو احسان لگتے ہیں؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ چپ تھے۔ کہنے کے لیے جو کچھ تھا وہ کہنے کے قابل نہ تھا اور وہ سب سننے کے لیے بھی بڑا جگرا چاہیے تھا

"میں نے زندگی میں بہت سارے جھوٹ بولے ہیں لیکن میری زندگی کا صرف ایک ہی سچ ہے اور وہ سچ ہے لالچ...... میری اڑان وسیع نیلا آسمان نہیں تھا وہاں سے آگے کا جہاں تھا۔

میں نے وہ سنہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی جن سے اڑ کر میں آسمان سے بھی آگے کے جہان تک پہنچ سکوں اور یہ پر مجھے بی بی جان نے اپنے اعلیٰ کردار اور اعلیٰ مقام پر کھڑے اکلوتے بیٹے کی صورت بخش دیے، وہ شخص محبت اور وفا کا نمونہ تھا۔ اس نے میرے لیے کیا نہیں کیا۔ لیکن میں تو اپنی خواہشوں کے پیچھے اندھی ہو گئی تھی۔

اپنی خواہشات کی آگ میں، میں نے اپنا کردار اپنی عزت اپنی ممتا اور اپنی سگی اولاد بھی جھونک دی لیکن وہ مہربان شخص پھر بھی نہ بدلا۔ میں سوچتی تھی۔ کبھی کہیں ملا تو اس کی آنکھوں میں نفرت اور چہرے پر حقارت نظر آئے گی لیکن...... اس کے چہرے پر آج بھی میرے لیے ملامت نہیں۔" وہ سسکنے لگی تھی گل لالہ کی حیرانی دیدنی تھی۔

"یہ سب کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"برخہ گل! تمہارے لالچ کے کنویں میں تمہارا سب کچھ تو غرق ہوا، میرا ابھی بہت کچھ جھونک دیا ہے تم نے۔ میری غیرت مند ماں یہ سب برداشت نہ کرتے ہوئے موت کی آغوش میں سو گئی۔ تمہارے لالچ کے اس جلتے الاؤ نے میری نازک سی شاہ گل

کے رنگین خوابوں کو بھسم کر دیا۔ اس کا بچپن چھین لیا۔
وہ بول رہے تھے اور گل لالہ کے ساتھ پرخہ بھی رو رہی تھی۔
''کیا بی بی جان مر گئیں؟'' وہ پھر سے سسک اٹھی۔
''پرخہ گل تم سے بہتر کون جان پائے گا کہ وہ مری نہیں ہیں وہ ماری گئی ہیں اور ہم نے اس قتل پر پردہ ڈالے رکھا صرف اس لیے کہ گل لالہ کی نظروں سے یہ قتل چھپا رہے۔''
پرخہ نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پر گل لالہ کی مضبوط گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔
''میں یہ اعتراف کر کے مرنا چاہتی ہوں کہ تمہاری ماں ایک لالچی اور خود غرض عورت ہے جس کی اس بیماری نے اس سمیت اس کے سارے رشتوں کو کھا لیا ہے۔
میں نے عظیم خان سے شادی اس کی دولت کے لیے کی اور اس کے نکاح میں ہوتے ہوئے بھی اپنی محبت، اپنے بچپن کے ساتھی کے ساتھ تعلقات میں رہی میں نے ماں بننے سے بچنے کے لیے بہت کوشش کیں کیونکہ میں اپنے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈال سکتی تھی۔
تمہاری دادی اور پھوپھی کو میں نے ہر طرح سے ستایا لیکن وہ سہتی رہیں، شاید بیٹے کے لیے یا پھر قبیلے میں بے عزتی سے بچنے کے لیے۔
پھر میں نے جب تمہارے باپ سے وہ سب حاصل کر لیا دنیاوی دولت کی شکل میں، جس کی مجھے ضرورت تھی، جس کی مجھے خواہش تھی تو پھر میں نے اسے چھوڑ دیا۔
اپنی چند دن کی اولاد کو شاہ گل کی گود میں چھوڑ کر جاتے ہوئے میرے کانوں میں اس کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں لیکن میرے قدم نہ رک سکے۔''
وہ سر اٹھائے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی ان باپ بیٹی دونوں سے نظر نہیں ملا رہی تھی، ملا بھی کہاں سکتی تھی؟
''بابا! مجھے کیوں بے خبر رکھا میرے اندر غصہ اور نفرت پنپتی رہی۔ میں نے اس عظیم عورت کے ساتھ کیا کیا نہ کیا۔ میں تو ماں سے بھی بڑھ کر ڈائن نکلی باپ اور ماں جیسی پھوپھی کا خون چوستی رہی ان کا کلیجہ نکال کر کھا گئی۔ انہیں گور تک پہنچانے کی پوری کوشش کی۔ ثابت ہوا بابا۔ کہ وراثت میں سب ملتا ہے اچھا یا برا۔
''بی بی جان سے آپ دونوں بہن بھائی کو وہ ساری اچھائیاں مل گئی ہیں۔
اور میری اچھی تربیت بھی میرا کچھ سنوار نہ سکی۔ جنم دینے والی نے خود غرضی کی گھٹی پیٹ میں ہی پلا دی تھی۔'' وہ تڑپ رہی تھی، سسک رہی تھی۔ عظیم خان نے سر جھکایا ہوا تھا اور پرخہ گل نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا تھا۔ کس منہ سے بیٹی کی زبان سے نکلے تلخ ترین الفاظ کا سامنا کرتی۔
''عظیم خان! تم سے طلاق کے بعد عدت کے دن کٹے اور پھر جمال خان سے میں نے شادی کر لی اور اس نے مجھ پر شادی کے بعد وہ سارے ظلم ڈھائے جو میں نے تم پر ڈھائے تھے۔ اس نے وہ سارے فائدے اٹھائے جو میں نے تم سے اٹھائے تھے مجھے وہ سارے روگ لگا تا رہا جو میں تمہیں دے گئی تھی۔
اس نے بے وفائی کی۔ وہ مجھ سے پہلے دو شادیاں کر چکا تھا اور میرے پیسے سے ان کو عیش کراتا رہا جب وہ سب کچھ ختم ہو گیا تو اس نے میرا وہ فلیٹ بھی بکوا دیا جو تم نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔
بھیا اور بھابھی کو میرے کرتوتوں کی خبر ملی تو انہوں نے مجھ سے رابطے ختم کر دیے۔
کوئی ایسا نہ تھا۔ میں جس کے کندھے پر سر رکھ کر رو لیتی۔
میں روز بی بی جان سے اور تم سے معافی مانگتی تھی لیکن سامنے آنے کی ہمت نہ تھی۔
پھر جمال خان نشے کی حالت میں مار پیٹ کرتا میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس پر زخم نہ ہوں

نیل نہ ہوں یہ دیکھو۔" اس نے آستین اوپر کی تو ہڈیوں پر لٹکتے چمڑے پر سگریٹ سے جلنے کے نشان واضح نظر آرہے تھے۔
اس نے دوپٹہ تھوڑا سا ہٹایا اور قریب ہی کرسی پر بیٹھے عظیم خان نے تڑپ کر آنکھیں بند کرلیں جبکہ گل لالہ کی آنکھوں میں بدگمانی کے ساتھ ترس بھی نظر آنے لگا تھا، اس کی گردن پر بھی جلائے جانے کے نشانات تھے۔
"بس کرو، مت اذیت دو مجھے۔"
"تم لوگ شاید نہیں جانتے لیکن میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے میں کینسر جیسے موذی مرض میں گرفتار ہوں۔ ایک دن باوجود پارٹ ٹائم کرنے کے میرے پاس اس کے نشے کے لیے کچھ نہیں تھا وہ پہلے تو منت کرتا رہا۔ پاؤں پکڑ لیے کہ نشہ ٹوٹ رہا ہے پھر غصے میں مجھے مارنے لگا اور جب مارتے مارتے تھک گیا تو اس نے بھاری ایش ٹرے میری طرف پھینکا جو سیدھا سینے میں لگا اور اسی وقت درد کی شدت سے بڑا سا گومڑ بن گیا میرے پاس پیسے نہیں تھے کہ میں ڈاکٹر کو دکھاتی اسی لیے اگنور کرتی رہی اور جب اس میں سے پیپ رسنے لگی اور زخم بن گیا تب ڈاکٹر کو دکھانا مجبوری تھی ڈاکٹر نے ٹیسٹ دیے اور دایان محمود صاحب کا احسان کہ ٹیسٹ کروائے اور ڈاکٹرز نے کہہ دیا کہ کینسر پھیل چکا ہے
ان ہی دنوں جمال بھی نشے کی زیادہ ڈوز لینے سے مر گیا اور باوجود نوکری کرنے کے میرے پاس کچھ نہ تھا کہ میں اس کے کفن دفن کا انتظام کرتی۔ خیر ایک اذیت بھری زندگی کی شام ہے اب تو۔ میں شاہ گل سے بھی معافی مانگنا چاہتی ہوں پلیز اسے میرے مرنے سے پہلے مجھ سے ملوادیں۔" وہ اب نیم غنودگی میں تھی۔
شاید درد کے انجکشن نے اب اثر کیا تھا۔ وہ ماں کے کمزور سے وجود کو چادر سے ڈھانپ کر باہر نکل آئی عظیم خان بھی اس کے پیچھے تھے۔
وہ سیدھی شاہ گل کے قدموں میں بیٹھ کر معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن عظیم خان نے اسے منع کر دیا۔
"ابھی وہ بہت بڑے جذباتی دھچکے سے گزر کر آئی ہے وہ تمہارے آنسو دیکھ کر بکھر جائے گی۔"
وہ سر ہلاتے ہوئے باپ سے لپٹ گئی۔
"سوری بابا! میں بہت بری ہوں لیکن آپ بھی تو قصوروار ہیں نا۔ کہ آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہمیشہ خود کو اور دادی کو ہی قصوروار ٹھہراتے رہے۔"
"وہ اپنے گناہ کا اعتراف نہ کرتی تو تم ہم سے خفا رہتیں؟" وہ شرمندہ تھی۔
"میں بہت کم فہم ہوں نا؟"
"مینو آنٹی! آپ شاہ گل کے پاس نہیں تھیں؟" وہ انہیں کینٹین کی طرف سے آتا دیکھ کر پوچھنے لگی۔
"ان کے پاس وہ ہیں جن کے ہونے سے ان کی بیماری اور تکلیف ختم ہوگئی ہے۔"
وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو وہ شاہ گل کے پاس کمرے میں بیٹھا تھا۔
گل لالہ کو دیکھ کر شاہ گل کی رنگت متغیر ہوگئی اور وہ صفائی پیش کرنے لگی۔
"میں اکیلی تھی، ہوش میں آتے ہی لالہ کو پکارا تب نرس انہیں لے آئی۔"
وہ شاہ گل کا ماتھا چوم کر وہیں بیٹھ گئی۔
"جب آپ کے پاس دایان محمود ہیں تو پھر آپ کسی اور کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہیں؟" وہ نرم اور میٹھے انداز میں بولی تو دایان چونک کر اسے دیکھنے لگا اس کے میسجز یکدم سے نظروں کے سامنے آگئے تھے۔
"کسی اور؟ تم اب بھی خود کو مجھ سے جدا سمجھتی ہو؟ میرے وجود کے دو حصے ہیں۔ ایک تم اور دوسرے لالہ۔" اس کی چاہت آنکھوں میں نمی کی صورت میں چمک رہی تھی۔
"ڈاکٹر نے جو ڈسچارج کرنے کا کہا ہے وہ کام رہ جائے گا۔ چلیں لالہ آپ لوگ گھر جانے کی تیاری کریں پھر وہیں ملتے ہیں۔"

دایان محموداور عظیم خان باہر نکل گئے جبکہ وہ شاہ گل کے پاس اکیلی رہ گئی۔

"شاہ گل بو! میری ماں مل گئی ہیں۔"

وہ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی یکدم اس کی آنکھوں میں خوف نظر آنے لگا۔

"کہاں ہیں وہ اور کیسے ملیں؟ تم سے کیا کہا۔ لالہ کو خبر ہے؟" کئی سوال جلدی جلدی کرتے ہوئے وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔

"آپ یہ بتائیں کہ آپ خوش ہوئی ہیں یا خفا؟"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تو شاہ گل نے اداسی سے کہا۔

"میری کیا لگتی ہیں وہ کہ میں ان کے لیے خوش یا اداس ہوں؟"

"مجھے انہوں نے اور بابا نے سب کچھ سچ بتا دیا ہے اور۔ مجھے بھی آپ سے معافی مانگنی ہے کہ میں آپ سے اور بابا سے بدگمان رہی کہ میری ماں مظلوم تھی اور دادی پھوپھی اور باپ ظالم تھا تبھی میری ماں نے گھر چھوڑا۔"

چیزیں سمیٹتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا تو شاہ گل اس کی طرف تشویش سے دیکھنے لگی۔

"بہت تکلیف دہ ہے نا یہ سچ۔ بہت تلخ بھی اسی لیے یہ تکلیف یہ سچ ہم تمہیں چھپانا نہیں چاہتے تھے یہ عمر بھر کا روگ تھا۔ ہر وقت کے طعنے تھے جو تمہیں سننے پڑتے۔ ہم نے سارا قصور اپنے سر لے لیا۔"

وہ سمجھ داری سے سر ہلا رہی تھی۔ سنجیدہ بردبار اور اداس سی یہ لڑکی آج بہت الگ بہت مختلف سی لگ رہی تھی۔

"کدھر ہیں وہ اور...... اور کس حال میں ہیں؟"

وہ تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

"اسی ہاسپٹل کے کمرے میں اور بہت تکلیف میں ہیں۔ وہ بریسٹ کینسر کی مریضہ ہیں اور آپ سے معافی مانگ کر بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہیں۔" گل لالہ آہستہ سے بولی تو شاہ گل کا دل دکھ گیا۔

"اور...... اور وہ جمال خان جس کے لیے انہوں نے میرے بھائی کو ٹھکرایا تھا؟"

"وہ چند ماہ پہلے مر گیا ہے، آپ کے، میرے اور بابا کے سارے بدلے ان سے لے کر۔ وہ قابل رحم حالت میں ہیں۔ موت اور زندگی کی کشمکش میں معافی کے چند حرفوں کے لیے ترس رہی ہیں۔"

شاہ گل کا نازک سا دل دکھ گیا۔ کتنی آن بان والی تھیں، وہ غرور حسن میں مبتلا سر اٹھائے چلتیں تو زمین زادا انہیں دکھائی ہی نہ دیتے تھے۔

"کیا آج میں انہیں نظر آؤں گی کیا وہ میری طرف دیکھیں گی؟ میں تو ان کی ایک نظر کے لیے ایک بار اپنی طرف دیکھنے کے لیے ترس جاتی تھی، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں" وہ جلدی سے بولی تو گل لالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بابا سے پوچھ کر میں آپ کو ان سے ملواتی ہوں شاید آپ کے اندر کی نفرت کچھ کم ہو جائے۔ ان کی حالت دیکھ کر۔" وہ بولی تو شاہ گل نے اسے گھورا۔

"تم جانتی ہو کہ میں کسی سے نفرت نہیں کرتی پھر بھی؟"

اس نے شاہ گل کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کا گال چوم لیا۔

"جی ہاں، میری شاہ گل بو سراپا محبت ہیں یہ تو سب جانتے ہیں۔" وہ اسے شال اوڑھا کر بولی تو شاہ گل درد چھپا کر مسکرا دی۔

"ہاں جانم! تمہاری شاپنگ ادھوری رہ گئی ہے اور دن بہت کم، میں نے تم سب کو بہت پریشان کر دیا ہے اور ساری خوشیاں بھی خراب کر دی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"نہیں۔ اب تو میرے لیے خوشیوں کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"فکر نہ کرو میری شہزادی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ شاہ گل کے پریشان چہرے کی طرف دیکھنے

لگی اسے اب بھی فکر تھی تو گل لالہ کی خوشی کی۔

☆☆☆

"یہ...... یہ...... پرخہ گل تو نہیں ہیں۔" وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلائے جا رہی تھی۔

"پہلے بھی فقط نام ہی پرخہ گل تھا، مجھ میں صفت تو کوئی نہ تھی نام والی۔ اب تو خوشی یہ ہوتی ہے کہ اندر جیسا باہر بھی ہو گیا ہے پہلے باہر سے کھلی کھلی شاداب تھی خوب صورت اور معصوم بھی لیکن اب تو اندر کی طرح بدصورت نظر آتی ہوں چلو منافقت کچھ تو کم ہو گئی۔" وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

"مجھے معاف کر دو گی تو مرنا آسان ہو جائے گا۔"

وہ اس کے قریب آئی اور سسکتے ہوئے ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرے لالہ کو بہت رلایا ہے آپ نے۔ ساری ساری رات بالکونی میں بیٹھ کر سگریٹ پیتے ہوئے گھپ اندھیرے کو گھورتے رہتے تھے۔

انہوں نے کبھی آپ سے نفرت نہ کی۔

جب آپ کے جانے کے بعد بی بی جان آپ کو بددعائیں دیتیں تو لالہ صدقہ دیتے تھے۔ میں نے سنا تھا ڈرائیور کو کہہ رہے تھے۔ یہ پیسے فلاں یتیم خانے میں دے آؤ کبھی کبھی دکھے دل والوں کی بددعائیں لگ بھی جاتی ہیں۔"

وہ رو رہی تھی۔ گل لالہ اور پرخہ بھی سسک رہی تھیں

"بس کر دو۔ پلیز۔ تم تو بہت نرم دل والی ہو نا، یاد ہے جب ہماری شادی والے دن بی بی جان نے کالا بکرا منگوایا تھا اور میں نے اس پر ہاتھ رکھا تھا اور جب اسے ذبح کرنے لگے تو تم رونے لگی تھیں اور ضد کرنے لگیں کہ بی بی جان اسے معاف کر دیں، اسے ذبح نہ کریں اور پھر تم کتنے ہی دن اداس رہی تھیں۔ میری حالت پر بھی رحم کرو شاہ گل اور...... اور مجھے معاف کر دو مجھے نجات چاہیے۔"

وہ آگے بڑھی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر نرمی سے سہلاتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے اور یقین رکھیں کہ اللہ بھی آپ کو معاف کر دے گا۔ غلطی کا احساس ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے بندے پر مہربان ہے۔"

وہ سکون سے چھت کی طرف منہ کر کے جیسے چھت سے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگی، اس کے چہرے پر گہرا سکوت تھا جیسے بہت بڑے طوفان کے بعد ہوتا ہے۔

☆☆☆

"یہ...... یہ...... تم کیا کہہ رہی ہو تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

عظیم خان نے بے یقینی سے بہن کی طرف دیکھا۔

"لالہ! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں آپ ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کہاں جائیں گی، ان کا اس دنیا میں ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔"

وہ اس عورت کی وکالت کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں پریشانیاں آئی تھیں۔

عظیم خان کی پرتفکر آنکھیں ہاتھ میں پکڑی کتاب پر جمی تھیں۔

"لالہ! وہ مر رہی ہیں اور مرتے ہوئے شخص کو معاف کر دینا چاہیے۔"

وہ بھائی کے پاؤں میں بیٹھ گئی تھی۔

"میں اسے معاف کر چکا ہوں لیکن اسے اب کسی گھر کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹرز نے کہا ہے وہ دنیا میں چند دنوں کی مہمان ہے۔"

"آپ ان سے نکاح کر لیں بھائی! انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے بڑی عاجزی سے کہا کہ میں مروں تو لوگ کہیں زوجہ عظیم خان فوت ہوئی ہیں۔ کوئی یہ نہ کہے کہ بیوہ جمال خان مر گئی ہے۔ انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا ہے کہ مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش سمجھ کر یہ آرزو پوری کر دو۔" شاہ گل اداس تھی۔

"ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ باہر لے جائیں تو ان کو کچھ وقت مل سکتا ہے۔" وہ سوچوں میں گم بولے۔

"ٹھیک ہے لالہ! اس طرح تو اور بھی اچھا ہو جائے گا۔ آپ انہیں باہر لے جائیں گے تو محرم نامحرم والی بات بھی ختم ہو جائے گی۔ بس آپ ان

سے ایک بار مل لیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ سے۔" وہ سر ہلا کر رہ گئے اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی گل لالہ عظیم خان نے اپنے باپ اور پھوپھی کی عظمت کے احترام میں سر جھکا لیا اور اسی عظمت کے احترام میں آنسوؤں کو بہنے دیا۔

☆☆☆

"تم نے جانا نہیں ہے شاپنگ کے لیے؟ شادی میں تھوڑے دن ہی رہ گئے ہیں۔۔ کافی وقت ضائع ہو گیا ہے میری بیماری کی وجہ سے۔"

وہ نظریں چرا کر کہہ رہی تھی۔

"جی بس ابھی آرہا ہے، میرا منگیتر۔ اسے اتنا بھی خیال نہیں کہ مجھے خوش کرنے کے لیے وقت سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ پہلے آجاتا اس بے وقوف کو اتنی عقل ہوتی تو پھر رونا کس بات کا تھا؟"

وہ اس کے بدتمیز انداز پر اسے گھورنے لگی

"ان کی عزت کیا کرو، یہ انداز بہت برا لگ رہا ہے۔" اسے عجیب سا لگا۔

"جی جی۔ جیسا آپ کہیں گی، میں ویسا ہی کروں گی۔" پہلے کبھی ایسی تابعداری نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔

"لالہ اور برخہ بھابھی کا نکاح بھی ہو گا کل شام کو۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ارے ارے۔ میرے بابا کی شادی کرا رہی ہیں۔ خیر ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے یہ بھی لیکن وہ میری سوتیلی ماں بن کر اس گھر میں آئیں گی کیونکہ سگی تو پہلے سے گھر میں موجود ہے۔"

گل لالہ نے اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ بھی اس سے لپٹ گئی۔

"بہت تنگ کیا ہے نا آپ کو اور بابا کو؟ لیکن پلیز اسے میری بے وقوفی سمجھ کر مجھے معاف کر دیں۔"

وہ مسکرا دی۔

"تم شاید نہیں جانتیں کہ میں اپنی جان سے بھی بڑھ کر تم سے پیار کرتی ہوں اور جن سے پیار کیا جاتا ہے ان کی کوئی خطا...... خطا نہیں لگتی۔"

"آپ کتنی اچھی ہیں، ساری زندگی میری خوشیوں کے لیے خود کو پریشان رکھا اور مجھے آپ کی کوئی قدر ہی نہیں تھی۔"

"چلو ابھی تو عمر باقی ہے، آگے میری قدر کر لینا۔"

وہ بھی پیار سے بولی۔

"آپ کی قدر میں نے آج سے ہی شروع کر دی ہے۔"

گاڑی کا ہارن سن کر وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

"لو آگیا ہے وہ بے وقوف، پورے ٹائم پر آیا ہے۔"

شاہ گل کی رنگت متغیر ہو گئی۔

"تم لوگ جاؤ پلیز، پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔"

"نہیں وہ اندر آئے اور آپ سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔ بہت ادب کرتا ہے آپ کا۔"

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ"

وہ آنے والے کی آواز سن کر چونک گئی۔

"ارے بچے تم؟" وہ تو ارسل خان تھا۔

ہشاش بشاش مسکراہٹ لبوں پر سجائے خوب صورت کرتا شلوار اور واسکٹ میں ملبوس جیسے کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آیا ہو۔

"جی شاہ گل بوا! ہم نے آج شاپنگ کے لیے جانا ہے، بس دعا کریں کہ آپ کی یہ نک چڑھی بھتیجی کسی ایسی چیز پر بضد نہ ہو جائے جو میری قوت خرید سے باہر ہو۔ اگر ایسا ہوا تو ارسل خان خود کو بیچ دے گا مگر اس کی فرمائش ضرور پوری کرے گا۔"

اس کی آنکھوں میں تو ہر وقت گل لالہ کے لیے محبت ہوتی تھی لیکن آج تو زبان پر بھی وہی محبت کی شوخی تھی اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ جھٹ سے بولی۔

"ارے تمہیں کون خریدے گا ارسل خان صاحب! اور اگر ردی والے کو بیچ بھی دوں تو دو چھوہارے ہی ملیں گے تمہارے بدلے میں۔"

وہ حیرانی سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"فکر نہ کرو ارسل خان! مجھے یہ احساس ہو چکا ہے کہ چیزیں قیمتی نہیں قیمتی تو رشتے اور جذبات ہوتے ہیں، میں اب ان کی قدر کروں گی۔ اور ہاں

میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ گل لالہ عظیم خان کو قیمتی چیزوں سے سجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو الحمد اللہ عام بھی پہن کر اسے خاص کر دیتی ہوں لیکن سنو وہ برائیڈل سوٹ میں نے ہرگز نہیں لینا جو ہر ڈمی نے پہنا ہوتا ہے اور پکی تماشے والی پکی مجھے نہیں بننا سمجھے؟" اس کے انداز میں غرور نہیں تھا بلکہ فخر تھا اور یہ بدلاؤ بہت انوکھا سا لگ رہا تھا
"لیکن......لیکن......گل لالئی تم نے تو......؟"
اس کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔
"ہاں شاہ گل بو! وہ بھی آرہے ہیں اپنی شادی کی شاپنگ کے لیے۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ پھوپھی کیا سوچ رہی ہے۔
وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔
"چلو ارسل دیر ہو رہی ہے۔ پیسے تو ہیں نا تمہارے پاس۔" وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔
دونوں ہنستے مسکراتے چلے گئے اور وہ ساکت کھڑی سوچتی رہ گئی، یہ ساری صورتحال سمجھ میں نہ آنے والی تھی۔
"شاہ گل!" عظیم خان نے اسے بڑے پیار سے پکارا۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ وہ ابھی اندر داخل ہوئے تھے اور بیٹی کی طرح ان کا چہرہ بھی کسی انوکھی خوشی کی چغلی کھا رہا تھا۔
"لالہ وہ......ارسل خان اور......اور......"
وہ اطمینان سے بولے۔
"میں جانتا ہوں، دونوں باہر گئے ہیں۔ میں نے ارسل اور گل لالہ کی بات پکی کر دی ہے۔"
وہ اس کے قریب آکر سر پر ہاتھ رکھے بولے تو اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔
"تو......دایان محمود کا کیا ہوگا؟" اسے پریشانی لاحق ہوئی۔
"اس کا کیا بنے گا، یہ تم سوچو۔"
"گل لالہ تو ارسل کو انکار کر چکی تھی پھر؟"
"میں نے تو انکار نہیں کیا تھا اور انکار اقرار کا حق تو مجھے حاصل تھا، میں نے یہ حق استعمال کر لیا ہے، اس میں حیرانی کس بات کی ہے؟"
وہ چپ تھی
"میں چلتا ہوں اب۔" وہ نکل گئے۔
"اب بات تصور سے آگے کی ہے شاہ گل مائی فرینڈ۔" وہ اس کی آواز سن کر اچھل پڑی۔
"آپ......آپ یہاں؟"
وہ دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔ وہ اسے گھور رہا تھا۔
"میرا دل چاہتا تھا کہ تمہیں خوب جلاؤں جیسا تم نے مجھے جلا جلا کر مار دیا ہے لیکن پھر سوچا کیوں اپنی زندگی کا سب سے قیمتی وقت ضائع کروں پہلے ہی تمہاری بے وقوفیاں میری زندگی کو کھا گئی ہیں۔"
وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔
"تم ہو بے وقوف اور تم نے دوست ہو کر اپنے فرینڈ کو دھوکا دیا ہے، یاد کرو کس قدر آسانی سے مجھے اس بے وقوفوں کی ملکہ کو سونپ دیا تھا۔ میں اتنا غیر اہم ہوں کیا؟" وہ اس سوال پر کسمسانے لگی۔
"آسانی سے؟ موت کو گلے لگانا آسان ہوتا ہے کیا؟" وہ زمین پر سے اٹھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔
"میری شادی میں شرکت کی دعوت ہے بطور دلہن۔"
وہ چونکی۔
"اب پریشان نہ ہونا سمجھیں؟ گل لالہ کو میری دولت سے دلچسپی تھی اور وہ تمہیں دشمن سمجھ کر سزا دینا چاہتی تھی۔ لیکن غلط فہمی دور ہوئی اور ماں سے اس کے گناہوں اور غلطیوں کی تفصیل سن کر وہ اپنے کیے پر بہت پچھتائی کہ وہ تو بے قصوروں اور مظلوموں کو سزا دے رہی تھی۔
اور پھر سب ٹھیک ہو گیا۔
"اور اب تم میری دلہن بنو گی اگر میرے لیے کوئی اور مناسب رشتہ دیکھ کر یہ ضد نہ کرو کہ اسے دلہن بنا لیں۔" وہ ہنسنے لگی۔ کھڑکی سے جھانکتی روشنی کی کرن بھی مسکرائی تھی۔

زارا ہنجرا

افطار پارٹی

برکتوں اور رحمتوں کے مہینے کی آمد آمد تھی۔ بچے بڑے سب ہی پُرجوش تھے۔ امبرین، ثمرین تو اس بار کچھ زیادہ ہی پرجوش نظر آ رہی تھیں۔
"اچھا اب اور کیا لکھوں؟" ثمرین نے لکھتے

لکھتے رک کر امبرین سے پوچھا، اس نے کچھ سوچتے ہوئے کنپٹی مسلی...... "آں۔ اچھا جو لکھا ہے ذرا پڑھ کے بتاؤ۔" دونوں سودے کی لسٹ لکھنے بیٹھی تھیں تو امبرین نے غالباً اسے یہ چوتھی بار کہا تھا وہ جی بھر کے بدمزا ہوئی مگر اپنی بیزاری بالائے طاق رکھتے ہوئے چوتھی بار بھی جہاں تک لکھا تھا پڑھ کے سنا دیا۔ میدہ۔ بیسن۔ شاہی پکوڑیاں۔ اسپیگھٹی۔ سویا ساس۔ چلی ساس۔ چکن کیوب۔

"اچھا، اچھا اب تم تمام مسالا جات کے نام بھی لکھ دو۔" امبرین نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

"چلیں جی ایک کام تو مکمل ہوا۔" طویل ترین گروسری لسٹ لکھنے کے بعد وہ اتنی خوش تھیں جیسے کوئی انعام جیتنے والی ہوں۔

رمضان المبارک کی آمد کے احساس سے امبرین، ثمرین بھی متحرک ہو گئی تھیں، رمضان میں خاص اہتمام کے لیے پلاننگ کرنے بیٹھیں، امبرین نے سارا شیڈول ترتیب دے دیا۔ پورے رمضان کے لیے وافر راشن منگوایا جائے اور تمام دیسی بدیسی کھانوں کے اجزا اور مختلف مسالہ جات جو کہ پچھلے ایک ماہ سے ثمرین نیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر رہی تھی، اس کے بعد پورے گھر کی صفائی جس میں تمام کمروں کے پردے، کور، بیڈ شیٹ، کوئی اکا دکا قالین کا ٹکڑا سب کچھ دھو دیا جائے گا، تمام کراکری دھو کر شوکیس اور کچن کیبنٹ میں سجائی جائے اور پھر شیڈول کے مطابق عمل درآمد بھی شروع ہو گیا۔

☆☆☆

"ماشاء اللہ ذرا سی سیٹنگ اور ڈیکوریشن سے کتنا خوب صورت لگ رہا ہے ہمارا گھر۔" سارے کاموں سے فارغ ہو کر نہا دھو کر بیٹھیں تو زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے گھر میں قرینہ اور نفاست دیکھ کر سیر نہ ہو رہی تھیں اور اس سب کا کریڈٹ جاتا تھا ان کی نئی نویلی بیاہ کر آئی دیورانی صاحبہ کو۔

عتیق، انیق کے لیے اماں اپنی چہیتی بھانجیوں (امبرین، ثمرین) کو کئی سال پہلے بیاہ لائی تھیں۔

"میرے گھر میں اللہ کی دی ہر نعمت ہے، میری بھانجیاں راج کریں گی تو میرا کلیجہ بھی ٹھنڈا رہے گا۔" اکلوتی بیٹی فائزہ جو بھائیوں سے بھی بڑی تھی۔ بچپن میں ہی اس کی نسبت بھائی کے اکلوتے سپوت سے طے کر دی تھی۔ بیٹی بیاہ کر میکے بھیج دی اور اپنے گھر میں بھانجیاں لے آئیں، کیا خوب تھی شکر بنایا تھا انہوں نے۔ تینوں رشتے واقعی تھی شکر ہی تھے۔ فائزہ آپا اپنے گھر پر راج کر رہی تھی۔ ساس نے پہلے دن ہی چابیوں کا گچھا تھما دیا۔ "تمہاری سلطنت خود ہی سنبھالو...... ہم تو اب اللہ اللہ کریں گے۔"

اور ادھر بھانجیاں خالہ کی خدمت میں جی جان سے حاضر رہتیں۔ نند کو بھی ہمیشہ بڑی آپا کا درجہ دیا تھا، محبتیں دن بہ دن بڑھتی گئیں۔

بس اماں کو ساری زندگی ایک ہی صدمہ رہا۔ "کاش میرے بھائی کی کوئی بیٹی ہوتی یا بہن کو ہی ایک اور بیٹی ہو جاتی تو میں اپنے منیب کے لیے بھی لے آتی۔"

اماں دو سال پہلے فوت ہو گئیں تو اب فائزہ آپا کو ذمہ داری کا احساس ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہونہار، خوب صورت خوب سیرت بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی مہم شروع کرتیں، یہ کام منیب نے خود ہی کر لیا۔

میرب ہاؤس جاب کے لیے ان کے ہاسپٹل میں آئی تو اکثر ڈاکٹر منیب سے ملاقات ہونے لگی۔ دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے، بات ایک ساتھ چائے پینے سے لنچ تک ہوتے پروپوزل تک پہنچی تو منیب نے تاخیر نہ کی اور میرب نے بھی بلا حیل وحجت شرف قبولیت بخشتے ہوئے اسے گھر آنے کی اجازت دے دی۔

میرب کے عالی شان بنگلے میں داخل ہوتے ہی انہیں اپنا اور ان کا کلاس ڈیفرنس نظر آ گیا تھا۔ ویل فرنشڈ تھا۔ قیمتی پینٹنگز اور دیگر شاہکاروں سے دیواروں کو سجایا گیا تھا۔ گھر میں بیک وقت کئی ملازم کام کر رہے تھے۔

"اتنے امیر لوگ کیا ہمارا پرپوزل قبول کریں

گے فائزہ آپا تو دل ہی دل میں پریشان ہونے لگیں۔
ایسی ہی حالت عتیق، انیق کی تھی لہٰذا امبرین ثمرین تو
بار بار دیواروں پر جگہ جگہ میٹل اور اعیکس فریم میں
لگے شیشے میں بھی اپنے چہرے دیکھتیں تو کبھی نظریں
اپنے ہاتھوں پہ جاتیں، کبھی ذہنوں میں ان کے اور
اپنے لباس کا فرق آجاتا۔

چائے کی میز پر کراکری دیکھ کر ہی ٹھٹھک گئیں اور
جو لوازمات چائے کے ساتھ تھے ان میں کافی چیزیں
ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ میٹھی
ہیں یا نمکین (کیا پتا کسی آئٹم کے ساتھ چٹنی یا کیچپ
نکالیں تو بعد میں چکھ کر پتا چلے کہ وہ میٹھی ہو) سو کوئی بھی
ایسی چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جسارت نہیں کر
رہا تھا۔ بس جو جو چیزیں منیب نے اٹھائیں سب نے
اسی کی تقلید کی، چائے کے دوران ہی لڑکی کے والد نے
اپنی فیملی کا تفصیلی تعارف کرایا اور پھر لڑکی دیکھ کر تو
آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں بے حد حسین، نازک سی پری
پیکر لڑکی بھلا ان کے دس مرلہ کے گھر میں عام سے لوگوں
کے ساتھ کیسے ایڈجسٹ کرے گی۔ امبرین، ثمرین نے
ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا۔

☆☆☆

منزل ایک ہو تو راہیں خود بخود ہموار ہوتی چلی جاتی
ہیں۔ تمام رسومات بخوبی انجام پائیں۔ وہ لوگ میرب کو
فرنشڈ بنگلہ دینے کا ارادہ رکھتے تھے مگر منیب نے بڑے
مہذب انداز میں انکار کر دیا بہرحال پھر بھی جو جہیز
انہوں نے دیا تھا، وہ کروڑوں میں تھا ڈیفنس میں پلاٹ
بھی دیا۔ منیب نے بھائیوں کی مشاورت سے پوش ایریا
میں خوب صورت اور لگژری گھر کرایہ پر لیا تھا کیونکہ
راتوں رات نیا گھر بنانا تو ممکن نہیں تھا۔ میرب رخصت
ہو کر وہیں آئی اور سب لوگ بھی دو ہفتے تک وہیں رہے
تھے۔ رشتہ کرنے سے شادی تک کے دورانیے میں ہی
سب لوگ میرب کی فیملی کی امارت، رکھ رکھاؤ، لائف
اسٹائل سے کافی متاثر ہوئے تھے لیکن امبرین، ثمرین تو
زیادہ ہی مرعوب ہوتی نظر آئیں۔ دونوں عجیب سے
کمپلیکس کا شکار ہو رہی تھیں اور جب دلہن گھر آئی تو اس
کا لائف اسٹائل، اٹھنا بیٹھنا، دیکھ کر انہیں اس سے کمتر
ہونے کا احساس ہونے لگتا۔"

دو ہفتوں بعد جب وہ گھر لوٹیں تو انہوں نے
ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بھی اپنا طرز زندگی بہتر کریں گی
صرف بہتر نہیں بلکہ میرب کے لیول کے مطابق۔ سو
انہوں نے کمر کس لی۔ بچوں سے روزانہ انگلش کے کئی
الفاظ سیکھے جاتے۔ شکر ہے ثمرین کو اسمارٹ موبائل
استعمال کرنا آتا تھا تو وہ انٹرنیٹ سے بھی کافی مستفید
ہو رہی تھیں۔ مارننگ شوز بھی بڑی دلچسپی سے دیکھنے
لگیں (اور کچھ نہیں تو ہوسٹ کے کپڑے اور اسٹائل
ہی کاپی کرلیں گے۔" رمضان المبارک کا اس بار
خاص الخاص، معمول سے ہٹ کر اور استطاعت سے
زیادہ اہتمام بھی یقیناً اسی پلاننگ کی ہی ایک کڑی تھا۔

☆☆☆

"رمضان المبارک کا چاند نظر آ گیا ہے۔"
اعلان ہوتے ہی ایک دوسرے کو مبارک باد دینے کا
سلسلہ شروع ہو گیا، میسجز، رمضان کے متعلق اسٹیٹس
بھی اپ لوڈ ہونے لگے۔

"فائزہ آپا یہاں ہوتیں تو فوراً مبارک دینے
آجاتیں۔"

انیق کو بہن کی یاد ستائی جو دو ہفتے قبل ہی عمرہ
کرنے گئی تھیں۔ آپا کے شوہر نامدار سعودی عرب میں
کاروبار کرتے تھے اس لیے آپا ہر سال عمرہ کے لیے
جاتی تھیں۔ آپا کے جانے سے ہی ان دونوں بہنوں کو
موقع ملا تھا ورنہ آپا اس اچانک۔ تبدیلی پر انہیں ضرور
ٹوک دیتیں۔

پہلی سحری کا خوب اہتمام ہوا۔ تمام بچوں نے
بھی ماؤں کا جوش دیکھ کر روزہ رکھا تھا، افطاری کے
لیے نیٹ سے لی ہوئی ترکیبیں بھی کام آ رہی تھیں۔
دونوں بھائی کاروباری تھے اور کاروبار میں اتار
چڑھاؤ تو ہوتا ہی ہے۔ کبھی نوٹوں کی ریل پیل تو کبھی
جیبیں خالی۔ بچوں کی اسکولنگ اچھی تھی وہاں کے

خرچے ہی کافی تھے مگر یہ بیگمات نے تبدیلی کے چکر میں کافی خرچ کروادیا تھا لیکن دونوں تھے تحمل مزاج سو عورتوں کے کاموں میں نکتہ چینی نہ کرتے تھے۔ دونوں بہنیں لائف اسٹائل گروم کرنے کے چکر میں شوہروں کی جیبیں خالی کروارہی تھیں۔

"دسویں روزے کو فائزہ آپا واپس آرہی ہیں۔ کیوں نہ گھر میں افطاری رکھ لیں۔ میرب اور منیب کو بھی بلا لیں گے۔ وہ بھی تو دیکھیں کہ ہم کوئی ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں۔ امبرین نے رازداری سے بہن سے کہا۔

"ارے آپا! افطاری نہیں افطار پارٹی کا لفظ استعمال کرو...... اب ہم ایڈوانس ہوگئے ہیں۔"

اس نے بہن کو سمجھاتے ہوئے آخر میں کندھے اچکائے۔ تو دونوں ہنس پڑیں۔

"ویسے یہ تو بہت بڑے گھر کی ہے لیکن اس نے تو ابھی تک ایسی کوئی پارٹی نہیں رکھی، خیر سے آج پانچواں روزہ ہوگیا ہے۔" امبرین کو تشویش ہوئی۔

"منیب نے منع کیا ہوگا کیونکہ آپا بھی تو یہاں نہیں ہیں۔ ویسے آپ کا آئیڈیا بہت اچھا ہے کہ جس دن آپا آئیں، اسی دن افطار پارٹی رکھ لیتے ہیں بلکہ میں تو کہتی ہوں آج عتیق بھائی اور انیق سے بات کر کے رات کو منیب کو بھی اطلاع کردیتے ہیں، یہ نہ ہو وہ محترمہ پہل کرکے ہماری پلاننگ پر پانی پھیر دیں۔" ثمرین نے آگے کی سوچی۔

☆☆☆

"ارے واہ! گھر کا تو نقشہ ہی بدل گیا ہے۔" فائزہ آپا نے حیران ہوتے ہوئے سارے گھر کا جائزہ لیا۔ دونوں بہنوں نے تفاخر سے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو کہنی ماری۔

"آپا کہیں میرب کے سامنے بھی ایسی کوئی بات نہ کردیں؟" ثمرین کو تشویش ہوئی۔

"ہوں...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" امبرین نے بھی سر ہلایا۔

"لیکن ہم آپا کو باتوں میں مصروف رکھیں گے تو انہیں خیال نہیں رہے گا۔

میرب منیب بھی آگئے تھے۔ دونوں نے بڑے پرجوش انداز میں دیورانی کا استقبال کیا منیب بھی اس واضح تبدیلی پر اچھا خاصا حیران ہوگیا اور حیرت سے تو ابھی تک فائزہ آپا بھی نہیں نکلی تھیں۔

میرب کو بھی ان دونوں میں کافی چینج نظر آیا تھا کہاں تو پہلے سیدھے سادے سے عام کپڑے، تب تو اس سے بات کرتے بھی کتنا جھجکتی تھیں مگر آج بریزے کے ایمرائیڈڈ سوٹوں میں ملبوس اوپر سے کریموں نے رنگت بھی چمکا دی تھی اور ثمرین تو کافی اعتماد سے انگلش کے جو چند الفاظ سیکھے تھے بول جاتی۔ فائزہ آپا اور منیب حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن میرب کے سامنے ظاہر ہے بھانڈا کون پھوڑتا۔

ڈائننگ ٹیبل کو انواع واقسام چیزوں سے سجایا گیا تھا جن میں کافی چیزیں باہر سے منگوائی گئی تھیں فائزہ آپا اچھی طرح سمجھ چکی تھیں کہ یہ تبدیلی دراصل میرب کے ساتھ مقابلہ بازی ہے۔"

جب سب جانے لگے تو انہوں نے ڈیزائنر ڈریسز کے دو بیگ منیب کو تھمائے اور ایک بیگ آپا کو۔

"ارے بھابھی! یہ سب کیا ہے؟"

"شادی کے بعد پہلی بار ہمارے ہاں آنے پر یہ گفٹس ہیں ہماری طرف سے۔" جواباً امبرین نے اتراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

رمضان میں عبادات بھی معمول سے زیادہ طویل ہوجاتی ہیں۔ اس لیے ادھر ادھر جانے کو وقت ہی نہیں بچتا۔ فائزہ آپا نے چکر بھی نہیں لگایا تھا اور فون پر بھی شاذ و نادر ہی بات ہوتی۔ ستائیسویں روزے کی افطاری منیب کے ہاں تھی۔ دونوں بہنیں چپکے سے پارلر سے ہو آئیں۔ مہنگے ترین ڈیزائنر ڈریسز خاص اسی موقع کے لیے لیے گئے تھے۔ ثمرین نے ہیزل ڈائی بالوں کو بہت اچھے سے سیٹ کیا تھا۔ تیاری کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور دونوں کافی اچھی لگ رہی تھیں بچوں کو بھی اچھے کپڑے پہنا کر خوب تیاری سے وہاں پہنچی تھیں۔"

''ارے زمین پر ہی برتن سجا دیے۔'' ثمرین نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''آپا! اس کے جہیز میں تو اتنی بڑی ڈائننگ ٹیبل تھی پھر اس نے کیوں۔''

امبرین نے آپا سے کہا لیکن سامنے سے میرب کو آتے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

سب دسترخوان پر بیٹھ گئے ساری چیزیں رکھ کر ملازمہ کچن کی طرف مڑنے لگی تو میرب نے اسے آواز دے کر بلایا اور اپنے ساتھ ہی دسترخوان پر بیٹھنے کو کہا جہاں ملازمہ متذبذب ہوئی۔ وہاں باقی لوگ بھی حیران ہوئے۔ اتنے امیر کبیر گھر کی پڑھی لکھی نازک مزاج بیٹی کیسے ایک ملازمہ کو اپنے برابر بیٹھنے کا کہہ رہی تھی۔ سائرن بجا تو سب کی توجہ کھانے پینے کی طرف ہوئی لیکن یہ کیا؟

جیسے جیسے تمام ڈشز کے ڈھکن اٹھے سب حیران ہوتے چلے گئے، دونوں بہنیں آنکھوں میں ہی اشارے کرنے لگیں۔ میرب نے شاید محسوس کر لیا تھا۔

''برامت مانیے گا، میں کوئی خاص اہتمام نہیں کر سکی...... دراصل میں بہت آئلی اور ہیوی فوڈز نہیں پکاتی اور رمضان میں تو اسپیشلی ان چیزوں کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے پورا دن روزہ کے بعد افطاری میں بہت آئلی چیزوں کے بجائے صرف ہیلدی فوڈز لینے چاہئیں اور میں نے اسی کے مطابق مینیو ارینج کیا ہے۔'' ان دونوں کے تو مانو سر پہ لگی اور تلوؤں پر بجھی۔

''فاسٹ فوڈز تو عام دنوں میں بھی صحت کے دشمن ہیں۔''

''لیکن آپ کو کوئی کمی لگی ہو تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔''

☆☆☆

''تم دونوں نے اس کے لیول تک پہنچنے کے لیے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے...... اور دیکھ لو، تم دونوں کی کسی چیز نے اسے متاثر نہیں کیا۔''

''واپسی پر فائزہ آپا نے بھتیجے بھتیجیوں کو اپنی گاڑی میں ماموں سسر کے ساتھ بھیج دیا اور خود بھابھیوں کے ساتھ آگئیں۔ اتنے دنوں سے تو وقت نہیں ملا تھا بات کا مگر آج خوب موقع تھا۔ وہ دونوں آپا کی بات سمجھ کر بھی سنی ان سنی کرنے کے چکر میں تھیں، مگر آپا ایسے کہاں چھوڑنے والی تھیں۔''

''کھانا دسترخوان پر کھانا سنت ہے اور تم دونوں ''افطار پارٹی'' (آپا نے اس لفظ کو خاص زور دے کر کہا) کے چکر میں یہ سنت بھی بھول گئیں...... اور دیکھو، اس ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والی کی عاجزی کیسے ملازمہ کو بھی ساتھ بیٹھنے کا کہا۔ وہ تو بے چاری خود غیر مردوں سے جھجک رہی تھی تب ہی اسے دوبارہ کچن میں بھیج دیا۔ افطاری میں صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کھانے پینے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بچت کی بچت اور صحت کی صحت اور تم لوگ اس دن سارا فاسٹ فوڈ اکٹھا کر لائے تھے اگر اسی طرح شو آف کے چکروں میں پڑی رہیں تو جلد ہی ان دونوں کو کنگلا کر دو گی۔''

فائزہ نے بڑی ہونے کے ناتے انہیں کافی سمجھا دیا تھا اور عتیق، انیق بھی آپا کی ہاں میں ہاں ملاتے انہیں سمجھاتے رہے اور وہ دونوں بھی کوئی ایسی ہٹ دھرم تو نہیں تھیں کہ ضد میں آجاتیں دونوں نے آپا کی باتوں کو بخوبی سمجھتے ہوئے عہد کیا تھا کہ دکھاوے کا جو بیج ان کے ذہنوں میں اگ آیا تھا وہ اسے پروان چڑھنے سے پہلے ہی کاٹ کر پھینک دیں گی اور کسی کی تقلید میں اپنا پیسہ نہیں اجاڑیں گی۔''

''ویسے ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔'' عتیق نے بھی گفتگو میں حصہ ڈالا۔

''آپ لوگوں نے غور کیا کہ میرب ایک ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والی کیسے اپنی تمام نازک مزاجیاں وہیں چھوڑ آئی ہے۔ غیب کے رنگ میں ڈھل کر اس نے اچھی بیوی اور باشعور عورت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔''

بات سچ تھی اور سب کے دلوں میں اتری تھی پھر چہروں سے بناوٹی رنگ اڑتے نظر آئے تھے۔

☆

حسنہ حسین

خواب دیکھتے ہوئے جنت کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ خود کو برائڈل ڈریس میں دیکھ کر اسے یاد آتا ہے کہ اس کی شادی فارس وجدان سے ہو چکی ہے جو "شیرازی انٹر پرائزز" کا سی ای او ہے۔ وہ جنت کمال پر واضح کر دیتا ہے کہ یہ ایک کاغذی رشتہ ہے جو اس نے اپنی ماں کی خاطر بنایا ہے۔ جب تک ماں زندہ ہیں، یہ رشتہ رہے گا۔

جنت کی فارس سے شادی سائرہ خالہ نے کروائی ہے۔ ان کا بیٹا عمار اس شادی پر ناراض ہے۔ اس کا خیال ہے میڈیا پر فارس سے متعلق جو خبریں گردش کرتی رہی ہیں، وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

فارس کی والدہ مسز شیرازی ایک نیک دل عورت ہیں جو چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ وہ ایک آرٹسٹ ہیں۔ ان کی پینٹنگ عسر یسرا جنت کو حیران کر دیتی ہے۔ دونوں اس پر بات کرتی ہیں۔ مسز شیرازی اسے ان لفظوں کے معنی تلاش کرنے کو کہتی ہیں۔

فارس کے مرحوم بھائی حماد کا یتیم بیٹا اپنے ننھیال میں رہتا ہے۔ فارس اس بچے کو وجدان ہاؤس میں لانے کو تیار نہیں۔

فارس کی تمام تر نفرتوں کے باوجود جنت اس کے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

آئمہ ظہیر، فارس کی منہ بولی بہن جنت کو منگنی کی تقریب میں لے جاتی ہیں جہاں کچھ لڑکیوں کے تضحیک آمیز رویے سے جنت دل برداشتہ ہو جاتی ہے۔

فارس کے آفس میں برہان انصاری کا نام سن کر جنت متوحش ہو جاتی ہے۔ اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے۔

جنت عسر یسرا پر غور کرتی ہے اور اس کے کچھ معنی سمجھ جاتی ہے۔

جنت مسز شیرازی سے ان کے یتیم پوتے سے ملنے کی بات کرتی ہے۔ مسز شیرازی منع کر دیتی ہیں۔
اٹالین ریسٹورنٹ میں ڈنر کے دوران فارس طلاق اور ماضی کا ذکر چھیڑ کر جنت کو پریشان کر دیتا ہے۔
جنت فارس کے ساتھ لندن جانا چاہتی ہے تاکہ وہ سائرہ خالہ کی بیٹی سدرہ کی شادی میں شرکت نہ کر سکے۔ فارس اسے ضد میں لاہور لے جاتا ہے۔
سدرہ کی شادی پر فارس کو علم ہوتا ہے کہ جنت کی پہلی شادی تایا کے اکلوتے بیٹے سے ہوئی۔ پانچ سال تک رہی۔ بچہ نہ ہونے پر تایا کے بیٹے نے دوسری شادی کر لی۔ جنت کو اس کے بچے کو نقصان پہنچانے کی پاداش میں طلاق ہوگئی۔
فارس جنت کو وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لندن سے واپسی کے بعد وہ جنت کو لاہور سے لینے آتا ہے۔ جنت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی۔ راستے میں ایکسیڈنٹ ہوتا ہے۔ دونوں محفوظ رہتے ہیں۔ گاڑی کا نقصان ہو جاتا ہے۔
لاہور سے واپسی کے بعد جنت بدل جاتی ہے۔ وہ فارس وجدان کے معاملات میں مداخلت ترک کر دیتی ہے۔
فارس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ بروقت سی پی آر دے کر وہ اس کی جان بچاتی ہے۔ ڈاکٹر بخاری بتاتے ہیں اسے کیٹ الرجی ہے جس کا ری ایکشن شدید ہوتا ہے۔
فارس کا بدلتا رویہ جنت کو حیرت اور پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔
کراچی جانے سے پہلے فارس سرپرائز کی بات کرتا ہے۔
جنت مسز یزدانی کے نواسے کی سالگرہ پر جاتی ہے جہاں عدینہ زبیر اسے ملتی ہے۔ جو بتاتی ہے کہ وہ فارس وجدان کی پہلی بیوی ہے۔

پانچویں قسط

وہ اس عورت کو نہیں جانتا تھا جو اسے گھر کے بیرونی گیٹ سے باہر نکلتی ہوئی نظر آئی تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ اس طرح کوئی بھی اجنبی اتنی آسانی سے اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ آنکھوں میں الجھن لیے وہ اندر داخل ہوا تو اسے وجدان ہاؤس میں ایک غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔
اقصیٰ پریشانی کے عالم میں بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔ وہ روتے ہوئے اب کچھ کہہ رہی تھی۔ کچھ بتا رہی تھی۔
فارس نے شاک کے عالم میں سر اٹھا کر مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ حیرت اور صدمہ بھرے تاثرات لیے وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھیں۔ مگر ان کی نگاہیں کسی ایک جگہ پر ٹھہر نہیں رہی تھیں۔ لبوں کو جنبش دیتے انہوں نے فارس سے کچھ کہا۔ اقصیٰ نے بوکھلا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ اور اسی لمحے فارس وجدان دروازہ کھول کر عجلت میں قدم اٹھاتا تیزی سے باہر بھاگا تھا۔
بیرونی گیٹ سے باہر۔ سڑک پر پہنچتے ہی وہ سر تا پیر مکمل طور پر بارش میں بھیگ چکا تھا۔
”اسے ڈھونڈو فارس! ایسا نہ ہو وہ کچھ کر بیٹھے۔“
آگے بڑھتے ہوئے وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا مگر جنت بنت کمال اسے کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
بھاری تنفس کے ساتھ ایک موہوم سی امید لیے اس نے مسز یزدانی کو کال کی۔ جنت ان کے گھر نہیں گئی تھی۔ آئمہ کا موبائل آف جا رہا تھا۔ وہ ویسے بھی اسلام آباد میں موجود نہیں تھی۔ اگر ہوتی بھی تو جنت اتنی جلدی اتنی کم مدت میں اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔
یقیناً وہ ابھی تک یہیں۔ آس پاس ہی کہیں تھی۔ وہ اسے تلاشتے ہوئے پارک کا رخ کر چکا

تھا۔ موسم کی خرابی کے باعث وہاں اکا دکا ہی لوگ تھے۔ آگے مسجد تھی۔ اور مسجد کی دوسری طرف مرکزی شاہراہ تھی۔

اور اسی مرکزی شاہراہ پر قدم دھرتے ہی ٹریفک کا شور یکایک اس کے لیے صامت ہوا تھا۔ زندگی سے بھرپور فضا ایک خلا میں بدل گئی تھی۔

زمین نے قدم جکڑے، وجود بھاری پتھر ہوگیا۔ اسے لگا وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا۔ ذرا سا ہلے گا تو پاش پاش ہو جائے گا۔

"تمہیں لگتا ہے، اللہ نے ہمیں بچایا ہے؟"

"ہاں۔ اللہ کا بوت بوت شکر باجی!"

"ایسا بھی تو ممکن ہے کہ یہ ایک وارننگ ہو۔ میرے لیے۔ تمہارے لیے۔ یا شاید کسی اور کے لیے۔"

چھتری کھل گئی تھی۔ گاڑی کے قریب وہ پھسل کر گری تھی۔ اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنے سہارے اٹھ رہی تھی۔

"جو کچھ سن چکا ہوں، وہ سب ممی کو بتاؤں گا تو وہ کیا سوچیں گی؟ ایک ایسی لڑکی کو بہو بنا بیٹھی ہیں جو infertile (بانجھ) ہے۔ جس نے اپنی سوتن کے بچے کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ جس کے خاندان کے لوگ اسے اچھوت کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ اور جو اپنی ماں کی موت کا سبب بنی ہے۔"

پارکنگ ایریا میں گاڑی اسٹارٹ کرتا وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری نمی لیے، کچھ بے بسی اور آزردگی سے اسے دیکھتی جنت کمال۔ چہار سو تاریکی چھائی اور منظر بدل گیا۔

"اگر تم اس طرح میرے سر پر مسلط رہے تو میں آنٹی کو سب کچھ بتا دوں گی۔"

"شوق سے جاؤ! میں بھی تمہارے پول ان کے سامنے کھول دوں گا، حساب برابر۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے۔" لہجے میں خوف تھا۔ آنکھوں میں وحشت۔

"کر سکتا ہوں۔ میں تو اب ان سے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میری بیوی بانجھ ہے، میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے چاندی کی اس مورت کو ہزار ہا ٹکڑوں میں بکھرتا دیکھا۔

"فارس پلیز...... دروازہ کھولو پلیز۔" بلک بلک کر روتے وہ اس کے کمرے کا دروازہ بجائے جا رہی تھی۔

"ایک بچے کی جان لینے کی کوشش۔ آخر تم میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی؟"

اور پھر اس نے سلائڈ ڈور پوری قوت سے بند ہوتے دیکھی۔ اب وہ کمرے سے باہر۔ دسمبر کی سرد ترین راتوں میں بالکنی میں کھڑی تھی۔

"اللہ کے فضل سے بہت سے بیک اپ پلان ہیں میرے، اور سب ہی سروائیول بیسڈ ہیں، نہ میرا سر پھٹے گا۔ نہ میں ڈوب کر مروں گی۔"

جتاتی نگاہیں۔ مضبوط لہجہ۔ شجاعت لیے انوکھا انداز۔ جیسے وہ دنیا کے ہر طوفان سے بھڑ جانے کی، ہر چٹان سے لڑ جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے لیے نہ "فارس" کچھ ہے۔ نہ "طلاق" کچھ ہے۔

"مجھے طلاق فوری چاہیے ہوگی۔ تمہیں ابھی سے ڈاکومنٹس کا انتظام کر لینا چاہیے تاکہ مناسب وقت پر بنا کسی تاخیر کے سائن کر کے ایک دوسرے سے جان خلاصی کی جا سکے۔"

خود پر طاری اس بھیانک جمود کو توڑتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ سڑک کے کنارے غیر متوازن قدم اٹھاتا وہ وہاں جا رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ چلتی ہوئی تیز رفتار گاڑی کے سامنے اچانک ہی کوئی لڑکی آ گئی تھی۔

ایمبولنس کا سائرن۔ لوگوں کا ہجوم۔ اور شدت سے برستی بارش میں موت کو اتنے قریب سے۔ اس انداز اور اس حالت میں دیکھتا فارس وجدان اپنے حواسوں میں ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔

"لیکن اگر کچھ وجوہات کی بنا پر۔ مجھے قبل از وقت یہ گھر چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ اور اس دوران میرا تم سے فی الفور رابطہ بھی ممکن نہیں ہو پاتا تو میں ایک ماہ

تک کی مدت کو ذہن میں رکھوں گی۔"
مدت مختصر تھی۔ مختصر سے مزید مختصر کر دی گئی تھی۔ مہینہ آن کی آن میں ہفتوں اور پھر دنوں میں بدل کر لمحوں پر محیط ہوا تھا۔
"اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ جب جانے کا وقت آئے گا، میں خاموشی سے چلی جاؤں گی۔"
اور جنت کمال وعدہ خلافی نہیں کرتی تھی۔
یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں دکھ اور صدمے سے نڈھال اس نے اپنے راستے میں آنے والوں کو ہٹاتے ہوئے اسٹریچر پر رکھی اس لاش تک پہنچنا چاہا۔ خون سے سرخ ہوئی نم چادر اس کی مٹھی میں آئی۔ چہرے سے چادر سرکی۔ بال۔ پیشانی۔ پھر ویران آنکھیں واضح ہوئیں۔ اس کی ساری ہمت، سکت اس ایک لمحے میں فنا ہوئی۔
"تم جتنے مرضی منصوبے بنا لو مسٹر شیرازی! خود کشی میں نہیں کروں گی۔ نہ لندن کے برج سے۔ نہ کسی اور جگہ سے۔"
چادر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔
وہ بال۔ چہرہ اور آنکھیں۔ وہ جنت کمال کی ہر گز نہیں تھیں۔

☆☆☆

کمرے میں تاریکی تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ہوا سے پردے لہرا رہے تھے۔ باہر موسم خوش گوار تھا مگر ان کے اندر کی اداسی ہر گزرتے لمحے بڑھتی جا رہی تھی۔ موبائل ہاتھ میں تھا۔ وہ اب تک نہ جانے کتنی بار فارس وجدان کو کال کر چکی تھیں۔ کتنی ہی بار میسج بھیج چکی تھیں۔ مگر وہ کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ جنت کا موبائل ہنوز آف تھا۔ وہ ابھی تک نہ اس سے بات کر سکی تھیں اور نہ ہی انہیں اس کی خیریت کی اطلاع ملی تھی۔
کل صبح سے ہی انہوں نے خود کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ نہ کھانا کھا رہی تھیں، نہ کسی سے کوئی بات کر رہی تھیں۔
دستک دے کر عمار نے دروازہ کھولا تو وہ ایک دم سے تڑپ کر اٹھیں اور تیزی سے قدم اٹھاتیں اس کے پاس آئیں۔
"کچھ پتا چلا؟"
عمار نے نفی میں سر ہلایا۔ "صابرہ خاتون کے گھر تالا لگا ہے، پڑوسی کہہ رہے ہیں وہ دو ماہ سے کہیں گئی ہوئی ہیں۔ کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ ان کا فون نمبر بھی بند جا رہا ہے۔"
سائرہ اپنا سر ہتھیلیوں پر گرائے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ خوف اور اندیشوں میں گھرا ان کا دل شدت سے دھڑکے جا رہا تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ لب کپکپا رہے تھے۔
"فارس اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ مل جائے گی۔ ہاں، مل جائے گی۔"
عمار دکھ اور صدمے سے اپنی ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔
"آپ ابھی بھی اس شخص پر بھروسا کر رہی ہیں مما؟" اس کے لہجے میں شاک تھا۔ "جس انسان نے اپنے باپ اور بھائی کو نہیں چھوڑا۔ وہ جنت کے لیے رحم دل ہو گا؟"
"عمار۔" ان کی آواز کپکپا کر رہ گئی۔
"میں نے کہا تھا آپ سے، وہ اچھا انسان نہیں ہے۔ میں نے روکا تھا آپ کو۔ مگر آپ نے میری ایک نہیں سنی۔" سرد لہجے میں وہ کچھ متوحش ہو کر بات کر رہا تھا۔ "آپ صرف اتنا چاہتی تھیں کہ کسی طرح وہ ہم سب کی نظروں سے دور ہو جائے۔"
سائرہ آنکھوں میں صدمہ لیے عمار کو دیکھ کر رہ گئیں۔ اتنے سخت لفظوں کی توقع انہیں اپنے بیٹے سے ہر گز نہیں تھی۔ وہ بھی اس وقت جب وہ جنت کے لیے اس قدر پریشان ہو رہی تھیں۔
"چار بیٹے ہیں آپ کے اس گھر میں۔ کسی کے ساتھ بھی آپ جنت کی شادی کروا سکتی تھیں۔ فیصل بھائی، عذیر بھائی، احمد بھائی اور میں۔ میں نے خود ریکویسٹ کی تھی آپ سے کہ مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے،

آپ خاموشی سے میرا نکاح پڑھا دیں۔ اس طرح در بدر کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے، اسے اپنوں میں ایک مستقل ٹھکانا ملے۔ مگر نہیں۔ آپ بھلا ایک بانجھ لڑکی کو اپنی بہو کیسے بنا سکتی تھیں؟ آپ تو بس اس سے جان چھڑانا چاہتی تھیں۔ اور مبارک ہو مما! آپ اپنی اس کوشش میں بہت کامیاب رہیں۔“

سائرہ اپنی جگہ پتھرائی ہوئی بیٹھی تھیں۔ یہ کیسا چہرہ تھا جو عمار انہیں دکھا رہا تھا۔ یہ کیسی حقیقت تھی، جو وہ انہیں بتا رہا تھا۔

”میں نے سوچ سمجھ کر اس کا رشتہ طے کیا تھا عمار! میں اسے زمانے سے بچانا چاہتی تھی۔“

انہوں نے کمزور آواز میں اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہی۔ ان کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ وہ جنت کا بھلا ہی چاہتی تھیں۔ فارس بہترین انتخاب تھا۔ وہ اس پر یقین قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے فیصلے کا دفاع کرنا چاہتی تھیں۔ مگر عمار ان کی ہر کوشش ناکام بنا گیا تھا۔

”آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ وہ مر جائے گی مگر ایک ”ذمہ داری“ اور ”بوجھ“ کے روپ میں آپ کے گھر کبھی نہیں آئے گی۔“

اپنی بات پوری کر کے وہ جا چکا تھا۔ اور دل پر بھاری بوجھ لیے سائرہ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

پلک جھپکتے مناظر بدلے تھے۔ اندھیرا اچھٹ گیا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے سمٹ گئے تھے۔ سورج کی روشنی چھن کر ٹائلز پر اتر آئی تھی۔ کئی ہفتے پہلے کا قصہ جھلکیوں میں اپنا آپ دہرانے لگا تھا۔

انہوں نے جنت کو دیکھا۔ اس نے صفحے گلاس ٹیبل پر پھیلا دیے تھے۔ خود وہ ان کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

”قرآن میں بانجھ پن کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک ہے ”عاقر“ اور دوسرا ہے ”عقیم“ جب سورہ مریم میں زکریا علیہ السلام کی زوجہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں میری بیوی ”عاقر“ ہے۔ لیکن جب زوجہ ابراہیم کو فرشتے اولاد کی بشارت دیتے ہیں تو وہ کہتی ہیں میں بڑھیا ”عقیم“ ہوں۔“

وہ اپنے اسی مخصوص انداز میں مخاطب تھی اور صفحے پلٹ کر مطلوبہ آیات انہیں ترجمے سمیت دکھا رہی تھی۔

”یہ سورہ الشوریٰ کی آیت ہے۔“ انگلی رکھ کر وہ کہہ رہی تھی۔

”آسمانوں اور زمین میں اللہ ہی کی بادشاہی ہے، جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے بخشتا ہے۔ یا لڑکے اور لڑکیاں ملا کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بانجھ (عقیم) کر دیتا ہے، بے شک وہ خبردار قدرت والا ہے۔“

پھر رک کر سر اٹھائے وہ ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”آپ نے دیکھا یہاں ”عقیم“ لکھا گیا ہے۔ عاقر نہیں۔“

انہوں نے پرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلایا تھا۔ سورج کی روشنی جنت کے شہد رنگ بالوں پر پڑ رہی تھی۔

”اور یہاں سورہ انبیاء کی یہ آیت زکریا علیہ السلام سے متعلق ہے۔“ اس نے انگلی رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔ ”پھر ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کے لیے اس کی بیوی کو درست کر دیا، بے شک یہ لوگ نیک کاموں میں دوڑ پڑتے تھے اور ہمیں امید اور ڈر سے پکارا کرتے تھے، اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے......“ ختم ہوتی آیت غور و فکر کے کئی دروازے وا کر گئی تھی۔

"اب اس میں آیت کا یہ حصہ غور طلب ہے۔ ہم نے ان کی بیوی کو درست کر دیا۔ یعنی ان کی اصلاح کر دی...... اب سوال یہ ہے یہاں کس ”اصلاح“ کی بات کی گئی ہے؟ جہاں تک مجھے علم ہے زوجہ زکریا ایک نیک اور عبادت گزار خاتون

تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ نعوذ باللہ ان کے مابین کوئی شر یا فساد تھا جسے اصلاح کی ضرورت پڑتی۔"

ایک لمحے کا توقف کر کے وہ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تھی۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں تم سے سننا چاہتی ہوں۔" وہ بے ساختہ کہہ گئی تھیں۔

وہ ذرا سا جھجکی، پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔

"مجھے لگتا ہے یہ اس بیماری کی، اس نقص کی اصلاح تھی۔ اس بانجھ پن کی جو انہیں اولاد سے محروم رکھے ہوئے تھا۔"

ان کی خاموش نگاہوں میں یکایک حیرت کا تاثر ابھرا تھا۔ اندر کے سوالات کے جواب تلاشتی جنت کمال انہیں بہت مطمئن نظر آئی تھی۔ اس کا لہجہ کمزور نہ تھا۔ اس کے لفظوں میں مایوسی نہ تھی۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان بھٹک نہیں رہی تھی۔ اس نے کنارہ چن لیا تھا۔ ساحل پر قدم جما لیے تھے۔

"جہاں تک میں اپنی تحقیق سے سمجھ پائی ہوں۔ بانجھ پن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ عورت یا مرد میں سرے سے باپ یا ماں بننے کی صلاحیت پیدائشی طور پر موجود نہیں ہوتی اور اسے "عقیم" کہتے ہیں جو کہ زوجہ ابراہیم علیہ السلام تھیں۔ اسی "عقیم" کا ذکر سورہ شوریٰ کی آیت پچاس میں ہے۔

اور دوسرا بانجھ پن وہ ہے جو کسی نہ کسی نقص یا بیماری کی وجہ سے ہے۔ اور جس کا علاج یا اصلاح ممکن ہے۔"

مسز شیرازی نے گہرا تنفس لے کر پلکیں جھپکائیں۔ منظر وہی تھا۔ کمرہ بھی وہی۔ صفحے بھی وہیں۔ مگر جنت کمال کہیں نہیں تھی۔

"عاقر کسی سبب سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور بغیر کسی سبب کے بھی۔ کچھ لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا پر تب بھی ان کی اولاد نہیں ہوتی۔ اور کچھ لوگوں میں کوئی نقص ہوتا ہے، اس کے باوجود ان کے یہاں اولاد ہو جاتی ہے۔"

سبز روشنائی سے کسی آیت کو انڈر لائن کرتی۔ کسی اور نقطے کی وضاحت کرتی وہ ایک بار پھر انہیں متوجہ کر چکی تھی۔

"قرآن نے ایک "عقیم" بوڑھی عورت کو ماں بنتے دکھایا ہے۔ ایک بوڑھے عاقر کو بھی۔ زکریا علیہ السلام کی بیوی میں جو نقص تھا وہ دعا سے، امید سے، یقین سے ٹھیک ہو گیا۔ اور زوجہ ابراہیم جن میں سرے سے ماں بننے کی صلاحیت موجود نہیں تھی، انہیں بھی اللہ نے اپنی "قدرت" سے ماں کے رتبے پر سرفراز کر دیا۔"

کھڑکیوں پر پردے پھیل گئے تھے۔ سورج کی کرنیں سمٹ گئی تھیں۔ ان کے بیڈ روم میں جنت کمال اب کھڑکیوں کے پاس کھڑی نظر آرہی تھی۔

"بلاشبہ یہ ایک محرومی ہے، اور یہ محرومی بھی اللہ کے چنے ہوئے کتنے خاص بندوں کے حصے میں آئی۔ یہ بات میں بھول رہی تھی۔"

لہجے میں دبا دبا سا جوش اور آنکھوں میں ایک چمک لہرائی تھی۔ "اسی "محرومی" کو اللہ نے "عطا" میں بدلتے دکھایا۔ جو ناممکن تھا اسے "ممکن" کر کے دکھایا۔ ایک عاقر۔ ایک عقیم۔ دو عظیم عورتیں! اور دونوں انبیاء کی مائیں ٹھہریں۔"

کمرے میں اب صرف زرکار لیمپ روشن تھا۔ اس کی روشنی میں وہ انہیں اپنے برابر میں لیٹی ہوئی دکھائی دی۔ سینے پر سر رکھے۔ ایک ماں میں۔ اپنی ماں تلاشتی۔ مایوسی میں امید کا دیا جلاتی۔

"انتظار ہمیشہ ان ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے آنٹی! جنہیں کچھ عظیم عطا کرنا مقصود ہو۔"

منظر بدل گیا تھا۔ جنت ان کے کمرے میں اب کہیں نہیں تھی۔ نہ وہ پردوں کو ڈوریوں میں باندھ رہی تھی، نہ ان کا لکھا ہوا کوئی آرٹیکل ٹائپ کر رہی تھی۔ اور نہ ہی ان سے اب کوئی آیت ڈسکس کر رہی تھی۔ ان کے کمرے میں اب مکمل خاموشی تھی۔ ایسی خاموشی جو ان کے اندر ایک شور سا برپا کیے جا رہی

تھی۔

''بلاشبہ انبیاء کے لیے معجزات ہوا کرتے ہیں۔ مگر وہ معجزے ان کے لیے بھی بغیر صبر، دعا، اور عاجزی کے نہیں ہوئے۔ یہ پوائنٹ میں مس کر رہی تھی۔''

وہ اس کی ہر بات کا مطلب جیسے اب سمجھ رہی تھیں۔ ہر سوال کے پیچھے چھپا ہوا درد جیسے اب محسوس کر رہی تھیں۔ انہیں کبھی پتا ہی نہ چل سکا کہ وہ ریسرچ اس کے اپنے لیے تھی۔ وہ محنت، وہ الجھن اور بحث۔ وہ سب اس کے اپنے لیے تھی۔

''ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں صرف باہر کی دنیا سے لڑنا پڑتا ہے۔ یہ ایک جنگ ہے اور قدرے آسان ہے۔ لیکن باہر کی دنیا کے ساتھ ساتھ جو جنگ اپنے اندر، اپنے آپ سے لڑنی پڑتی ہے۔ یقین کریں وہ بہت مشکل ہوتی ہے۔''

وقت صفحوں کی طرح پلٹ رہا تھا۔ وہ انہیں پیچھے۔ اور بہت پیچھے لیے جا رہا تھا۔ جنت کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں انہیں چاروں طرف نظر آ رہی تھیں۔

''آپ بار بار مرتے ہیں۔ اور بار بار زندہ کر دیے جاتے ہیں۔ اسی ایک ہی اذیت سے بار بار گزرنے کے لیے۔ جہنم بھی اسی لیے جہنم ہے کہ سب بار بار ہوتا رہے گا۔ ہے نا؟''

انہیں یوں لگا جیسے وہ جائے نماز پر بیٹھی آدھی ادھوری باتیں ایک بار پھر کرنے لگی ہے مگر وہ باتیں اب آدھی ادھوری نہیں رہی تھیں۔ وہ ان کے لیے مکمل ہوتی جا رہی تھیں۔

''وہ لوگ بھی تو ہوتے ہیں جنہیں بغیر کسی انتظار، دعا اور تڑپ کے سب مل جاتا ہے۔ ان میں ہم کیوں نہیں ہو سکتے؟ ہمیں کیوں رونا پڑتا ہے؟ ہمیں کیوں ایک ایک خواہش کے لیے تڑپنا پڑتا ہے؟''

گھڑی کی سوئیاں متحرک تھیں۔ پنڈولم کی آواز اب مبہم نہ رہی تھی۔

وجدان ہاؤس میں پہلے دن سے اب تک جنت کے ساتھ ہونے والی ہر گفتگو انہیں یاد آ رہی تھی۔ امید اور مایوسی سے الجھتی اس کی آنکھیں۔ مضبوطی سے کمزور پڑتی اس کی آواز۔ ڈرا ڈرا سا لہجہ، سہما سہما سا انداز۔ اور آنسوؤں کی آمیزش لیے لبوں پر اچانک سے ابھرتی زندگی سے بھرپور مسکان۔

''ماں کی بددعا میں بھی بہت اثر ہوتا ہے۔ ہے نا! بلکہ سب سے زیادہ اثر ہی اسی ''بددعا'' میں ہوتا ہے؟'' ان کی تسبیح سمیٹتی انگلیاں کپکپانے لگیں۔ ''اگر کوئی ماں اپنی اولاد سے نفرت کرتے کرتے مر جائے۔ تو کیا ماں کی نفرت بھی مر جاتی ہے؟''

''کبھی کبھی آپ کو ایسے جرم کی سزا ملتی ہے جو آپ سے سرزد نہیں ہوتا۔ ایسی سزا کو جھیلنے کا حوصلہ انسان کہاں سے لائے؟''

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ نیم تاریکی میں کھڑکیوں سے باہر کہیں دیکھنے لگیں۔ باہر لان میں لائٹس کی روشنیاں سوئمنگ پول کی سطح پر چمک رہی تھیں۔

''آپ جاگ گئیں۔''

اقصیٰ برابر میں ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اٹھ کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔ آنکھوں میں فکر ٹھہری تھی۔ مسز شیرازی کی طبیعت گزشتہ کئی دنوں سے خراب تھی۔ میڈیسن لینے کے باوجود وہ ٹھیک سے سو نہیں پاتی تھیں۔ آج پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ایک بار پھر خلا میں کہیں دیکھتے کھو سی گئی تھیں۔

''فارس آ گیا ہے؟'' چند لمحوں کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''نہیں۔''

مسز شیرازی کا دل بھاری ہوا۔ ایک بے نام سی اذیت رگ رگ میں اتر گئی۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

وہ صحیح معنوں میں اب سونا چاہتی تھیں مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور سکون تو جیسے اس

سے بھی دور۔ ایک بے کل سا احساس ان کی آنکھیں نم کر گیا۔ وہ چہرے کا رخ بدل گئیں۔

اقصیٰ پریشانی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

اس کے بال پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھرے تھے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی تھی۔ ویسٹ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بارش کی نمی کہیں کہیں کندھوں پر، بالوں پر ٹھہری تھی۔ نڈھال قدم اٹھاتے ہوئے اس نے شرٹ کے اوپری بٹن بھی کھول دیے تھے۔ رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔

جنت کو گھر چھوڑے پوری سات راتیں آج تمام ہونے والی تھیں اور ابھی تک اس کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ وہ اپنی خالہ کے گھر نہیں گئی تھی۔ اس نے اپنے خاندان کے کسی فرد سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کی کوئی ایسی دوست نہ تھی جس کے پاس وہ جا سکتی۔ کوئی رشتہ دار جس کے یہاں پناہ لے سکتی۔ وہ اسے اپنے تئیں ہر جگہ تلاش کر چکا تھا۔ مگر وہ نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو گزشتہ کئی راتوں کی طرح اس رات بھی اس نے لائٹس آن نہیں کیں۔ اپنے آس پاس، اپنے چاروں طرف اسے اندھیرا درکار تھا۔ مگر اندھیرا ابھی جیسے روشنی ہونے لگا تھا۔ وہ اس پر سب عیاں کرنے لگا تھا۔

جنت کمال کی جو چیز جہاں رکھی تھی وہیں موجود تھی۔ اس کا کمبل، تکیہ، لیپ ٹاپ، چارم بریسلٹ جسے وہ سونے سے پہلے اتار کر ٹیبل پر رکھ دیا کرتی تھی۔

واش روم میں اس کی ہیئر پنز، رنگ برنگے کیچر، ہیئر کلپس ہر جگہ بکھرے پڑے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر کاسمیٹک کی چند اشیاء دھری تھیں۔ اس کمرے میں اس کی نشانی جیسے ہر جگہ تھی۔

پہلے وہ تھی۔ تو زندگی سے خفا نظریں کہیں ٹھہرتی نہیں تھیں۔ اور اب جب وہ نہیں تھی۔ تو وہ اسے اپنی ہر ایک چیز میں بار بار نظر آ رہی تھی۔

ایک بار پھر وہ اس کا موبائل اٹھا چکا تھا۔ ایک بار پھر وہ ان تصاویر کو دیکھ رہا تھا جو آٹھ دن پہلے اسے رات کے بارہ بجے کسی اجنبی — نمبر سے ارسال کی گئی تھیں۔ چند میسجز جنہیں پڑھا نہیں گیا تھا، کچھ کالز جو مس کر دی گئی تھیں۔

اس نے موبائل رکھ دیا۔ اب وہ وارڈ روب کھولے کھڑا تھا۔ ایک ایک کر کے ہر شے نکالتا کارپٹ پر ڈھیر کیے جا رہا تھا۔ لندن کی ٹکٹس، پاسپورٹ۔ سفری بیگ۔ پیکنگ کے لیے منتخب کی جانے والی ضروری اشیاء۔ اور جیسا وہ اس سے کہہ کر گیا تھا۔ وہ اس کا سامان پیک کر چکی تھی۔ اور اس کے لیے اس نے یقیناً مسز شیرازی کی مدد لی تھی۔ تب ہی اس کے وہی کپڑے بیگ میں رکھے گئے تھے جو وہ اکثر بیرون ملک دورے پر لے جاتا تھا۔

وارڈ روب کے نچلے خانے میں ہینڈ بیگز کے ساتھ ہی جیولری باکس رکھے تھے، حق مہر کا چیک بھی موجود تھا، قیمتی تحائف بھی محفوظ رکھے تھے۔

جنت کمال اپنے ساتھ کچھ بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ قبر میں اترتی کسی لاش کی طرح۔ وہ اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ کر گئی تھی۔

وہ کپڑوں کو ادھر ادھر کرتا، اس کی چیزوں کو نکال نکال کر کچھ تلاشتا عجیب سی کیفیت سے دوچار لگ رہا تھا۔

اوپری خانے میں رکھا ایک سیاہ بیگ کھینچنے پر اس کے برابر میں پڑا لکڑی کا باکس اس کے قدموں میں گرتے ہی کھل گیا تھا۔ چند خطوط، کچھ تصاویر اور اشیاء اس کے قدموں میں بکھر گئی تھیں۔

وہ بے اختیار رک گیا تھا۔

باکس کے ایک کونے پر حرف "F" کی کیلی گرافی تھی۔ آپس میں ٹکراتی دو تلواروں کا نشان واضح تھا۔ آگ پکڑتی ایک تصویر دھندلی تھی تو دوسری تصور کی دیوار پر واضح ہو رہی تھی۔

اس نے بے ساختہ قدم اٹھایا۔ کانچ کا ٹکڑا پیر کے تلوے میں کہیں چبھا۔

"اتنی سی چوٹ لگنے سے کوئی نہیں مرتا۔"
"میں تو مر جاتی ہوں۔"
وہ ٹھہر گیا۔ رک گیا۔ جم گیا۔
جلتی ہوئی لکڑیوں میں ایک اور صفحے کا اضافہ ہوا۔ ساکت پانیوں میں کنکر پھینکا گیا۔ پتے توڑ کر فضا میں اچھال دیے گئے۔
آن کی آن میں براؤن لکڑی کا فرش آئینہ ہوا۔ ایک ہی دراڑ سے جنم لیتی بے شمار دراڑیں اسے ہزار ہا حصوں میں منقسم کر گئیں۔ وہ پنجوں کے بل جھکا تو اسے لگا وہ اب بھی اٹھ نہیں پائے گا۔ سانس لینا چاہے گا تو اسے سانس نہیں آئے گا۔
کیا کوئی اتنا بے خبر ہو سکتا ہے جتنا کہ وہ تھا؟ کوئی اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ وہ خود اپنے لیے تھا؟ یہ کیسی بے حسی تھی جو اپنی ذات سے مربوط (جڑی) تھی؟ یہ کیسی خود غرضی تھی جو اذیت مشروط تھی؟
وہ سفر طویل دشوار تھا جسے طے کر کے وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس حد تک سنبھلا تھا۔ اس حد تک بدل گیا تھا۔ یہ اس کا وہم۔ یہ اس کا خیال تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اپنے آپ سے بے خبر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ خود کو۔ سمجھ نہیں سکا تھا۔ پرکھ نہیں سکا تھا۔
وقت گزر گیا تھا۔ زندگی بدل گئی تھی۔ مگر اس کے اندر کی حکایتیں۔ آج بھی اس کے لیے۔
کچھ مبہم۔
کچھ ادھوری۔
اور بے نام ہی رہی تھیں۔
☆☆☆
شیرازی مینشن کے وسیع و عریض لاؤنج میں موت بھری خاموشی چھائی تھی۔ موجودہ نفوس پر سکتہ طاری تھا۔ نہ سماعت میں یقین اترتا تھا نہ آنکھوں سے ایقان جھلکتا تھا۔ حالانکہ ہارون شیرازی ایک مجسم حقیقت کے ساتھ ان کے سامنے ہی تو کھڑا تھا۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے۔ پشیمانی کا اظہار کرتے اور سر جھکا کر معافی کی درخواست کرتے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی جمیلہ داؤد کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ لیتا تو پتھر ہو جاتا۔ پتھر ہوتا تو کچھ کہہ نہ پاتا۔ جبکہ اسے بہت کچھ کہنا تھا۔
"میرا وارث۔ میرا خون۔ صرف حماد ہے ہارون! یہ تمہاری عیاشیوں کا نتیجہ۔ ایک آوارہ اور بدچلن عورت کے بطن سے جنم لینے والا، اسے ابھی اور اسی وقت لے جاؤ یہاں سے۔"
خاموشی اعظم شیرازی نے توڑی تھی۔ اور کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح چنگھاڑتے ہوئے توڑی تھی۔ ان کی بلند آواز سے بچے پر ہیبت طاری ہوئی تھی۔ ان کے سخت پتھریلے تاثرات سے وہ بہت خائف ہوا تھا۔
"آرزو نے طلاق لے لی ہے، یہ اب میرے ساتھ ہی رہے گا۔" جھکے سر کے ساتھ نظریں چرا کر کہا گیا۔
جمیلہ داؤد نے ڈگمگاتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی اذیت بڑھ گئی۔ آن کی آن میں محبت، وفا اور قربانیوں کا تماشا بنا تھا۔ وہ پاش پاش ہو گئی تھی۔
"تمہیں اندازہ بھی ہے، تم اس وقت کیا کہہ رہے ہو؟" اعظم شیرازی انتہائی غصے کے عالم میں پھنکارے تھے۔ "جمیلہ کے خاندان کو تمہاری دوسری شادی کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ تمہارا کیا حشر کریں گے، کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں؟"
جمیلہ داؤد کے ذکر پر ہارون شیرازی نے اب کے سر اٹھا کر اسے ہی دیکھا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے۔ پھر اس نے نظریں ہٹا لیں۔
"بابا۔"
"میرے صبر کا مزید امتحان مت لو۔" اعظم شیرازی نے انگلی اٹھا کر اسے روکا۔ "ابھی اور اسی وقت اسے یہاں سے لے جاؤ۔" آرزو کے بیٹے کے لیے ان کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ بے زاریت تھی۔ غصہ تھا۔ سرد مہری تھی۔

"بیٹا ہے یہ میرا......"

"میرا اور تمہارا وارث صرف حماد ہے، میں اس طوائف کے بچے کو مزید ایک لمحے کے لیے بھی اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔" حکم سنا کر وہ اسی لمحے اٹھ کر چلے گئے تھے۔

شیرازی مینشن کے وسیع و عریض لاؤنج میں ہارون اپنے بچے کے ہمراہ تنہا کھڑا رہ گیا۔ وہ صدمے سے گنگ تھا۔ کچھ حیران اور بے یقین بھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اعظم شیرازی اس کے بچے کو قبولنے سے انکار کر دیں گے۔

جمیلہ کی آنکھوں میں اب حیرت نہ تھی۔ صدمہ بھی نہ تھا۔ اس نے جیسے اذیت کے عالم میں یقین کی تمام منازل طے کر لی تھیں۔ ہارون اپنی دوسری بیوی کے بچے کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ خواب تھا۔ نہ خدشہ۔ نہ خیال۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ تلخ حقیقت۔ جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

محبت و احترام سے جڑے شادی شدہ زندگی کے آٹھ سال ایک دھوکا تھے، دکھاوا تھے، فریب تھے۔ در پردہ ہارون پچھلے آٹھ سالوں سے اپنی اسی محبت کے ساتھ تعلق میں رہا تھا جس سے اعظم شیرازی نے اس کی شادی نہیں ہونے دی تھی۔

وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

ہارون اب بھی نیچے تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنے باپ کی اسٹڈی کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی منت کر رہا تھا۔ ان سے معافی مانگ رہا تھا۔ مگر اعظم شیرازی کسی بھی صورت "آرزو جہانگیر" کے بچے کو قبولنے کے لیے تیار نہ تھے۔

یہ سچویشن ایک جنگ کی سی تھی۔ جیسے ملک کی نامور کاروباری ہستیوں کے درمیان جو معاہدہ طے تھا اس کے ٹوٹنے کا خطرہ ہو۔ جیسے اپنی کمزوری کسی دوسرے فریق کو تھما دینے کا خدشہ۔

"وہ میرا بیٹا ہے بابا! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اگلے دن وہ پھر ان سے کہہ رہا تھا۔

اعظم شیرازی اپنے شان دار بیڈ روم کی دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے پشت پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ قہر برساتی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ ملک کے ایک نامور بزنس ٹائکون تھے۔ اپنے انداز اور شخصیت میں کسی حاکم جیسا رعب رکھتے تھے۔ اصول و روایات کے پابند، کچھ مغرور اور متکبر جو اپنے اعلا حسب و نسب اور تعلیمی قابلیت پر فخر کرتے تھے۔ انہیں یہ بچہ کسی صورت قبول نہ تھا۔

"آرزو کے پاس چھوڑ آؤ اسے۔"

"وہ اسے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی۔"

"یہ میرا درد سر نہیں۔"

"بابا پلیز!" وہ گڑگڑایا۔ "یہ بھی آپ کا پوتا ہے۔"

"میرا پوتا صرف حماد ہے، جس کی ماں خاندانی ہے۔" وہ پلٹ کر دھاڑے تھے۔ "یہ اس آوارہ اور......"

ہارون شیرازی کرب سے لب بھینچ کر رہ گیا۔

"آپ اسے میرے ساتھ رہنے دیں۔"

"وہ یہاں رہے گا تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔" اصل مسئلہ جیسے اب لبوں پر آیا تھا۔ وہ بچہ ان کے لیے ذلت، توہین اور بے عزتی کی علامت تھا۔ وہ ان کے لیے ایک غلطی تھی۔ ایک گناہ جیسا تھا۔ جسے چھپانا مقصود، مٹانا ضروری ہو گیا تھا۔

"بابا، پلیز، مجھے معاف کر دیں۔ میں مانتا ہوں یہ میری غلطی ہے۔ آپ جو بھی سزا دیں میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں، اس طرح مت کیجیے۔"

کمرے میں یک دم ہی گہری خاموشی چھا گئی۔ اعظم شیرازی سخت پتھریلی نگاہوں سے اب ہارون کو دیکھ رہے تھے۔

جمیلہ داؤ دادھ کھلے دروازے کے اس پار رک گئی تھی۔

"ایک شرط پر میں تمہاری اس غلطی کو نظر انداز کر سکتا ہوں۔" لہجے میں وہی عناد اور سختی تھی۔

جمیلہ نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اب وہ کیا کہہ رہے تھے؟

"اسے میرے حوالے کر دو اور بھول جاؤ کہ حماد کے علاوہ تمہارا اور کوئی بیٹا بھی ہے۔"

ہارون کے پیروں تلے سے زمین نکلی تھی۔ سر پر آسمان ٹوٹا تھا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ اپنے باپ کو دیکھ کر رہ گیا۔ صدمے کے عالم میں جمیلہ داؤد بھی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

اعظم شیرازی کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ان کی بات تو جیسے اب شروع ہوئی تھی۔

"اسے تمہارا نام نہیں ملے گا، وراثت میں حصہ بھی نہیں اور نہ ہی وہ ہمارے خاندان کا کبھی حصہ بنے گا۔"

انداز دوٹوک تھا۔ لہجہ قطعیت بھرا۔ فیصلہ غیر متزلزل۔ ہر لفظ پتھر پر لکیر۔

ہارون شیرازی کے چہرے پر وحشت پھیل گئی۔ ہر شے کا حساب رکھا تھا اس نے مگر اس کا نہیں۔

"وہ اسی نام اور پہچان کے ساتھ رہے گا جو میں اسے دوں گا۔ کیئر ٹیکر کا انتظام ہو جائے گا، پڑھائی کے اخراجات۔ سب میں بینج کروں گا لیکن تمہیں ہر صورت، ہر حال میں اس سے دور رہنا ہوگا۔" انگلی اٹھا کر ایک بار پھر اپنے ارادے واضح کیے گئے۔ "کیونکہ نہ تو میں اس بدنام زمانہ لڑکی کے ساتھ تمہارا کوئی اسکینڈل افورڈ کر سکتا ہوں اور نہ ہی جمیلہ کے خاندان سے دشمنی مول لے سکتا ہوں۔"

ہارون شیرازی کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں انتہائی سرد مہری سے دیکھتے ہوئے انہوں نے حتمی فیصلہ سنایا تھا۔

"اور اگر تمہیں میرے اس فیصلے سے اختلاف ہے تو تم اسے یہاں سے لے جا سکتے ہو، لیکن یاد رکھو، جس وقت تم اس گھر کی دہلیز پار کرو گے، میں بھول جاؤں گا میرا ہارون نام کا کوئی بیٹا بھی ہے۔"

ہارون شیرازی کا سانس رکا ہوا تھا۔ دھڑکنیں تھمی ہوئی تھیں۔ وہ اب بھی اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ حیرت، بے یقینی اور صدمے سے۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

کوئی اپنے پوتے کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے؟ وہ سوچ رہا تھا۔ مگر وہ غلط سوچ رہا تھا۔ اعظم شیرازی نے سرے سے اس بچے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے لیے رحم دل ہوتے بھی تو کیسے؟ احساس کرتے بھی تو کیوں؟ وہ تو اپنے کپڑوں پر ہلکا سا داغ تک نہ برداشت کرتے تھے تو اب ایسے داغ کو کیسے رہنے دیتے جس کی پاداش میں مستقبل میں کوئی اسکینڈل بننے کا خدشہ ہوتا۔

مزید کچھ بھی سنے بغیر جمیلہ داؤد وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ روئی روئی سی سرخ و متورم آنکھوں کے ساتھ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو دل بے وفائی کے غم سے پھٹنے لگا۔

یہ حقیقت تھی کہ شیرازی اور لاشاری خاندان کے مابین جڑنے والا یہ رشتہ ایک بزنس ڈیل کی طرح تھا۔ خاندان کے بڑوں نے اپنے کاروباری اور سیاسی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان دونوں کو ایک کیا تھا۔ مگر جمیلہ نے کبھی بھی اس رشتے کو مصلحت کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہارون سے محبت کرتی تھی۔ بدلے میں وہ بھی اسے محبت ہی دکھاتا رہا تھا۔ مگر وہ محبت ایک دکھاوا تھی اس کا انکشاف کل رات ہوا تھا۔ یہ انکشاف اسے راکھ کر گیا تھا۔ یہ انکشاف اس کی محبت، وفا اور اعتماد کا تماشا بنا گیا تھا۔

سلگتی آنکھوں کو بے دردی سے رگڑتی وہ کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اور تب ہی اس نے ہارون کو سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب تھا اور آنکھیں بے تحاشہ سرخ ہو رہی تھیں۔

اعظم شیرازی اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے تو کیا ہارون گھر چھوڑ کر جا رہا ہے؟

بھاری دل کے ساتھ اس نے ہارون شیرازی کو صدر دروازے کی جانب بڑھتے دیکھا۔

”جس وقت تم اس گھر کی دہلیز پار کرو گے، میں بھول جاؤں گا میرا ہارون نام کا کوئی بیٹا بھی ہے۔“

اور وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ خالی ویران آنکھوں سے اسے صدر دروازے سے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔

ہارون شیرازی نے گھر کی دہلیز پار کر لی تھی۔ وہ اپنے بچے کو ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔

☆☆☆

اعظم شیرازی ہارون کو لندن بھیج کر اپنے روزمرہ معمولات میں ایسے مصروف ہو گئے تھے جیسے چند روز قبل کچھ نہیں ہوا تھا۔ جیسے ان کی زندگیوں میں آرزو جہانگیر کا گزر ہوا تھا نہ اس کے بچے کی آمد ہوئی تھی۔ جیسے ہارون شیرازی سے کوئی غلطی، کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا۔

جمیلہ داؤد بھی ایسے ہی کرنا چاہتی تھی۔ بے حس ہونا چاہتی تھی۔ بے پروا رہنا چاہتی تھی۔ مگر وہ ایسا کر نہیں پا رہی تھی۔ اس کے زخم مندمل نہیں ہو رہے تھے۔ اسے سکون مل نہیں رہا تھا۔

شیرازی مینشن اور سرونٹ کوارٹرز کے مابین راہداری میں جو پہلا کمرہ تھا اور جو کسی حد تک شیرازی ہاؤس سے بھی منسلک تھا وہ کمرہ اب اس بچے کا تھا۔ مدحت ہیڈ سرونٹ آغا علی کی بیٹی ہی جو اب اس کی کیئر ٹیکر بھی تھی۔ جس نے چوبیس گھنٹے نہ صرف اس کے ساتھ رہنا تھا بلکہ اعظم شیرازی کے قائم کردہ اصولوں کی پاس داری بھی کرنی تھی۔

آرزو جہانگیر کے اس بیٹے کو اعظم شیرازی کے عالی شان بنگلے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ وہ گھر کے مکینوں کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتا تھا...... وہ فنکشن، گیدرنگ اور خاندانی پارٹیز میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ باہر سے آنے والے مہمان، دوست احباب اور رشتہ داروں کے سامنے نہیں جا سکتا تھا۔ یہ سارے اصول و قوانین اعظم شیرازی نے بنائے تھے اور ایسا ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کوئی حکم جاری کریں اور ان کی سلطنت میں اس کا نفاذ نہ ہو۔

لیکن ان تمام اصول و قوانین سے جمیلہ کی اذیت کم نہیں ہوئی تھی۔ وحشت و بے سکونی کی دلدل اسے ہر بار ”آرزو جہانگیر“ کے بچے تک پہنچا دیتی تھی۔ وہ عورت ہارون کی زندگی میں اب کہیں نہیں تھی۔ مگر اس کا بچہ تھا۔ شیرازی مینشن میں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ تھا، وہ ہے۔ وہ رہے گا۔ اس حقیقت کو وہ جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ یہی حقیقت سرد پڑتی آگ بھڑکاتی تھی۔ رگ و پے میں محشر سا بپا کرتی تھی۔ پچھلی کئی راتوں کی طرح اس رات بھی وہ ٹھیک سے سو نہیں پا رہی تھی۔

اک درد تھا۔ کرب تھا۔ بے وفائی کا احساس۔ بے حسی کا تدارک۔ ایک الجھن۔ ایک وحشت۔

سر جھٹک کر، خیالات کو جھٹکا کر، واہموں کو جھٹلا کر وہ نیچے آ گئی تھی۔

کچن میں فریج کھول کر اس نے دودھ نکالا تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانا چاہ رہی تھی۔

چھوٹی سوئی بارہ کے ہندسے پر آ کر ٹھہری تو یکایک کچن کی دائیں طرف سرونٹ کوارٹرز کی طرف جاتی راہداری سے آواز بلند ہوئی تھی۔

کھولتے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے وہ یک دم چونکی تھی۔ پھر چولہا بند کر کے وہ اسی وقت کچن سے راہداری میں آ گئی تھی۔ لائٹس آف تھیں۔ فانوس جل رہے تھے۔ نیلگوں روشنی کا مدھم تاثر چہار سو پھیلا تھا۔

اس نے ہیڈ سرونٹ آغا علی کی بیٹی مدحت کو دیکھا۔

وہ متفکر سی کمروں کے دروازے کھول کھول کر جیسے فکر مندی کے عالم میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

”یہ شور کیسا تھا؟“

کندھے سے پھسلتے دوپٹے کو واپس جماتے ہوئے بوکھلاہٹ کا شکار مدحت نے اپنی مالکن کو دیکھا۔

”وہ۔ جی......“ اس کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"وہ...... میں......" مدحت بوکھلا گئی۔ سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دے۔ اور تب ہی اسٹور روم سے کھٹ پٹ کی آواز آئی تھی۔ جمیلہ نے بے ساختہ ہی سر اٹھا کر اسی طرف دیکھا تھا۔ لائٹس آف تھیں۔ دروازہ کھلا ہوا۔ اندر کوئی تھا۔ یقیناً کوئی تھا۔

مگر مدحت کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

جانے وہ اعظم شیرازی سے خائف تھی یا پھر اسے بتانے کی ہمت نہیں کر پارہی تھی۔

اب کے جمیلہ نے اس سے پوچھنے کے بجائے اسٹور روم کا رخ کیا تھا۔ ادھ کھلے دروازے کو اندر کی جانب دھکیل کر اس نے لائٹ آن کر دی۔ زرکار روشنی چہار سو پھیلی۔

بے شمار کارٹنز، فرنیچر کا سامان، غیر ضروری اشیاء۔

اس نے بے ساختہ قدم اٹھائے تھے۔ مدحت اس کے پیچھے تھی۔ وہ اب کچھ کہہ رہی تھی۔ کچھ بتا رہی تھی۔ معافی بھی مانگ رہی تھی۔ پریشان بھی ہو رہی تھی۔

یہ اس کی غلطی تھی کہ وہ "سرونٹ کوارٹر" سے یہاں آ گیا تھا۔ یہ اس کی بے توجہی تھی کہ گھر کے مکینوں کے سامنے آ گیا تھا۔

وہ یہاں تھا۔ مگر سامنے نہیں تھا۔ وہ اسٹور روم میں فرنیچر کے سامان میں ہی کہیں چھپ گیا تھا۔

لیکن اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز۔ لب بھینچے جمیلہ داؤد اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔

مدحت تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ وہ اب اسے آوازیں دیتی ہال نما اسٹور روم میں اسے تلاش کر رہی تھی۔

اس نے گم ہو جانے کے لیے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں مدحت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ دیوار رخ کھڑی الماری کے اندر نچلے خانے میں جانے وہ کیسے گھس گیا تھا۔ مگر یہ طے تھا کسی مرد کی مدد کے بغیر مدحت نہ تو الماری کو ہلا سکتی تھی اور نہ ہی اسے نکال سکتی تھی۔

پریشان اور حواس باختہ سی وہ ایک بار پھر جمیلہ سے معذرت کرنے لگی۔

"میں ابھی ابا کو بلا لاتی ہوں، اسے لے جاؤں گی، دوبارہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔" تیز تیز قدم اٹھاتی وہ وہاں سے چلی گئی تھی مگر جمیلہ داؤد اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہل سکی تھی۔

دھیمی دھیمی سسکیوں کی آواز بہت واضح تھی۔

اس کے قدم بے ساختہ اٹھے تھے۔ وہ گھوم کر دیوار کی طرف آ کر رک گئی تھی۔ اور اب کانچ کے ان ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھی جو دیوار کے پاس ہی ٹوٹے بکھرے پڑے تھے۔ اسے یاد آیا، نچلے خانے کے تمام شیشے توڑ پھوڑ کا شکار ہوئے تھے۔

پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے اندر جھانکا تھا۔

تھر تھر کانپتا وجود، لرزتے ہونٹ، آنسوؤں سے بھری ہوئی سرخ و متورم آنکھیں۔ وہ ساڑھے پانچ سال کا بچہ خوف زدہ اور متوحش سا اپنے آپ میں سمٹ کر بیٹھا تھا۔

جمیلہ کا سانس رکا۔ دھڑکنیں تھمیں۔ اس ایک لمحے میں اسے کچھ ہوا اور اس نے بے ساختہ ہی درز سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اسے باہر نکالنے کے لیے۔

بے شمار اجنبی چہروں میں ایک اور چہرے کا اضافہ ہوا تو بچے نے روتے ہوئے اس کی پہنچ سے بھی دور ہونا چاہا۔ اسے اپنا باپ چاہیے تھا۔ ماں چاہیے تھی۔ وہ اب بھی روتے ہوئے۔ چیختے ہوئے آوازیں دیے جا رہا تھا۔

جمیلہ کا ہاتھ پتھر ہوا۔ دل کانپ کر رہ گیا۔ اس سے بچے کی حالت بالکل دیکھی نہ گئی۔

مدحت آغا علی کو لیے حاضر ہوئی تو اپنی مالکن کو وہیں بیٹھا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اعظم شیرازی کا سخت حکم تھا کہ وہ گھر کے مکینوں کے سامنے کبھی نہ آئے۔ غلطی سے بھی نہیں۔

ہیڈ پیروئنٹ آغا علی نے پورا زور لگا کر اتنی جگہ ضرور بنالی تھی کہ اسے باہر نکالا جا سکتا تھا۔ مگر اس کی فلک شگاف چیخیں۔ اور پنچ سے دور ہو جانے کی دیوانہ وار جستجو۔

اس سے پہلے کہ آغا علی آگے بڑھتا، اس سے پہلے کہ مدحت ہی اسے نکالنے کی سعی کرتی، جمیلہ داؤد نے۔ ایک ہی جست میں۔ اسے بازو سے پکڑ کر، اس کی تمام تر مزاحمت اور چیخ و پکار کے باوجود باہر نکال لیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ اس کی بانہوں میں تھا۔

وہ رو رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ وہ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ اسے چھوڑ نہیں رہی تھی۔ اس کا حصار مضبوط تھا۔ مضبوط ہی رہا تھا۔

اپنی گرفت ہر لحاظ سے پختہ کیے وہ اسے سینے سے لگا چکی تھی۔

اگلے چند لمحوں میں بچے کی ہر مزاحمت دم توڑ گئی۔ روتے کرلاتے ہوئے وہ بے دم ہو گیا۔ جیسے اس میں مزید ہمت نہ رہی ہو۔ جیسے وہ تھک گیا ہو۔ ہار گیا ہو۔ مر گیا ہو۔ اسے سینے سے لگائے جمیلہ داؤد اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی تھی۔

کیکپاتا ننھا وجود۔ اور اس کا شدت سے دھڑکتا دل جیسے ابھی سینہ چیر کر باہر آ جائے گا۔

"یہ زخم......" مدحت نے گھبرا کر اس کی سرخ پڑتی آستین اوپر کی تھی۔ غالباً الماری کے اندر جگہ بناتے وقت اس کا بازو کیل سے رگڑ گیا تھا تب ہی جلد ادھڑ گئی تھی۔

"ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" کافی دیر بعد جمیلہ کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھی۔ پھر وہ اسے بانہوں میں لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مدحت بھی اس کے ساتھ تھی۔ کچھ حیران۔ کچھ پریشان اور خائف بھی۔

شیرازی مینشن سے ہاسپٹل کافی دوری پر تھا۔ تب ہی جمیلہ داؤد کے حکم پر ڈرائیور نے گاڑی کا رخ ڈاکٹر مصطفیٰ کے کلینک کی طرف موڑ دیا تھا جو ان کے فیملی ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ ڈیوٹی پر موجود تھے۔ فیملی تعلقات کے باعث فارس کو بھی انہوں نے اٹینڈ کیا تھا۔

گھنٹے بعد ہی اسے اندر آنے کی اجازت ملی تھی۔

زخم پر تین ٹانکے لگے تھے، ڈرپ، خواب آور انجکشن کے بعد وہ پرسکون نیند سو رہا تھا۔

"پریشان مت ہو، ہی از اسٹیبل ناؤ۔" وہ اس سے کہہ رہے تھے۔ قدرے فاصلے سے ہی وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں نم تھیں اور ہاتھ دوپٹے سے الجھ رہے تھے۔

لحاف اچھی طرح سے اوڑھا کر جب نرس جا چکی تو ڈاکٹر مصطفیٰ اس کے پاس آ گئے۔

جمیلہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ اس کے معلم تھے۔ مہربان استاد۔ ایک بہترین ناصح۔

"آپ ٹھیک ہیں بیٹا؟"

"انسان ان سوالات کا کیا کرے جو نیند اڑا دیں۔ بے قراری میں بہا دیں۔ جن کا کوئی جواب ہو، نہ منطق۔ نہ دلیل۔ جیسے جنگ۔ بے چینی۔ بے سکونی۔ بس درد۔ اذیت۔ کرب۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنی کیفیت کو سمجھنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

"سوال "ضمیر" اٹھاتا ہے۔ جواب "ایمان" دلاتا ہے۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"ایمان بتلا رہا ہے، میں بھٹک رہی ہوں۔"

اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"ایمان بتلا رہا ہے، تم اب صحیح راستے پر ہو۔" بہت نرمی اور متانت سے کہہ کر وہ چلے گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے معاملات کی گہرائی میں اترنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ صرف سنتے تھے اور جواب دے دیا کرتے تھے۔

اس نے ہمت کر کے اپنا رخ بدلا۔ ایک بار پھر پرسکون نیند سوتے اس بچے کو دیکھا جس کی وجہ سے وہ

گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پار ہی تھی۔
زرکار روشنی میں اس کا چہرہ واضح تھا۔ وہ اپنی ماں کی شکل تھا۔ ہو بہو اس کی کاپی۔ بس اس کے بال ہی ہارون شیرازی کی طرح سیدھے تھے۔ قدرے لمبے۔ پیشانی پر بکھرے۔ گردن کو چھوتے ہوئے۔
رنگت دودھیائی تھی۔ اور آنکھیں۔
جمیلہ نے سرخ و متورم سی بند آنکھوں کو دیکھا۔ پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سرخ گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں ٹھہری تھیں۔ ایسے جیسے وہ روتے روتے یکا یک پرسکون ہو گیا ہو۔ اور ایسی ہی ایک سکون بھری کیفیت جمیلہ داؤد نے بھی اپنے اندر محسوس کی تھی۔

☆☆☆

"پریشانی کی اب کوئی بات نہیں ہے۔ ہی از آل فائن ناؤ! یہ کچھ میڈیسنز ہیں جو میں لکھ کر دے رہا ہوں، اسے دیجیے۔ اور اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھیں۔"
اگلے دن چیک اپ کے بعد ڈاکٹر مصطفیٰ جمیلہ سے کہہ رہے تھے اور جمیلہ اسے ہی دیکھ رہی تھی جو ابھی تک اپنی نیند کے اثر سے مکمل طور پر باہر نہیں آیا تھا۔
مدحت اس کے لیے کھیر بنا کر لائی تھی۔ جمیلہ کے اشارے پر ہی اس نے تیزی سے پیالے میں نکالی۔ جب تک اس نے بہت احتیاط سے بچے کو اٹھا کر بٹھایا، تب تک وہ پیالہ آگے کر چکی تھی۔ ایک بازو سے اسے اپنے حصار میں لیے دوسرے ہاتھ سے چمچ بھر کر وہ اس کے لبوں کے قریب لائی تو اس نے انکار نہیں کیا۔ بہت آرام سے پہلا چمچ لے لیا۔
وہ سوئی جاگتی کیفیت میں تھا۔ ہوش میں تھا بھی اور نہیں بھی۔ لیکن وہ کوئی بھی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔
مدحت حیران تھی۔ نہ وہ رویا تھا۔ نہ چیخا تھا۔ نہ اس نے کوئی واویلا کیا تھا نہ بھاگنے کی کوشش۔ حالانکہ خود اسے ایک چمچ کے لیے کتنی کوشش کرنا پڑتی تھی۔
بہت آرام اور تسلی سے جمیلہ نے اسے کھیر کھلائی تھی۔ نیم گرم دودھ بھی پلایا تھا پھر میڈیسن بھی دی تھی جو مدحت کلینک کی فارمیسی سے لے آئی تھی۔
اس دوران وہ مکمل طور پر پرسکون رہا تھا۔ یقیناً وہ انجیکشن کے زیراثر ہی تھا۔ یا پھر وہ تھک چکا تھا اور اب کوئی بھی مزاحمت نہیں کرنا چاہتا تھا۔
دس بجے اسے ڈسچارج کر دیا گیا اور وہ اسے گھر لے آئے تھے۔
اس کے بعد وہ دوپہر میں اسے دیکھنے آئی تھی تب وہ سو رہا تھا۔ پھر شام میں جب وہ گئی تھی تو وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکائے شیشے کے ساتھ گال مس کیے باہر ان روشنیوں کو دیکھ رہا تھا جو وسیع و عریض سبزہ زار پر جگہ جگہ جل رہی تھیں۔
اعظم شیرازی کے یہاں آج کچھ سیاسی نامور شخصیات کی دعوت تھی۔ کھانے کا انتظام باہر لان میں کیا گیا تھا۔
"اب کیسا ہے؟" اس نے مدھم آواز میں مدحت سے پوچھا تھا۔
"پہلے سے بہت بہتر ہے جی! آج اس نے مجھے بالکل بھی تنگ نہیں کیا۔" مدحت نے خوش گوار حیرت کے ساتھ آگاہی دی تھی مگر جمیلہ کو اس آگاہی نے عجیب سی وحشت میں مبتلا کر دیا۔
جب تک امید تھی۔ تب تک مزاحمت تھی۔
جب امید ٹوٹی۔ تو مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔
وہ کچھ دیر تک دروازے میں کھڑی رہی تھی۔
پھر وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ بازو کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکائے اسے دیکھنے لگی۔ کچھ محبت۔ کچھ انسیت۔ کچھ ترحم سے۔ بچے نے اس کی موجودگی کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔
جمیلہ ان آنکھوں کو دیکھنے لگی جن میں تین بہترین رنگوں کی آمیزش تھی۔ سبز، ہلکا براؤن اور سنہرا رنگ! یہ آنکھیں آرزو جہانگیر کی آنکھیں تھیں۔
اگلے کئی لمحوں تک ایک خاموشی سی حائل رہی۔
بچہ ابھی بھی اسے مکمل نظرانداز کیے ہوئے تھے۔

''ہیلو۔'' مجبوراً اسے ہی مخاطب کرنا پڑا۔ بچے نے ذرا سی نظریں اٹھا کر جمیلہ کو دیکھا۔ مگر جواب نہیں دیا۔

''میرا نام جمیلہ ہے اور تمہارا نام؟'' یہ تعارفی مرحلہ تھا۔ اسے کچھ مشکل لگا۔ وہ ان بچوں میں سے یقیناً نہیں تھا جو بآسانی گھل مل جائیں ورنہ وہ مدحت کو اتنا ٹف ٹائم کیوں دیتا؟

دم سادھے وہ خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ لب باہم پیوست رہے۔

''لیٹ می گیس! کہیں تمہارا نام شہریار تو نہیں؟ ارسلان!'' ایک لمحے کو رک کر کچھ سوچا۔ ''یا پھر......''

''فارس ہارون شیرازی۔'' اپنے نام سے متعلق وہ یقیناً بہت پکی تھا۔ فارس تھا تو پھر فارس ہی تھا۔ ہارون کا بیٹا۔ شیرازی خاندان کا سپوت۔ اور کوئی نام۔ اور کوئی مقام۔ اور کوئی پہچان اسے قبول نہ تھی۔

کیا اعظم شیرازی اس کی پہچان کی طرح اب اس کی یادداشت سے اس کا مکمل نام بھی ہٹا پائیں گے؟

''نام تو بہت پیارا ہے آپ کا! ویسے فارس کا مطلب کیا ہے؟'' کی... اپنی کم علمی کا اعتراف کرتی وہ ذرا سا آگے جھکی تھی۔ گھنے سیاہ بالوں کی کچھ لٹیں اس کے چہرے پر بکھریں۔ سونے کی چوڑیاں بھی کھنک اٹھیں۔

وہ لب بھینچے اس کی آنکھوں میں اجنبی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

''مجھے سوچنے دو، شاید مجھے یاد آجائے۔'' ایک لمحے کا توقف کیا، پھر یوں ظاہر کیا جیسے اسے اچانک یاد آ گیا ہو۔

''فارس کا مطلب ہے شہ سوار۔ آ ہارس رائڈر۔ وہ جو گھوڑے پر بیٹھتا ہے اور تلوار پکڑ کر فائٹ بھی کرتا ہے۔''

نہ تو وہ گھوڑے پر بیٹھتا تھا۔ نہ تلوار پکڑ کر فائٹ کرتا تھا۔ اس نے چہرے کا رخ موڑا اور ایک بار پھر باہر دیکھنے لگا۔

جمیلہ داؤد چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''یہاں آؤ۔''

اس نے ایک بار پھر جمیلہ کو دیکھا تھا۔ اب کے ذرا سی خفگی سے۔ یقیناً جمیلہ کی مداخلت اسے پسند نہیں آ رہی تھی۔

''میرے پاس آؤ۔''

مگر وہ نہیں آیا تھا۔

''پاپا کے پاس جانا ہے؟''

اس کے چہرے کے تاثرات یکا یک بدلے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ لب بھنچ گئے۔

''آؤ۔'' اب کے جمیلہ نے ہاتھ بڑھا کر اپنی طرف بلایا تو وہ فوراً ہی اٹھ گیا۔ پکڑ کر اپنے قریب کیا تو اس کی بانہوں میں سما گیا۔ اور پھر وہ رونے لگا۔

جمیلہ کی دھڑکنیں تھم گئیں۔ اپنے سینے سے لگائے اس کی پشت سہلاتے ہوئے وہ خود بھی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گئی۔

فارس کو اپنا باپ، اپنی ماں چاہیے تھی۔ وہ ان کے لیے تڑپ رہا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ اسی وقت فارس کو ساتھ لیے شیرازی مینشن میں آ گئی۔ اسٹڈی روم میں صوفے پر بیٹھ کر اس نے ہارون کا نمبر ملانے کے بعد ریسیور فارس کے کان کے ساتھ لگا دیا۔ کچھ ہی دیر میں کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''ہیلو۔'' باپ کی آواز سماعت سے ٹکراتے ہی اس کی آنکھیں بھر گئیں۔ ''ہیلو پاپا۔''

دوسری طرف سے ایک دم سناٹا چھا گیا...... موت بھرا، وحشت بھرا سناٹا۔ اگلے ہی لمحے کال ڈسکنیکٹ ہو گئی لیکن فارس بات کر رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو آوازیں دیے جا رہا تھا۔

اس نے بے اختیار ریسیور لے کر کریڈل پر رکھ دیا۔

''اسے لے جاؤ مدحت!''

اور خود وہ اسی وقت اٹھ کر اپنے کمرے میں

آ گئی تھی۔ اسے سنبھلنے میں کچھ وقت لگا پھر اس نے ہارون شیرازی کو فون کیا۔
"آپ نے اپنے بیٹے سے بات کیوں نہیں کی؟" لہجہ درشت تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ہارون اس کے سامنے ہو اور وہ اسے جھنجھوڑ کر ہلا دے..... لرزا دے۔
"تم بابا کے فیصلے کو بھول گئی ہو؟"
وہ تھم کر رہ گئی۔ یہ کیسا جواب تھا جو اس نے دیا تھا؟ یہ کیسا عذر تھا جو اس نے پیش کیا تھا؟ وہ ہارون میں فارس کا "باپ" ڈھونڈ رہی تھی اور بدلے میں اسے کیا ملا تھا؟ اعظم شیرازی کا بیٹا!
"آپ کا بیٹا آپ کے ہی گھر میں سرونٹ کوارٹر میں رہ رہا ہے ہارون۔"
اور ہارون نے فون بند کر دیا۔ ریسیور ہاتھ میں لیے وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔
"کل تم فارس کو یہاں لائی تھیں؟" اگلے دن اعظم کی عدالت میں اس کی پیشی ہو گئی تھی...... وہ انتہائی غصے میں تھے مگر تحمل سے پوچھ رہے تھے۔
"جی۔"
"کس لیے؟"
"میں ہارون سے اس کی بات کروانا چاہتی تھی۔"
اعظم شیرازی نے مٹھیاں بھینچ کر خود پر قابو پالیا تھا..
"تو کوئی بات کی اس نے؟"
"نہیں۔"
ان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔ لبوں پر جاندار مسکراہٹ پھیل گئی۔
"میں جانتا تھا، وہ یہی کرے گا۔"
جمیلہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔
"ویسے تم فارس کے معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لینے لگی ہو؟ حالانکہ اس کے ساتھ نہ تمہارا کوئی رشتہ ہے نہ کوئی تعلق۔"

"آپ کو اس پر رحم نہیں آتا؟" اس نے الٹا سوال کر لیا۔
"رحم؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسے۔ "مجھے نہیں لگتا اس کے ساتھ کوئی ظلم ہو رہا ہے۔ وہ اچھا کھاتا ہے، اچھا پہنتا ہے۔ اب شہر کے بہترین اسکول میں بھی جائے گا۔ ورنہ تم سوچو میں اس کے ساتھ کیا نہیں کر سکتا تھا۔"
"اس سے بڑھ کر اور بڑا ظلم کیا ہو گا کہ آپ نے اپنے پوتے سے۔ اس کی شناخت اور پہچان چھین لی ہے، باپ سے بھی دور کر دیا ہے۔"
"ہمارے خاندان کی نسلیں خاندانی شریف عورتوں سے چلتی ہیں جمیلہ!"
اعظم شیرازی کی آنکھوں میں غیض و غضب کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ "میں نے ہارون کی دوسری شادی کو تسلیم کیا ہے نہ اس بدچلن عورت کو اپنی بہو مانا ہے......"
کاٹ دار لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے سخت پتھریلی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔
"اب تم جا سکتی ہو۔" انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ "آئندہ میں نہ سنوں کہ تم اس بچ عورت کے بچے کو اس گھر میں لائی ہو، ایسا نہ ہو کہ میں کوئی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں۔"
اس نے سر اٹھا کر اعظم شیرازی کو دیکھا۔ وہ دھمکی نہیں دے رہے تھے، اپنے ارادوں سے آگاہ کر رہے تھے۔ جو کہتے تھے، اسے کر دکھانے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔
مزید کچھ بھی کہے بنا وہ بھاری دل کے ساتھ مڑ گئی تھی۔
کوئی فرق نہیں تھا اس کے اپنے باپ بھائیوں میں اور سسر اور شوہر میں، سب ہی ایک سے تھے۔ طاقت کے نشے میں چور، دولت کے گھمنڈ میں جابر اور متکبر۔

☆☆☆

اعظم شیرازی کی تنبیہ کے باوجود وہ اگلے دن

خود جا کر فارس کے لیے بے شمار کھلونے اور کپڑے خرید لائی تھی۔ نئے فرنیچر کے ساتھ اس نے پورے کمرے کو بھی اپنی نگرانی میں سیٹ کروایا تھا۔ اس دوران وہ ـــــ کونے میں کھڑا ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہا تھا۔

کھلونوں کا ایک ڈھیر تھا جو اس کے سامنے رکھا تھا۔ نئے کپڑے۔ اسکول بیگ۔ کلرنگ بکس، اسٹوری بکس۔ بے شمار پنسلیں، کلرز۔ ایک رائٹنگ ٹیبل جسے اسٹیکرز سے جمیلہ خود ہی سجانے میں لگی ہوئی تھی۔

کمرے میں حقیقی رنگ تو بکھر ہی گئے تھے مگر اس کی آنکھوں میں زندگی کا کوئی رنگ ابھی بھی نہیں ابھرا تھا۔ وہ اب بھی کھنچا کھنچا سا۔ اجنبی نگاہوں سے کبھی جمیلہ اور کبھی ملازموں کو تکتا الماری کے ساتھ کونے میں ہی سمٹ کر بیٹھا رہا تھا۔ اجنبی چہرے اسے وحشت میں مبتلا کرتے تھے۔ ان جانا سا خوف بڑھتا تھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا تھا۔

''کھانا لگا دوں جی؟'' مدحت نے جمیلہ سے مدد چاہی تھی۔ چھوٹے سے ریکس میں کتابیں سیٹ کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس دن فارس نے دوسری بار اس کے ہاتھ سے بہت سکون اور تسلی سے کھانا کھایا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ کئی بار سر اٹھا کر اسے دیکھ چکا تھا۔ جمیلہ مسکرا دیتی مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا کوئی ایک رنگ بھی نہ کھلتا۔

اگلے دن وہ اس کے اسکول بھی گئی۔ پرنسپل کے ساتھ ساتھ کلاس ٹیچر سے بھی ملی۔ کلاس روم کا بھی جائزہ لیا۔ پھر اس نے فارس کی حالت کے پیش نظر اس کے لیے جگہ کا انتخاب خود کیا۔ اتنے سارے بچوں میں اس نے ایک گپلو اور بہت زیادہ باتونی بچے کو اس کے برابر بٹھایا۔ وہ فرینڈلی قسم کا تھا۔ لمحوں میں دوست بنا کر باتیں کرنے لگتا تھا۔ کھڑے کھڑے اس نے جمیلہ سے بھی دوستی کر لی تھی اور چاکلیٹ لے کر ہی ٹلا تھا۔

''یور ممی از سو پریٹی!'' چاکلیٹ کا ریپر اتارتے ہوئے اس نے فارس کو بتایا تھا۔ جواب جمیلہ کو دیکھ رہا تھا۔

جانے سے پہلے ہاتھ ہلا کر وہ ایک بار پھر مسکرائی تھی۔ شاید اب وہ بھی مسکرائے۔ شاید اب کے وہ اپنے احساسات کا اظہار کرے۔ مگر فارس کے لب باہم پیوست ہی رہے تھے۔ چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔

مسکرانا، ہنسنا، باتیں کرنا تو وہ جیسے بھول ہی گیا تھا۔ کچھ وقت درکار تھا اسے سب کچھ نئے سرے سے، نئے انداز میں اور نئے لوگوں سے سیکھنے کے لیے۔

☆☆☆

باپ اور بیٹے کی اس جنگ میں نقصان فارس کا ہو رہا تھا۔ چھ سال کا وہ بچہ ان چند ہفتوں میں کملا کر رہ گیا تھا۔ نفسیاتی طور پر اتنا ڈسٹرب تھا کہ اس نے بولنا بھی بند کر دیا تھا۔ کھانا وہ بمشکل کھاتا تھا اور اسکول میں بھی کوئی خاطر خواہ کارکردگی نہیں دکھا رہا تھا۔

تھک ہار کر جمیلہ نے آرزو جہانگیر کو ڈھونڈا تھا۔ بہت مشکلوں سے ملی تھی وہ۔ بہت صعوبتوں سے ملاقات ہو پائی تھی۔

''میں شادی کر رہی ہوں۔''

فارس سے متعلق ساری بات سن لینے کے بعد آرزو جہانگیر نے کہا بھی تو بس یہی۔

کوئی فکر۔ پریشانی۔ اندیشہ۔ ایسا کوئی بھی تو تاثر نہیں تھا اس کے چہرے پر۔ جمیلہ کو دکھ ہوا۔ کیا وہ ''ماں'' تھی۔ کیا وہ واقعی میں ''فارس'' کی ماں تھی؟

گھنگھریالے سنہرے بالوں کو کیچر میں جکڑے۔ جینز پر مونگیا رنگ کی اسٹائلش شرٹ میں ملبوس وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ہیل میں مقید دائیں پیر کو جنبش دیتی بہت مطمئن اور پرسکون بیٹھی لائم جوس سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''میں تم سے تمہارے بیٹے کی بات کر رہی

ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیا وہ صرف وہ میرا بیٹا ہے۔" اپنی دودھیائی کہنیاں میز پر ٹکائے وہ کچھ آگے ہوئی تھی۔

"ویسے تم کیوں میرے بیٹے کے غم میں اتنا ہلکان ہو رہی ہو؟ تمہارے بیٹے کی جگہ نہ لے لے اس لیے؟"

"پہلے مسٹر شیرازی تمہارے بیٹے کو قبول تو کر لیں۔" انتہائی برودت سے جمیلہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"اوہ کم آن۔" وہ ہنس دی۔ "سب جانتا ہے وہ بلڈی اولڈ مین!" غصے اور حقارت سے اعظم شیرازی کا نام لیتے ہوئے اس نے پھر جمیلہ کو دیکھا۔ "میں تمہاری ان باتوں پر یقین کرنے والی نہیں ہوں۔ اور اگر یہ حقیقت ہے بھی، تب بھی یہ میرا درد سر نہیں ہے۔ ہارون نے سپریشن کے وقت اسے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سو پلیز اگر کوئی بات تمہیں کرنا بھی ہے تو ڈائریکٹ ہارون سے کرو! مجھے اس سب میں مت گھسیٹو۔"

اپنا ہینڈ بیگ شولڈر پر ڈالتے ہوئے وہ جانے کے لیے اٹھ گئی تھی۔ اور جمیلہ کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔

پہلے ہارون کے رویے نے اسے مخمصے میں ڈالا تھا۔ اب آرزو جہانگیر کا رویہ اسے ورطہ حیرت میں ڈال رہا تھا۔ اس کا خیال تھا فارس کے بارے میں جاننے کے بعد آرزو اسے یہاں سے لے جائے گی مگر وہ تو جیسے جمیلہ پر اپنا موقف واضح کرنے آئی تھی۔

آرزو سے ملاقات کے بعد اگلے کئی دنوں تک اس کا ذہن الجھا رہا۔

ایک دو بار اس نے اعظم شیرازی کا دل فارس کے لیے نرم کرنے کی کوشش بھی کی مگر ہر بار وہ نام سن کر ہی یوں بھڑک اٹھتے جیسے جمیلہ نے ان کے پوتے کا نہیں کسی دشمن کا نام لے لیا ہو۔ دوسری طرف ہارون یوں خاموش ہو جاتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

اور تب ہی اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

اگر وہ شیرازی مینشن میں نہیں بھی رہتا، تب بھی وہ اتنا بھی دور نہیں کہ جمیلہ کی محبت، توجہ اور اپنائیت سے محروم رہ سکے۔ مسئلہ ان باپ بیٹے کے درمیان ہے۔ اس کے اور فارس کے درمیان تو نہیں۔ سارے وعدے، قاعدے ہارون سے جڑے ہیں۔ اس کے ساتھ تو ہرگز نہیں۔

☆☆☆

مدحت اس کی کیئر ٹیکر تھی۔ مگر جمیلہ داود "کیئر" سے آگے کا سوچتی تھی۔ محبت۔ اور تربیت۔

"فارس کو اپنی ڈیوٹی نہیں، اپنی ذمہ داری سمجھ کر ٹریٹ کیا کرو مدحت! میں جانتی ہوں بابا تمہیں تمہارے کام کی سیلری دیتے ہیں۔ مگر کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیں خلوص دل سے اجر کی نیت سے کرنا چاہئیں۔"

مدحت کچھ حیرت سے اپنی مالکن کو دیکھنے لگی۔ جمیلہ، فارس وجدان کا شیڈول ترتیب دے رہی تھی۔ وہ اسکول لنچ میں کیا لے کر جائے گا، دوپہر میں کیا کھائے گا۔ شام میں وہ کیا لے گا۔ یہ سارے معاملات اب وہ خود طے کر رہی تھی۔

"کھانا میں گھر سے ہی دوں گی! جو کچھ جواد کے لیے بناؤں گی اس کا ایک حصہ فارس کے لیے بھی ہوگا۔"

"مگر بڑے صاحب۔"

جمیلہ نے سر اٹھا کر تنبیہی نگاہوں سے مدحت کو دیکھا۔ وہ مؤدب ہو کر سر جھکا گئی۔

"کیا شیرازی مینشن سے سرونٹ کوارٹرز میں پہلے کھانا نہیں جاتا؟"

"جاتا ہے جی۔" مدحت کا سر جھکا رہا۔

"ضروری نہیں تم ہر خبر اپنے ابا کو دیا کرو، جانتی تو ہو وہ ہر بات تمہارے بڑے صاحب تک پہنچا دیتے ہیں، راز رکھنا سیکھو۔ ہر بات بتانے والی نہیں ہوتی۔"

"جی! بہت بہتر۔" مدحت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس سے پیار اور نرمی سے بات کیا کرو، سختی سے مت پکڑا کرو مدحت!"

"جی!"

بہت سی تنبیہات اور نصیحتوں کے ساتھ اس نے باقاعدگی سے مدحت کو ٹریننڈ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ خود بھی اب فارس کو وقت دینے لگی تھی۔

"میں نہیں چاہتی، وہ زندگی گزارے، میں چاہتی ہوں وہ زندگی جیے۔" وہ اکثر مدحت سے کہتی۔

وسیع وعریض رقبے پر پھیلے سرسبز لان پر وہ ہر شام اس کی انگلی تھام کر چلتی جاتی۔ چلتی جاتی۔ اور وہاں جاکر رک جاتی جہاں اعظم شیرازی کے گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ اعلا نسل کے عربی گھوڑوں کو دیکھتے ہوئے فارس کی آنکھوں میں ہر بار تعجب اور اشتیاق سا ابھرتا۔ ہر بار وہ انہیں ایسے دیکھتا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کا یہ رنگ جمیلہ کو بھلا لگتا۔ وہ مسکرا دیتی۔ وہ اس کی مسکراہٹ کو دیکھتا۔ پھر اطراف میں دیکھتے ہوئے۔ بے دھیانی میں ہی جمیلہ کی انگلی پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا۔ اور جمیلہ کو اس کی اس حرکت پر ٹوٹ کر پیار آتا۔

ایک رات جب وہ فارس کو کمرے تک چھوڑ کر گھر آئی تھی تو اعظم شیرازی لاؤنج میں اس کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ پچھلے ایک ماہ سے جمیلہ کیا کر رہی تھی انہیں سب معلوم تھا۔ اسے فارس کے معاملات سے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کر کے بھی وہ دیکھ چکے تھے مگر اب جیسے ان کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔

"میں اگر اسے اڑان کے لیے پَر دے رہا ہوں تو مناسب وقت پر لینے کا پورے اختیار بھی رکھتا ہوں، میں جس وقت اسے حدود وقیود سے نکلتا دیکھوں گا اسے واپس اس کی اوقات میں لے آؤں گا، مگر جو تم کر رہی ہو جمیلہ! اس پر تم بہت پچھتاؤ گی۔"

"جو کام اجر کی نیت سے کیا جائے اس پر پچھتاوے نہیں ملا کرتے۔"

"تو تم اجر کما رہی ہو؟" اعظم شیرازی کا لہجہ استہزائیہ ہوا۔

"ایک ماں ہونے کا حق ادا کر رہی ہوں بابا۔"

"مجھے حیرت ہے یہ تم کہہ رہی ہو۔"

"سوتیلی ہوں۔ بے رحم نہیں ہوں۔"

اعظم شیرازی آنکھوں میں غضب لیے کھڑے رہے۔

"ویسے بھی یہاں سب فارس کو آپ کے ایک جاں نثار ملازم کے یتیم بیٹے کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آپ بھی یہی سمجھ لیں کہ میں ایک یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوں۔"

صدر دروازے سے اندر داخل ہوتا ہارون اپنی جگہ منجمد ہوا تھا۔

"یتیم......" اس کا سانس رکا تھا۔ "یتیم......" اس کی دھڑکن تھمی تھی۔

اعظم شیرازی اگلے کئی لمحوں تک سخت نگاہوں سے جمیلہ کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے ہنکارا بھرا۔

"حماد اگلے ہفتے واپس آ رہا ہے، میں نہیں چاہتا تم اسے اس سب میں انوالو کرو۔"

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" اس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

"فارس میرے ملازم کا بیٹا ہے، حماد کے علم میں بھی یہی بات آنی چاہیے۔" انہوں نے انتہائی ٹھنڈے لہجے میں بھاری گمبھیر آواز میں کسی حاکم کی طرح حکم سنایا تھا۔ آنکھوں کا تاثر بتاتا تھا کہ اب کے جمیلہ نے اپنی من مانی کی تو نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

"ایٹ لیسٹ آپ نے یہ تو مانا کہ حماد کا فارس کے ساتھ کوئی رشتہ ہے جسے چھپانے کی ضرورت ہے۔"

اعظم شیرازی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے۔ جمیلہ مزید کچھ بھی کہے بنا وہاں سے چلی گئی تھی۔

ہارون کمرے میں آیا تو وہ وارڈ روب کھولے کھڑی تھی۔

گھڑی اور کف لنکس اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے جمیلہ کو دیکھا۔ نائٹ گاؤن ہاتھ میں پکڑے وہ سیاہ آنکھوں میں غصہ لیے اس کی طرف مڑ گئی تھی۔

"یتیم بچوں کو صبر آ جاتا ہے کہ وہ جانتے ہیں ان کے ماں باپ قبروں میں ہیں، اگر جو وہ زندہ ہوتے ان

کی حالت ایسی نہ ہوتی! لیکن جن بچوں کو معلوم ہو ان کے ماں باپ زندہ ہیں اور تب بھی ان کی یہ حالت ہے۔ ذرا سوچیں انہیں صبر کیسے آتا ہوگا؟"

"بس کردو جمیلہ۔"

"میں بس کردوں؟" وہ ہارون پر چلا اٹھی۔ "آپ بس کیوں نہیں کرتے؟"

"بابا کا فیصلہ۔"

"بھاڑ میں گیا ان کا فیصلہ۔" وہ ضبط کھو بیٹھی تھی۔

ہارون شیرازی نے آج سے قبل اسے اتنے شدید غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"اپنے آپ کو میرے سامنے مظلوم اور بے بس بنا کر پیش مت کریں ہارون! ظالم کی معاونت کرنے والا بھی ظالم ہوتا ہے۔"

ہارون کرب کے عالم میں جمیلہ کو دیکھ کر رہ گیا۔

"میں یہ سب فارس کے لیے ہی کر رہا ہوں۔"

"غلط۔ آپ صرف اپنے لیے کر رہے ہیں۔" انگلی اٹھا کر اس نے کہا۔ "صرف اور صرف اپنے لیے۔ ورنہ کوئی بھی باپ اس طرح اپنی اولاد کا سودا نہیں کرتا۔"

"تم سمجھ کیوں نہیں رہیں جمیلہ!"

"میں نہیں سمجھ رہی؟ آپ اپنے بیٹے کی کیفیت سمجھ رہے ہیں؟ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے کہ چند دنوں میں کسی اور کی گود میں رہے گا تو ماں باپ کا لمس بھول جائے گا۔ اسے آپ یاد ہیں۔ اسے آرزو یاد ہے۔ اور یہ "یاد" اس کے لیے کتنی بڑی اذیت بنتی جا رہی ہے کچھ اندازہ ہے آپ کو؟"

ہارون کرب کے عالم میں لب بھینچ گیا۔ "تم یقین کرو یا نہ کرو۔ لیکن میں یہ سب فارس کے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔"

"اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں ہارون! کہیں ایسا نہ ہو یہ بھلائی آپ کے بیٹے کو بربادی کی طرف دھکیل دے۔"

پاؤں پٹختے ہوئے وہ واش روم میں چلی گئی۔ دروازہ اس نے قدرے زور سے بند کیا تھا۔

ہارون شیرازی بے بسی سے اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اسکول سے واپسی پر سبزہ زار پر قدم اٹھاتے ہوئے وہ سرونٹ کوارٹر کی طرف جا رہا تھا جب اسے ڈرائیو وے پر بیرونی گیٹ کے عین سامنے ایک گاڑی رکتی ہوئی نظر آئی تھی۔

سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہارون شیرازی اپنے دوستوں کے ہمراہ گاڑی سے نکل رہا تھا۔

فارس اپنی جگہ رک گیا۔ اس نے پورے تین ماہ بعد اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ کتنی خوش نصیبی کی بات تھی کہ اس لمحے وہاں مدحت یا آغا علی نہیں تھے جو اسے ہارون کے پاس جانے سے روک لیتے۔

وہ تقریباً بھاگتے ہوئے آیا تھا اور باپ کے دوستوں کے سامنے ہی اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

ہارون ایک لمحے کے لیے جامد ہوا تھا...... ساکت۔ صامت۔ اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا......

"یہ پیارا سا بچہ کون ہے؟" اس کے دوست کی بیوی نے کچھ اشتیاق سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ہارون کے ہاتھ متحرک ہوئے تھے، اس نے فارس کو خود سے الگ کیا......

"ہمارے ملازم کا بیٹا ہے۔ فارس وجدان۔"

اس کے نرم و ملائم بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے آگے بڑھنا چاہا تھا مگر فارس اس کی تمام تر کوشش ناکام بناتے ہوئے ایک بار پھر اس سے لپٹا تھا۔ اور عین اسی لمحے مدحت جانے کہاں سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ فارس کی تمام تر مزاحمت اور چیخ پکار کے باوجود وہ اسے اٹھا کر ساتھ لے گئی تھی۔

"یتیم بچہ ہے۔ اس گھر کے سب ہی مالکان اس سے بہت پیار کرتے ہیں تو۔ اس لیے۔" آغا علی نے فوراً وضاحت دیتے ہوئے ہارون شیرازی کو اس سچویشن سے نکالنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ دوست ہارون کے اخلاق سے متاثر نظر آتے شیرازی مینشن میں جا چکے تھے اور مدحت اسے کمرے میں واپس لے آئی تھی۔

روروکر وہ اپنی حالت ابتر کر چکا تھا۔ نہ کچھ کھا رہا تھا، نہ کچھ پی رہا تھا۔ ہر کام سکون اور تسلی سے کرنے والا بچہ یکایک ہذیانی ہو گیا تھا۔ دروازہ بند کیے اسے سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کرتے مدحت خود بھی رونے بیٹھ گئی۔

وہ اپنے بابا کا بیٹا تھا۔ اور بابا اسے کسی "ملازم" کا بیٹا کہہ کر گئے تھے۔ یہ بات اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ اسے اس عمر میں سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ وہ "ہارون" سے "وجدان" کر دیا گیا تھا اس حقیقت کا ادراک بھی اس کی مزاحمت توڑنے کے لیے ناکافی تھا۔

اس دن وہ جمیلہ داؤد کی وجہ سے کچھ حد تک سنبھل گیا تھا مگر اس نے ہارون تک پہنچنے کی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ ہر بار مدحت اور آغا علی اس کے سامنے آجاتے تھے۔ ہر بار کوئی نہ کوئی اس کی دیوار بن جایا کرتا تھا۔

وہ کچھ بڑا ہوا تو پابندیوں کے ساتھ تلخ حقیقتوں کا ادراک اسے بہت اچھے سے ہونے لگا۔ رویے بہتر انداز میں سمجھ میں آئے تو وہ جان گیا مدحت اور آغا علی کبھی بھی اس کی دیوار نہیں تھے۔ دیوار تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ فقط ایک دروازہ تھا۔ اور یہ دروازہ اس کا باپ اپنی مرضی و منشا سے اس پر بند کر چکا تھا۔

☆☆☆

مدحت کی بہن جانے کہاں سے بلی لائی تھی اور چونکہ اس کی فارس کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی تو وہ بانہوں میں بھرے تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پاس آگئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں ہی بلی کے ساتھ کھیلتے رہے تھے۔ اس کے بعد جب وہ کمرے میں واپس آیا تھا تو اس کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی تھی۔ نم آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ناک بہنے لگی، چھینکیں، کھانسی کے ساتھ ساتھ اس کا سانس بھی بھاری ہونے لگا۔ اس کے بازو سینے اور گردن کے پچھلے حصے پر سرخ ریشز بھی ابھر آئے تھے۔ مدحت نے دیکھا تو بری طرح سے گھبرا گئی۔ جمیلہ اس روز گھر پر موجود تھی، اسے ہاسپٹل بھی وہی لے کر گئی تھی۔

"ہی از الرجک ٹو کیٹس۔" ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد آگاہی دی تھی۔

اگلے کئی لمحوں تک وہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کی کنڈیشن ڈسکس کرتی رہی تھی اور وہ کچھ احتیاطی تدابیر سے متعلق جانکاری دیتے رہے۔

شام کے سات بجے جب وہ گھر آئی تو اسے سسر کی آمد کی اطلاع پہنچا دی گئی۔ مدحت، فارس کو ساتھ لیے سرونٹ کوارٹر چلی گئی تھی اور اس نے لاؤنج کا رخ کیا تھا۔ وہ خود کو سوال جواب کے لیے تیار کر کے ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے یاد نہیں پڑتا، میں نے فارس کی ذمہ داری تمہیں سونپی ہو۔" وہ فارس کے معاملات میں جمیلہ کی جابجا مداخلت سے تنگ آچکے تھے۔

"اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، ایمرجنسی میں لے جانا پڑا۔"

"یہ کام مدحت اور آغا علی بھی کر سکتے تھے۔"

"میں فارغ تھی، سوچا میں ہی کر دوں۔ ویسے آپ پوچھیں گے نہیں اس کی طبیعت کیوں خراب ہوئی؟"

"آئم ناٹ انٹرسٹڈ۔"

"یو شڈ بی انٹرسٹڈ! اسے بھی آپ کی طرح بلیوں سے الرجی ہے۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ مڑ گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ بھی اعظم شیرازی کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

وہ باغ میں مصنوعی آبشار کا نظارا کر کے عقبی دروازے سے شیرازی مینشن کے احاطے میں داخل ہوا تھا تو نگاہ گھوڑے پر سواری کرتے حماد شیرازی پر ٹھہر گئی۔ برجیز میں ملبوس وہ اپنے انسٹرکٹر کے ہمراہ تھا۔

حماد شیرازی۔ اس کا بڑا بھائی...... ایک خاندانی، عزت دار خاندان سے تعلق رکھنے والی عورت کا بیٹا...... جمیلہ کا بیٹا!

اپنے ننھیال کی بدولت، ماں کے مضبوط بیک گراؤنڈ اور دونوں خاندانوں کے بیچ ہونے والی بزنس

ڈیلز کی وجہ سے وہ ایک ”ٹرافی چائلڈ“ تھا......

پُرکشش، ذہین اور پھر اس گھر میں وہ اپنے دادا کا لاڈلا تھا...... ماں کا چہیتا......اور باپ کے لیے تو وہ ویسے بھی اہم تھا......

فارس کی زندگی اسکول سے فقط اس کمرے تک ہی محدود تھی اور حماد تو اس عمر میں دنیا گھوم رہا تھا......وہ اپنے باپ کے سائے میں پل بڑھ رہا تھا.. نہ اس نے کوئی محرومی دیکھی تھی......نہ اپنوں کی جدائی سہی تھی...... دونوں کا تو کسی صورت کوئی موازنہ نہ تھا......

اعظم شیرازی کی صحبت کا اثر تھا کہ حماد نے ان کے جیسی شخصیت اور مغرورانہ انداز اپنا رکھا تھا۔ گھر بھر کا لاڈلا تھا تو انداز اور طور طریقے بھی ایسے ہی تھے جیسے وہ کسی مملکت کا شہزادہ ہو۔ آج اس کا برتھ ڈے تھا اور اسی مناسبت سے شیرازی مینشن کو ڈیکوریٹ کیا جا رہا تھا۔ اس کی ہر خوشی اور کامیابی کو ہمیشہ ایسے ہی شاندار انداز میں سیلبریٹ کیا جاتا تھا۔

اس نے اپنے باپ کو دیکھا۔ ہارون شیرازی جینز پر وائٹ شرٹ میں ملبوس۔ آنکھوں سے گلاسز اتار کر جیب میں اٹکاتے ہوئے ایونٹ پلانر سے بات کر رہا تھا۔

اس نے بس ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا پھر رخ بدل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ سماعت سے ہارون شیرازی اور حماد کی آواز ٹکرانے لگی۔ زندگی سے بھرپور قہقہے تھے۔ خوشیاں تھیں۔ اور مسرت کے رنگ جوان کی آنکھوں سے جھلکتے تھے۔

اسے شیرازی مینشن میں رہتے ہوئے ڈیڑھ سال ہونے کو تھا مگر وہ ابھی تک ان رویوں کا عادی نہیں ہو پایا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی بری طرح سے ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

کھڑکیاں دروازے بند کر کے وہ اپنے بیڈ میں گھس کر کہانیوں کی کتاب پڑھنے لگا۔ پھر اس نے ڈرائنگ بک نکال لی۔ کچھ دیر تک رنگ بھرتا رہا۔ پھر اس نے اسٹیکرز اٹھا لیے اور اپنی نوٹ بک پر جگہ جگہ لگانے لگا۔ اس سے بھی اکتا کر اس نے نوٹ بک کے تمام صفحے پھاڑ ڈالے۔ انہیں نوچ کھسوٹ کر۔ پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں پھینکا اور ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

سفید اور نیوی بلیو رنگ کی تھیم میں اسٹیج ڈیکوریٹ کیا جا چکا تھا۔ کرسیاں اور گول میزیں اب ترتیب سے رکھی جا رہی تھیں۔

یکایک ہی اسے نیلا رنگ بہت برا لگا۔ سفید رنگ سے اسے یک دم نفرت ہوئی۔

اور تب ہی اس کی نظر جمیلہ داؤد پر پڑی۔ وہ انتظامات کا از سر نو جائزہ لے رہی تھی۔ مصروفیت کی بنا پر آج وہ اس سے ملنے نہیں آ سکی تھی۔ اور چونکہ آج چھٹی کا دن تھا تو معمول کے مطابق پچھلے چار گھنٹوں سے اس کا ہی انتظار کر رہا تھا۔

جمیلہ آج نہیں آئے گی۔ وہ جانتا تھا۔ وہ شیرازی ہاؤس میں منعقد کیے جانے والی ہر تقریب میں ایسے ہی نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ باقی سب نظر انداز کر دیں۔ وہ قبول کر لیتا تھا۔ جمیلہ سے وہ نظر انداز ہو جائے تو اس کی جان پر بن جاتی تھی۔

اور چونکہ شیرازی مینشن میں خاندان بھر کے لوگ اکٹھے ہوتے تھے اس لیے ہر فنکشن، گیدرنگ اور تقریب پر فارس کے لیے ایک ہی اصول ہوتا تھا۔ شام کے پانچ بجے کے بعد اسے کسی طور بھی اپنے کمرے سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اور مدحت اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ وہ جلدی سو جائے۔ مگر کیا اسے نیند آ جایا کرتی تھی؟ شاید نہیں، یقیناً نہیں۔

آج بھی ایک پابندی عائد ہو گی۔ آج کی تقریب بھی اس کے لیے ایک سزا کی طرح ہو گی۔

اور پھر جیسے ذہن میں کوئی خیال ابھرا اور وہ بیگ میں ضرورت کی چند اشیاء۔ اسٹوری بکس، ڈرائنگ پیپرز، کلرز اور چاکلیٹ وغیرہ رکھ کر باہر نکل گیا۔

جانے سے پہلے وہ مدحت کے لیے پیغام چھوڑ کر گیا تھا کہ وہ کل تک گھر واپس آ جائے گا۔ لیکن وہ جا کہاں رہا ہے یہ اس نے نہیں بتایا۔

شیرازی مینشن کے عقبی دروازے سے باہر نکل کر باغ میں چلتے ہوئے اس نے صدق دل سے دعا کی کہ آج بارش ہو جائے۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ اسٹیج اڑ جائے۔ کرسیاں میزیں ٹوٹ جائیں۔ سفید رنگ ملگجا سا ہو اور آسمانی رنگ پردے پھٹ جائیں۔

وہ اب ڈاکٹر مصطفیٰ کی طرف جا رہا تھا۔ مین روڈ پر دو منزلہ مکان سے منسلک ان کا ذاتی کلینک تھا۔ جس کی مخالف سمت روڈ کی دوسری طرف وسیع وعریض رقبے پر پھیلا سبزہ زار، کھیت کھلیان اور باغات تھے۔ شیرازی مینشن ان باغات کے عقب میں بلندی پر واقع تھا۔ فارس باغ کے راستے اکثر اوقات ان کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ کبھی وہ اسے کلینک کے اندر اپنے آفس میں بٹھا کر فارغ اوقات میں باتیں کرتے رہتے اور کبھی اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔

اس دن ان کا آف تھا۔ وہ اسے گھر میں ہی ملے تھے۔ اور کچھ حیران ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔

بھنویں سکڑی ہوئیں، تیور بگڑے ہوئے۔ اور چہرے پر سرخی سی پھیلی تھی جیسے وہ خود پر ضبط کیے ہوئے ہو۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے اپنے ننھے مہمان کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ اور اس سے قبل کہ وہ خود سے کچھ دریافت کرتے اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کین آئی اسٹے ہیئر ٹو نائٹ؟" (کیا میں آج رات آپ کے پاس رک سکتا ہوں؟)

ڈاکٹر مصطفیٰ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ پھر اپنے بھورے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ کیا تمہاری کیئر ٹیکر جانتی ہیں کہ آج تم یہاں رہو گے۔" ایک لمحے کے لیے اس نے ڈاکٹر مصطفیٰ کو دیکھا۔ اس کے حلق میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ مسکرا دیے۔ اس کے نرم ملائم بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ کر کچن میں چلے گئے۔ وہ بھی اپنا بیگ اتار کر ان کے پاس آ گیا۔

اپنے ساڑھے سات سالہ ننھے مہمان کی خاطر مدارت کرتے ہوئے وہ آج کچھ زیادہ ہی پرجوش اور خوش دکھائی دیے۔

"میری سب سے بڑی بیٹی کے یہاں کل پورے پندرہ برس بعد بیٹا ہوا ہے۔"

پلیٹ سے رول اٹھاتے ہوئے فارس نے انہیں دیکھا۔

"اصل میں وہ ٹوئنز ہیں۔ ایک بیٹی ہے۔ اور ایک بیٹا!" وہ مسکراتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے تھے۔ "بہت بہادر ہے میری نواسی۔ بھائی کو ساتھ ہی لائی ہے۔" جانے کیا سوچ کر وہ مسکرائے۔ پھر انہوں نے تصویر نکال کر اسے دکھائی۔

"اس میں لڑکی کون ہے اور لڑکا کون ہے؟" ایک جیسے بچوں نے فارس کو الجھا دیا۔ دونوں کے کپڑے بھی ایک ہی جیسے سفید رنگ کے تھے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے تصویر پکڑ کر دیکھی۔ پھر دوبارہ دیکھی۔ "اللہ جانے!" بڑبڑا کر اٹھ گئے۔

اب وہ اس کے لیے فروٹ ٹرائفل بنا رہے تھے۔

فارس نے تصویر اٹھا لی۔ ننھے منے سے بچے گہری نیند میں تھے۔ وہ کافی دیر تک دلچسپی سے انہیں دیکھتا رہا۔ غالباً اتنے چھوٹے بچوں کو دیکھنے کا اتفاق اسے پہلی بار ہوا تھا۔

"اپنی ساری نواسیوں کے نام میں نے ہی رکھے ہیں۔ اب میری بڑی نواسہ حفصہ چاہ رہی ہے کہ اس کا نام بھی میں ہی رکھوں۔" انہوں نے ایک لمحے کے لیے رک کر کچن کی کھڑکی سے باہر لان کی کیاریوں میں پھولوں کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچا۔ "وردہ کیسا رہے گا!؟" اب وہ اپنے مہمان سے پوچھ رہے تھے جو پلیٹ سے دوسرا رول اٹھا رہا تھا۔

"وردہ۔ یعنی پھول۔ بہار کے موسم میں آئی ہے وہ۔ ہے بھی پھولوں جیسی۔" ایک بار پھر تصویر پکڑ کر وہ اپنی نواسی کو کھوجنے لگے۔ "یا پھر کوئی اور نام......"

"میں بتاؤں؟" اپنا رول کھاتے ہوئے فارس نے کہا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اس کے "بیسٹ فرینڈ" تھے۔ ان کی مشکل آسان کرنا اس کا فرض تھا۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ وہ خوش ہوئے۔
”آپ جنت رکھ دیں۔“
ڈاکٹر مصطفیٰ نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”جنت؟“
”مس ہادیہ نے اپنی بیٹی کا نام جنت رکھا ہے۔ پیارا نام ہے نا؟“ وہ کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اس پر نگاہ جمائے بیٹھے رہ گئے تھے۔ ان کی توجہ کسی ایک پھول پر تھی۔ مگر فارس انہیں لاعلمی میں کتنی بڑی تصویر دکھا گیا تھا۔

وردہ۔ ایک پھول...... اور جنت میں تو جیسے ہر طرح کے پھول سما جاتے ہیں۔ انہوں نے سوچا۔
”واقعی بہت پیارا نام ہے، بس آج سے میری نواسی کا نام جنت ہے۔“ وہ فارس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔
اس نے فروٹ ٹرائفل کھایا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کے ساتھ سبز چائے بھی پی۔ لان کے پھولوں کو پانی بھی دیا۔ آسٹریلین طوطوں کو چوری بھی کھلائی۔ ڈرائنگ بک میں رنگ بھی بھرے اور بارش کی دعا بھی کی۔
اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد سہ پہر کے غروب ہوتے سورج پر کالی گھٹا چھا گئی۔ ہوائیں تیز ہوئیں تو دور سے مٹی اور دھول اٹھتی ہوئی نظر آئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف دھند چھا گئی۔ بارش کا پہلا قطرہ اس کے گال پر ہی گرا تھا۔ اس نے خوش گوار حیرت سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ پھر ہاتھ پھیلائے سیڑھیاں اتر کر لان میں آ گیا۔
بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ آسمان پر کہیں بجلی چمکی تھی۔ وہ رات کی بارشوں سے جتنا خائف ہوتا تھا، دن کی بارشیں اسے اتنا ہی محظوظ کرتی تھیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ بھی اس کے ساتھ ہی رم جھم بارش انجوائے کرتے رہے اور جیسے ہی بارش نے زور پکڑا، وہ اسے ساتھ لیے اندر آ گئے۔
کافی عرصے بعد انہوں نے فارس کو بے انتہا خوش دیکھا۔ جو تصور ہی تصور میں نیلی سفید قمیص سے بچی کرسیوں کو فضا میں ٹوٹتا بکھرتا دیکھ رہا تھا۔
”میں نے اللہ سے دعا کی تھی بارش ہو جائے۔“
اس نے اشتیاق کے عالم میں ڈاکٹر مصطفیٰ کو بتایا تھا۔
”میں نے اللہ سے کہا بہت زور کی آندھی آئے۔“
اس نے ہاتھ بھی پھیلائے۔ اچھل کر بھی دکھایا۔ پیشانی پر بکھرے بال آنکھوں پر گرے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی خوشی دیکھی۔ وہ مسکرائے۔
”تاکہ حماد کے بھی سارے کھلونے ٹوٹ جائیں، اس کی پارٹی بھی خراب ہو جائے۔“
ڈاکٹر مصطفیٰ کی مسکراہٹ یک لخت تھم گئی۔ انہیں سکتہ ہوا۔ وہ تعجب سے فارس وجدان کو دیکھ کر رہ گئے۔
حماد شیرازی۔ بزنس ٹائیکون اعظم شیرازی کا پوتا!
”اچھے بچے کسی کا برا نہیں چاہتے۔“ انہوں نے ٹوکا۔
”میں اچھا ہوں ہی نہیں۔“ فارس نے بڑے آرام سے اعتراف کر لیا۔
وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔
”میں نے برا نہیں چاہا۔ میں نے بس یہ کہا کہ بارش ہو جائے اور آندھی بھی آئے۔“ اب کے اس نے ذرا سی خفگی کے ساتھ انہیں وضاحت دی تھی۔
ڈاکٹر مصطفیٰ اپنی مسکراہٹ ضبط کر گئے۔
”تم حماد کو ناپسند کرتے ہو؟“ کچھ سوچ کر انہوں نے پوچھا۔
”وہ مجھے ناپسند کرتا ہے۔“
”تمہیں ایسا کیوں لگا؟“
”جب بھی اس کی ممی میرے پاس آتی ہیں تو اسے برا لگتا ہے، جب بھی وہ میرے لیے کچھ لیتی ہیں تو وہ مائنڈ کرتا ہے۔“
ڈاکٹر مصطفیٰ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گئے۔
وہ براہ راست اب فارس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔
”کچھ دن پہلے وہ میرے کمرے میں آیا تھا اور اس نے میری وہ ساری کاریں توڑ دیں جو بالکل اس کے جیسی تھیں۔ اسے اچھا نہیں لگتا نا کہ اس کی جیسی چیز کسی اور کے پاس ہو۔“ سر جھکائے اب وہ شرٹ کے کناروں کو چھیڑ رہا تھا۔ ”مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ میرا سب کچھ کسی اور کے پاس ہو۔ مگر میں تو کچھ نہیں کہتا۔“
ڈاکٹر مصطفیٰ جیسے اپنی جگہ منجمد ہوئے تھے۔

”یہ تو حیرت کی بات! حماد بابو اس طرح کسی ملازم کے بیٹے کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔“ کام والی ماسی وہاں سے گزر رہی تھی، سنتے ہی بول پڑی۔

”میں ملازم کا بیٹا نہیں ہوں۔“ پوری قوت سے وہ اس عورت پر چیخ پڑا تھا۔ جہاں کام والی ماسی سکتے میں آئی تھی تو وہاں ڈاکٹر مصطفیٰ بھی اس کے رویے سے صدمے میں چلے گئے تھے۔

آنکھوں میں، غصہ، نمی، بے بسی لیے وہ اس طوفانی موسم میں گھر چھوڑ کر جانے لگا۔ یہ تو ڈاکٹر مصطفیٰ ہی اسے زبردستی پکڑ کر واپس لائے۔ کام والی ماسی سے معذرت بھی کروائی اور اسے کھانے کے لیے بھی رضامند کیا۔

اور اس کے بعد وہ ایک بار پھر اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ شیرازی خاندان کے فیملی ڈاکٹر تھے اور آج سے قبل انہوں نے کبھی بھی ان کے خاندانی معاملات کی جانچ پڑتال نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ ایسا کرنا پسند کرتے تھے۔ مگر آج نہ جانے کیوں وہ فارس وجدان کے بارے میں اچنبھے کا شکار ہوئے تھے۔

ڈیڑھ سال پہلے یہ بچہ اچانک سامنے آیا تھا۔ وہ اسے کئی بار اٹینڈ کر چکے تھے۔ کئی بار وہ ان کے کلینک میں ایڈمٹ ہو چکا تھا۔ جمیلہ داؤد اس بچے کا بہت خیال رکھتی تھی وہ یہ بھی جانتے تھے۔ شیرازی مینشن میں ایک بار فارس کی بابت دریافت کرنے پر اعظم شیرازی نے اس کا تعارف اپنے ملازم کے یتیم بیٹے کے طور پر کروایا تھا مگر اب۔

”تم کس کے بیٹے ہو؟“ وہ اب پوچھ رہے تھے۔

”کسی کا بھی نہیں۔“ وہ ہنوز ناراض تھا۔

”ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کسی کے بھی بیٹے نہ ہوں۔“

”ایسا ہی ہے کہ میں کسی کا بھی بیٹا نہیں ہوں۔“

ڈاکٹر مصطفیٰ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ پھر جیسے انہیں مذاق سوجھا۔ ”یعنی تم سیدھا آسمان سے گرے تھے، درخت پر اگے تھے؟“

اس نے بھنویں سکیڑ کر انہیں گھورا۔ وہ مذاق کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

اور تب کسی خیال کے تحت ڈاکٹر مصطفیٰ کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

”کیا تم واقعی گھر میں سب کو بتا کر آئے ہو؟“

”مجھے نیند آرہی ہے، میں سونا چاہتا ہوں۔“ وہ سر جھکائے اپنے بیگ کی زپ بند کرنے لگا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے اس کا بیگ گود سے ہٹا کر نیچے رکھا۔ ”جواب دو فارس!“

اس نے جواب نہیں دیا۔ لب بھینچے انہیں دیکھتا رہا۔ بادل گرجے۔ بجلی کڑکی۔ پل بھر کے لیے براق روشنی نے کھڑکیوں سے جھانک کر اسے ڈرایا مگر فارس نے جواب نہیں دیا۔

اور ڈاکٹر مصطفیٰ کو جیسے ان کے ہر سوال کا جواب مل گیا۔

”اس موسم میں تم گھر سے باہر ہو، بخدا اس وقت ان سب پر کیا بیت رہی ہوگی۔“

مگر فارس بتا نہیں سکا کہ اس وقت ان سب پر کچھ بھی نہیں بیت رہی ہوگی۔ کیونکہ وہ سب تو اس وقت گھر کے اندر اپنی خوشی منا رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ تیزی سے اٹھ کر فون کی طرف لپکے تھے۔ مگر موسم خرابی کی وجہ سے سگنلز کا مسئلہ تھا۔ کال نہ ہو سکی۔ ریسیور ہاتھ میں لیے انہوں نے خفگی سے فارس کو دیکھا۔

”میں آج گھر نہیں جانا چاہتا۔“ اس کی آواز آنسوؤں سے رندھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ گہرا نفس لے کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ رات جو اس کے لیے آسان سی تھی۔ وہ جمیلہ داؤد کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ اعظم شیرازی کے گارڈ اس خطرناک موسم میں اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈ رہے تھے۔

حماد کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ پہلے بارش اور آندھی نے اس کا موڈ خراب کیا تھا اور اب کسی ملازم کے بیٹے کے لیے اس کے ماں باپ کی فکرمندی نے اسے شدید غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیک کاٹا جا چکا تھا۔ کفلس لیے جا چکے تھے۔ مہمان اس وقت ڈائننگ ہال میں کھانا کھا

رہے تھے اور اس کی ماں متفکر سی لاؤنج میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اور اس کے پاپا تو اسی وقت گھر سے نکل گئے تھے جب انہیں فارس کی عدم موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ جبکہ اعظم شیرازی نے اس خبر کا کچھ خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ مہمانوں کو چھوڑ کر بھی نہیں اٹھے تھے۔

اگلے دن صبح سویرے ہی ڈاکٹر مصطفیٰ نے فون پر فارس کی اطلاع پہنچائی تھی۔ اور جمیلہ اسی وقت ڈرائیور کے ساتھ ان کے گھر آگئی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو فارس سامنے ہی اپنے بیگ میں کتاب رکھتا دکھائی دیا۔ آہٹ پر رک کر اس نے جمیلہ کو دیکھا اور پھر اپنی جگہ رک سا گیا۔

جمیلہ کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ زرد تھا۔ فکر، خوف اور پریشانی انگ انگ سے عیاں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ نے دیکھا۔ وہ خوف اور پریشانی ایسی ہی تھی جیسے کسی سگی ماں کی اپنے بچے کے لیے ہوتی ہے۔

اس نے فارس کو بازو سے پکڑ کر پہلے تو خوب ڈانٹا۔ پھر رونے لگی۔ اور روتے ہوئے اسے بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

"کیوں کیا اس طرح؟ تمہیں معلوم تھا، میں پریشان ہو جاؤں گی پھر بھی؟"

"آئم سوری۔" اس نے لبوں کو جنبش دی۔ وہ بمشکل اپنے رونے پر قابو پائے ہوئے تھا۔

"وعدہ کرو، تم آئندہ کبھی بھی اس طرح نہیں کرو گے۔" چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا۔ "بتائے بغیر کہیں نہیں جاؤ گے، کبھی گھر نہیں چھوڑو گے۔"

"وعدہ۔" وہ کہہ رہا تھا۔ اس نے جمیلہ کو پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ وہ اس کی وجہ سے روئی تھی اس خیال سے اسے دکھ پہنچا تھا۔

"آپ بھی نہیں جائیں گی؟" اس عرصے میں پہلی بار وہ اپنا کوئی خدشہ لبوں پر لایا تھا۔

"ہاں، میں بھی نہیں جاؤں گی۔" جمیلہ نے یقین دہانی کرائی تھی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اپنی جگہ خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

"میں اپنے شوہر اور سسر کی طرح بے رخی نہیں دکھا پائی، میرے دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔" وہ چائے کے لیے ان کے پاس رک گئی تھی۔ اور ساری بات بتانے کے بعد سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

"محبت بھی رزق کی طرح ہوتی ہے، جس کی جو جگہ۔ جس دل میں لکھی ہو بل کر رہتی ہے۔ یہ اس بچے کا رزق ہے جمیلہ! وہ تم سے وہی حصہ لے رہا ہے جو اس کے لیے آسمان پر طے کر دیا گیا تھا۔" وہ کہہ رہے تھے۔ وہ نم آنکھوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جو وعدہ اس نے کیا تھا وہ اس وعدے پر قائم رہا تھا۔ مگر جو وعدہ جمیلہ کا تھا وہ اسے ایفا نہ کر سکی تھی۔

ٹھیک تین سال بعد جب حماد کا ایڈمیشن امریکا کے ایک بہترین اسکول میں ہوا تو آناً فاناً اعظم شیرازی نے جمیلہ کو امریکا شفٹ ہو جانے کا عندیہ دے دیا۔

ہارون پہلے سے وہاں موجود تھا۔ شیرازی انٹرپرائزز کی امریکا کی فرم کو آج کل وہ ہی سنبھال رہا تھا۔

گیارہ سال کی عمر میں وہ خبر فارس کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ جمیلہ کے بغیر اس کی زندگی کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے "ماں" تھی۔ اور وہ اس ماں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

جمیلہ کے لیے بھی یہ سب مشکل تھا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ حماد کے لیے اس کا امریکا میں ہونا بے حد ضروری تھا۔

"میں جلد واپس آجاؤں گی۔"

جانے سے قبل وہ اس سے ملنے آئی تھی تو اس نے کہا تھا۔ اور وہ چپ چاپ کھڑا رہا تھا۔

جمیلہ نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا، اس کا گال چوما تھا۔ اسے گلے سے لگا کر اسے بہت پیار کیا تھا۔ اور وہ خاموشی سے یوں کھڑا رہا تھا جیسے وہ چند دنوں کے لیے دوسرے شہر تک ہی جا رہی ہو۔ اور اس کے جانے سے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑ رہا ہو۔

اس کا رویہ جہاں مدحت کو پریشانی میں مبتلا کر

گیا تھا وہاں جمیلہ داؤد کے اندر بہت سے اندیشے جگا رہا تھا۔ وہ نارمل حالات میں پلا بڑھا بچہ نہیں تھا کہ کسی بھی سچویشن کو نارمل انداز میں ہینڈل کر سکتا۔ ہر چوٹ اس کے لیے گہری۔۔۔ ہر غم اس کے لیے بڑا۔ اور ہر جدائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

جمیلہ اس قدر محنت سے اسے اس مقام تک لائی تھی اور اب جب بکھرتا دیکھا تو دل کرچی کرچی ہو گیا۔ سارا راستہ وہ بھی روتی رہی تھی اور باغ میں درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر فارس وجدان بھی۔

اس دن وہ مدحت کو بہت دیر تک ڈھونڈنے کے بعد باغ میں ملا تھا۔ اور کسی بھی صورت گھر واپس جانے کو رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سدا کا ضدی ہمیشہ جمیلہ کے ہی قابو میں آیا کرتا تھا۔ مگر اس دن جمیلہ نہیں تھی تو ڈاکٹر مصطفیٰ ہی اس کے پاس آئے تھے۔

وہ ایک گھنے پیڑ کے نیچے دنیا جہاں سے رخ موڑے پنجوں کے بل بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں چاقو تھا۔ درخت کے تنے پر کئی لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ کئی سوراخ کھودے گئے تھے۔

''تم جانتے ہو، وہ تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔''
انہوں نے قریب پہنچ کر کہا تھا۔ ''اور یہ بھی جانتے ہو کہ وہ اپنی مرضی سے تمہیں چھوڑ کر نہیں گئی ہیں۔''

فارس کا سر ہنوز جھکا رہا تھا۔ وہ درخت کے تنے پر اسی دکھی چاقو سے کھرچتا رہا تھا۔ گھٹنوں پر، جوتوں پر جگہ جگہ مٹی لگی تھی۔

انہوں نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے پکڑا تو وہ رک گیا۔ رخ موڑا تو وہ اپنا سر مزید جھکا گیا۔ مگر وہ دیکھ چکے تھے۔ وہ آنسوؤں سے بھری ہوئی اس کی سرخ و متورم آنکھیں دیکھ چکے تھے۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ اس کے ساکت لبوں پر شکوے دھرے تھے۔ اس کی خاموشی چیخ چیخ کر ایک اور ظلم پر احتجاج کر رہی تھی۔ انہوں نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

انگلیوں پر جابجا چھوٹے چھوٹے کٹ لگے تھے۔ اور درخت کے تنے کا جو حشر تھا۔ وہ تو ان کے سامنے ہی تھا۔

''ایسے ہتھیار کو کسی صورت ہاتھوں میں نہیں لینا چاہیے جو خود آپ کو بھی زخمی کر دے۔''

انہوں نے چاقو لے لیا۔ اسے برابر میں اپنے گھٹنے پر بٹھا لیا۔

مدحت قدرے فاصلے پر بلندی سے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے ہاتھ ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کر دیا تو وہ ان کی موجودگی سے کچھ مطمئن ہو کر چلی گئی۔

''اس سے درخت نہیں کٹ سکتا۔''
''میں درخت کاٹ نہیں رہا تھا۔''
''تو کیا کر رہے تھے؟''

وہ چپ رہا۔ نظریں جھکی رہیں۔ آنسوؤں کی لکیریں پھر سے نمایاں ہوئیں۔ مگر اس کا ضبط کمال کا تھا۔ وہ رو رہا تھا مگر ظاہر کرنا چاہتا تھا، وہ نہیں رو رہا۔ اسے جمیلہ داؤد کے جانے کا کوئی غم نہیں۔ اسے سرے سے کوئی فکر۔ کوئی پرواہ ہی نہیں۔ مگر اس کا چہرہ۔ اس کے تاثرات۔ اس کی آنکھیں۔

بھلا وہ غم بھی چھپائے جا سکتے ہیں جو آنکھوں میں بس جاتے ہوں؟

''تم تو اتنے پیارے۔ اتنی ہمت والے۔ اتنے صبر والے بچے ہو۔''

انہوں نے اسے بانہوں میں بھر کر خود سے لگا لیا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا وہ بہت برا ہے۔ تب ہی تو اس کے ساتھ ''اتنا'' برا ہو رہا ہے۔ مگر وہ کہہ نہ سکا۔ ضبط ٹوٹا تو سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔ وہ ان کے کندھے سے لگ کر رویا تو پھر چپ نہ ہوا۔ کتنی ہی دیر تک وہ اسی گھنے سایہ دار شجر کے نیچے بیٹھے اس کی پشت سہلاتے رہے۔ اسے تسلی اور دلاسے دیتے رہے۔ اسے یقین دہانی کرواتے رہے کہ وہ اسے ''چھوڑ'' کر نہیں گئی ہیں۔ وہ جلد آجائیں گی۔

مگر فارس وجدان کو لگتا تھا۔ اس کے پاپا، اس کی مما کی طرح جمیلہ داؤد بھی کبھی واپس نہیں آئیں گی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تنزیلہ ریاض

نورالقلوب ایک ایسا ادارہ جہاں صندل بی لوگوں کے لیے دعا کرتی تھیں، لوگ اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتے تھے۔ وہ انتہائی خوب صورت خاتون تھیں۔

بٹ گرام میں بنی ہری حویلی میں وہ اپنے باپ اور گلے جو اس کی سوتیلی ماں تھی سے ملنے چھٹیوں میں آتا ہے۔ گلے اس کی خالہ تھی جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد انتہائی کم عمری میں اس کے باپ سے بیاہی گئی تھی۔

خوشل اپنے باپ کی نسبت گلے سے زیادہ قریب تھا۔

داؤد بروکن فیملی کا بچہ تھا جو انتہائی موٹا تھا اس کے وزن کی وجہ سے سب اسے تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے اپنا ٹرانسفر دبئی کروالیا تھا وہ بینک میں ملازمت کرتی تھیں۔

گلے کی اداسی دیکھ کر اسے لگا اس کا باپ شادی کر رہا ہے۔ وہ ان سے سخت ناراض تھا۔

اس کا دوست اسے بتاتا ہے کہ لاریب نے خودکشی کرلی ہے۔ وہ حیران ہو جاتا ہے۔

آدھی رات کو ہری حویلی میں کھٹر پٹر سن کر وہ باہر نکلتا ہے تو اپنے باپ کے ساتھ لاریب کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

خوشل لاریب کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ارباب کو فون کرتا ہے لیکن وہ ریسیو نہیں کرتا۔

رفیق کے صاحب اس سے کہتے ہیں کہ لاریب کی تمام تصاویر ان کے گھر سے ہٹادی جائیں ان کے گھر میں لاریب کا چیپٹر بند ہو جاتا ہے۔
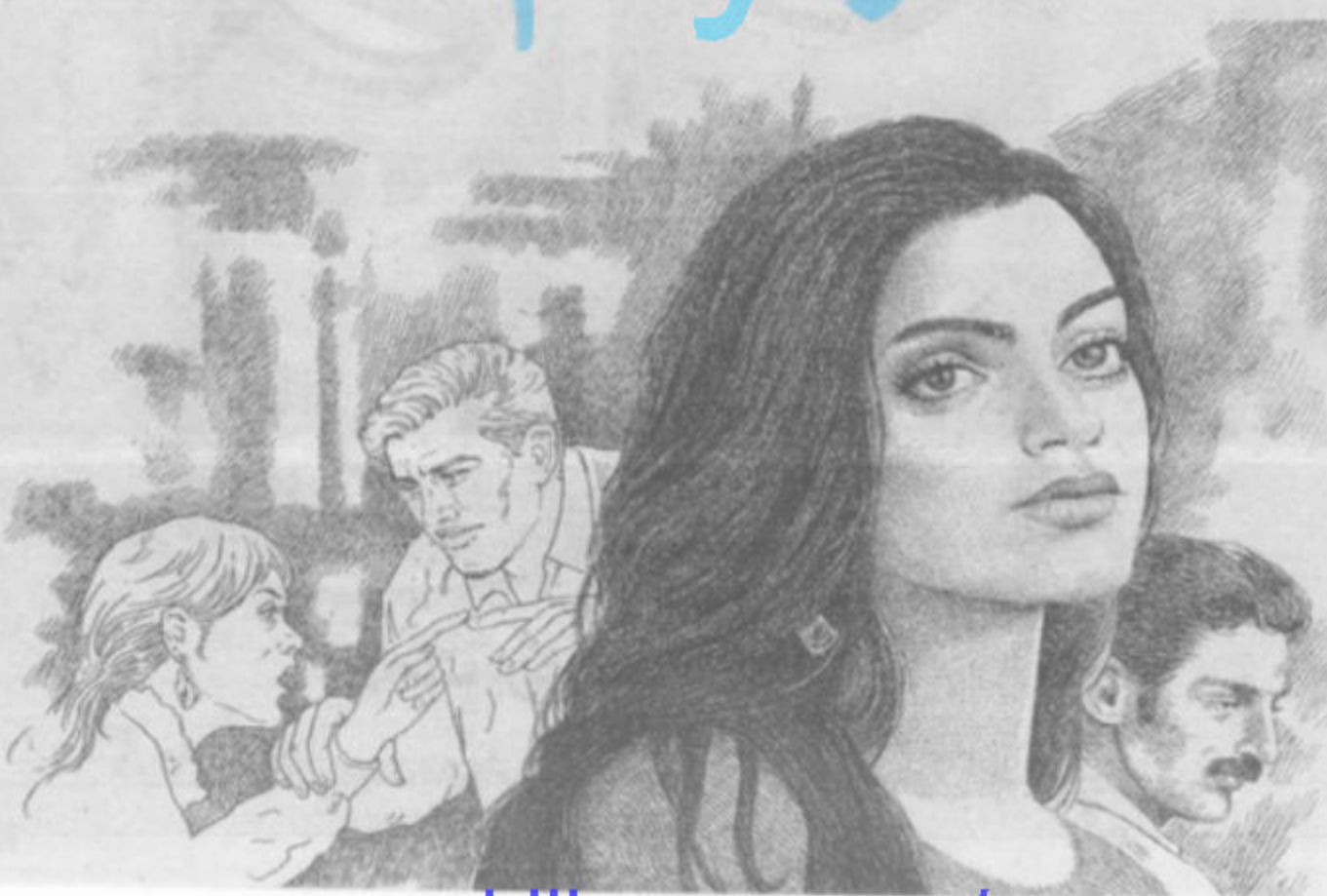
مہر افروز ان کے گروپ میں شامل ہوجاتی ہے داؤد کو لگتا ہے کہ وہ ان کے گروپ کی لڑکیوں میں سب سے خوب صورت ہے۔ فرمان کی اس سے نہیں بنتی۔

خوشل گلے سے کہتا ہے کہ لاریب کو فوراً واپس بھیجو، اسے لگتا ہے کہ وہ اسی چوٹی پر بیٹھا ہے جہاں سے لاریب نے اسے دھکا دیا تھا۔

خان بابا خوشل خان کو بتاتے ہیں کہ اس کا نکاح لاریب سے ہورہا ہے۔

خوشل کو یاد آتا ہے کہ لاریب ڈر گزلیتی ہے، وہ غصے میں جب لاریب کے پاس آتا ہے تو منہ دکھائی میں سگریٹ دیتا ہے جسے دیکھ کر لاریب کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔

خوشل ہاسپٹل پہنچا تو ارباب اس کا رویہ دیکھ کر اسے تنگ کرتا ہے۔ آخر میں کہتا ہے کہ جب تک خوشل اسے بتائے گا نہیں اسے کیسے پتا چلے گا۔ خوشل رونے لگتا ہے اور پھر لاریب سے نکاح کا بتاتا ہے۔

مہر افروز، داؤد پر حاوی ہوجاتی ہے۔ داؤد کی ممی اس سے چڑنے لگتی ہے۔ وہ اس کے کہنے پر لندن چلا جاتا ہے۔ ممی اسے جرمنی بھیجنا چاہتی ہیں۔

مہر اس سلسلے میں داؤد کو مطمئن کردیتی ہے اور اس کی ممی کو بھی قائل کرلیتی ہے۔

ناشتے پر گلے احتجاجاً نہیں آتی ہیں۔ خان بابا بیوی کا مزاج سمجھتے ہیں، وہ اسے مناتے ہیں۔

زہرہ کو ہری حویلی والوں میں دلچسپی ہے۔ تائی شاہدہ اسے سمجھاتی ہیں۔

خان بابا لاریب کے خاندان سے اپنے تعلق کے بارے میں گلے کو بتاتے ہیں کہ کسی طرح خان بابا یعنی حبیب اللہ اس گھر میں پہنچتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ آج وہ جو کچھ ہیں ان کی ہی وجہ سے ہے۔

شیریں اور داؤد کی شادی طے ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی شادی کو لے کر بہت پرجوش ہے۔ داؤد کی امی چڑتی ہیں۔ داؤد اس سے اسکائپ پر بات کررہا تھا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر جاتا ہے۔

چھٹی قسط

"خیر سے شاہی سواری چلا کون رہا تھا؟"

خلیق صاحب ایک فائل سامنے میز پر رکھ کر اس کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ ان کے انداز میں بے پروائی تھی۔ ان کا اشارہ گاڑی کے متعلق تھا لیکن ان کے چہرے سے اندازہ لگانا قطعی مشکل تھا کہ دل میں خفگی کا عالم کیا ہے۔

حبیب اللہ ہاتھ باندھے مؤدب انداز میں سر جھکائے سامنے کھڑا تھا۔ اسے کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ گاڑی کو بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن اس کے باوجود حبیب اللہ کے دل کا حال چہرے پر درج تھا جو غم سے چور چور تھا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ ساری کہانی سنا رہا تھا، اس نے بھی "مالکوں" کا ایک روپے کا بھی نقصان نہیں کیا تھا نہ کرنے کا سوچا تھا۔ اسے اس ننھے منے حادثے کا بے حد قلق تھا۔ وہ بہت شرمندگی محسوس کررہا تھا۔ اس کی وجہ سے خلیق صاحب کی گاڑی ورکشاپ میں کھڑی تھی جبکہ ان کی بیٹی شیریں صوفے کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھ کے پاس پیشانی پر بینڈ ایج لگی تھی اور ہاتھ پر بھی ڈریسنگ کی ہوئی تھی مگر وہ حبیب اللہ کی طرح پریشان بالکل بھی نہیں تھی۔ اپنی کمبی گردن کو اطمینان سے اٹھائے وہ جیسے اسی سوال کی منتظر تھی۔

"مصیبت سے بچ کر چلتے ہیں۔ لیکن جب کوشش کے باوجود وہ سامنے آکر کھڑی ــ ہوجائے تو پھر اس کا سامنا کرتے ہیں۔ لیکن سر اٹھا کر گردن اکڑا کر۔"

خلیق صاحب کے سامنے پیشی سے پہلے وہ اسے بھی یہ درس دینا نہ بھولی تھی اور اب ان کے سامنے بھی وہ

اپنے قول کی عملی تفسیر بنی بیٹھی تھی
"میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔" اس نے نہایت اطمینان سے اعتراف کیا تھا۔ خلیق صاحب نے سر ہلایا لیکن نگاہیں فائل کی جانب مبذول رکھیں۔
"اس کا مطلب آپ گاڑی چلا رہی تھیں؟" انہوں نے پھر پوچھا۔
"آف کورس نہیں۔" اس نے فوراً سے پیش ترنفی میں جواب دیا پھر ایسے جیسے ان کی لاعلمی پر تعجب ہوا ہو۔
"آپ جانتے تو ہیں، مجھے ابھی گاڑی چلانی آتی ہی نہیں ہے۔"
اس نے زور دے کر کہا تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ کے لیے اس کی جانب دیکھا۔ پہلی بار حبیب اللہ کو اندازہ ہوا کہ وہ خفا نظر آتے تھے۔
"اس کا مطلب گاڑی حبیب صاحب چلا رہے تھے؟"
شیریں کرسی پر پیچھے کی جانب ہو کر بیٹھ گئی اور ہاتھ سینے پر باندھ لیے جس کا مطلب تھا کہ یہ سوال اس سے نہیں پوچھا گیا سو اب حبیب اللہ کی باری تھی کہ وہ اپنی انکوائری کی کارروائی خود نبٹائے۔ حبیب اللہ کو لگا، وہ اس سے فیور چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی غلطی کی ذمہ داری وہ قبول کرلے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کچھ چاہتی اور حبیب اللہ وہ نہ کرتا۔ خلیق صاحب اب اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔
"جی۔" شیریں کو شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس نے مڑ کر اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔
"حبیب صاحب! آپ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے؟" دانت کچکچاتے ہوئے اس نے اس سے سوال کیا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔
"آپ کو گاڑی چلانی آتی ہے؟" حبیب اللہ مزید سٹپٹا گیا۔ خلیق صاحب اسی کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ شیریں نے سر جھٹکا اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ڈانٹ کر بولی۔
"لان میں لگی گھاس اور پنجرے میں قید پرندوں کو بھی خبر ہے کہ آپ کو ڈرائیونگ نہیں آتی۔ جھوٹ بولنے کا فائدہ۔" وہ چپ کا چپ رہ گیا۔
"آپ دونوں اپنی بحث بعد میں جاری رکھ سکتے ہیں۔ پہلے میرے سوال کا جواب دے دیں۔ گاڑی کون چلا رہا تھا؟"
اپنے سوال کو دہراتے ہوئے خلیق صاحب نے مداخلت کی تھی۔
"ہم دونوں ہی نہیں چلا رہے تھے۔" اس نے ہاتھ ایک بار پھر سینے پر باندھے اور پشت سے ٹیک لگانے کے لیے کرسی پر ذرا سا مزید پیچھے ہو گئی۔
"ہم...... اچھا۔" خلیق صاحب نے ہنکارا بھرا اور ہاتھ میں پکڑی فائل میز پر رکھ دی۔ ان کے چہرے پر برہمی کے آثار بڑھ رہے تھے۔
"آپ دونوں گاڑی میں موجود تھے۔ آپ دونوں ہی سے گاڑی لگی ہے۔ لیکن آپ دونوں ہی گاڑی نہیں چلا رہے تھے؟"
ان کے لہجے میں طنز تھا لیکن سامنے بھی شیریں موجود تھی جو مرعوب ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔
"جی۔ ہم دونوں ہی گاڑی نہیں چلا رہے تھے۔ کیونکہ ہم دونوں کو ہی گاڑی نہیں چلانی آتی۔"
اب کی بار خلیق صاحب نے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن وہ شیریں کے چہرے کو نہایت خفگی کے عالم میں

دیکھنے لگے تھے۔

"گاڑی چلانے میں۔اور گاڑی چلانے کی کوشش کرنے میں فرق ہوتا ہے۔اور میں صرف کوشش کررہی تھی۔اس پوائنٹ کو بلیک مارکر سے ہائی لائٹ کرتے ہوئے نوٹ کریں ڈیڈی! صرف کوشش......"

بات اس نے سٹپٹا کر شروع کی تھی لیکن جب جملہ مکمل ہوگیا تو مطمئن ہوگئی تھی جیسے اپنی کارکردگی سے بے حد خوش ہو۔خلیق صاحب نے اپنی مسکراہٹ کو مصنوعی طنز میں چھپاتے ہوئے ہٹ کر سوال کیا تھا گویا اب کی بار کان کو عقب سے پکڑنا چاہا تھا۔

"آپ کتنی پاکٹ منی لیتی ہیں؟" شیریں اب واقعی سٹپٹائی۔

"ڈیٹس ال لیگل ڈیڈ۔بچوں سے پاکٹ منی کون واپس لیتا ہے۔اور پھر میں نے کیا ہی کیا ہے۔گاڑی چلانے کی کوشش۔کوشش کرنا تو بڑے لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔آپ خود ہی کہتے ہیں زندگی کی آخری سانس تک کوشش کرتے رہنا چاہیے۔اب اس بات پر سزا دیں گے آپ مجھے؟" اس نے عجلت بھرے انداز میں اپنا مؤقف بیان کیا تھا۔حبیب اللہ نے دیکھا،خلیق صاحب ذرا سا مسکرائے تھے۔

"کوشش کرنے پر سزا نہیں دے رہا۔ناکام کوشش پر جرمانہ کررہا ہوں۔"

وہ بھی اپنی بیٹی ہی کی طرح اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔شیریں کے چہرے کا اطمینان رخصت ہوا۔وہ کچھ کہنے کا ارادہ باندھتی ان کی جانب دیکھتی رہی لیکن وہ حبیب اللہ کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔

"آپ کو کیا جرمانہ کیا جائے حبیب صاحب۔دل تو چاہ رہا ہے آپ کو اس مہینے سیلری کے نام پر ایک روپیہ بھی نہ دیا جائے۔"

حبیب اللہ کا دل بالکل بجھ گیا تھا اور چہرہ تاریک ہونے لگا تھا۔بات روپوں کی نہیں تھی۔روپوں سے بھی زیادہ اسے اس سبکی سے اذیت ہورہی تھی جو اس گھر میں پہلی بار سہنی پڑ رہی تھی۔شیریں نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا پھر فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"ناٹ فیئر ڈیڈی۔" اس کے انداز میں ایک عجیب سی بے چینی تھی۔حبیب اللہ کو اس کی یہ بے چینی اچھی لگی۔خلیق صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔اب ان کے چہرے پر بشاش مسکراہٹ چمکی تھی جیسے کسی بات کا بدلہ لے لیا ہو۔

"میں نے کہا نا۔سزا نہیں ہے یہ۔جرمانہ ہے۔اور جرمانہ تو بھرنا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن ایک بات میں بتانا بھول گئی تھی۔"

اس نے کسی شہزادی کی طرح سر اٹھا کر اعتراف کیا تھا۔خلیق صاحب نے اس کا چہرہ دیکھا۔ان کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔حبیب اللہ کو اپنا وجود غیر ضروری محسوس ہوا۔یہ باپ بیٹی کی جنگ تھی۔بادشاہ اور شہزادی کی اس کشمکش میں وہ کسی درباری کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

"حبیب صاحب کو پینلٹی دے دیجیے کیونکہ تجویز میں نے دی تھی۔جرمانہ وہ بھرتا ہے جو قصوروار ہوتا ہے۔یہ بے قصور ہیں۔میں جرمانہ بھرنے کو تیار ہوں۔"

وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔عدالت برخاست ہوگئی تھی۔

☆☆☆

"یہ کیا کررہی ہیں آپ؟"

حبیب اللہ نے گاڑی ان لاک ہونے کی مخصوص بیپ پر مڑ کر دیکھا۔وہ گاڑی کی جانب بڑھ رہی تھی چونکہ

وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا تو حبیب اللہ سمجھ گیا کہ گاڑی کا دروازہ اسی نے ان لاک کیا ہے۔

یہ اس سے اگلے روز کی بات تھی۔ وہ پورچ میں کھڑا پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور اس وقت گھر کے مکین عام طور پر قیلولہ کرنے میں مصروف ہوتے تھے۔ یہ وقت حبیب اللہ کو بڑا پسند تھا۔ سارے ماحول میں عموماً پہلے بھی سناٹا ہی چھایا رہتا تھا لیکن دوپہر کے وقت یہ سناٹا بڑا انوکھا سا محسوس ہوتا تھا۔ وہ اطمینان سے اپنی پسندیدہ کتاب لے کر لان میں بیٹھا رہتا تھا یا پانی کا پائپ لگا کر پودوں کو پانی دینے لگتا تھا۔

اسے لگتا تھا کہ دوپہر کے وقت پودے بہت میٹھی گفتگو کرتے ہیں۔ اسے انسانوں سے زیادہ پودوں سے باتیں کرنے میں مزا آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی طبیعت میں شروع سے کم گوئی شامل تھی۔ شیریں اسے اور اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اطمینان سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی بینڈ ایج لگی ہوئی تھی مگر آنکھیں عزم و حوصلہ سے چمک رہی تھیں۔ حبیب اللہ پریشان ہوا۔ ابھی کل ہی تو خلیق صاحب نے اسے گاڑی چلانے پر تنبیہہ اور جرمانہ کیا تھا۔ پانی کا پائپ وہیں چھوڑ کر وہ بھاگتا ہوا گاڑی کے قریب آیا تھا۔

"یہ کیوں کر رہی ہیں آپ؟" وہ منمنایا تھا۔

"پہلے گیٹ تو کھول دیں۔ یہ اسٹوپڈ کوئچن آپ بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔"

وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی۔ حبیب اللہ تذبذب کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن بہر حال وہ ملازم ہی تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں گیٹ کی جانب بڑھا اور ناپسندیدگی سے گیٹ کھول دیا۔ تب تک وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ تک آ گئی تھی

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھیں؟" اسے واپس پورچ کی جانب جاتا دیکھ کر وہ بولی تھی۔ حبیب اللہ نے ناگواری اور اچنبھے میں گھور کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں بی بی! آج میں نہیں جاؤں گا آپ کے ساتھ۔ میں ایک غلطی سے سبق سیکھنے والا انسان ہوں۔" وہ ملازم تھا مگر پٹھان بھی تھا۔

"حبیب صاحب! ہم دوست ہیں۔ کیا نہیں ہیں؟" وہ چلا کر پوچھ رہی تھی۔ آنکھوں میں شکوہ نمایاں تھا وہ کچھ نہیں بولا لیکن قدم سست ہو گئے تھے۔

"مان لیا آپ ایک غلطی سے سبق سیکھنے والے انسان ہیں۔ لیکن یاد رکھیں، دوستوں کو راستے میں چھوڑ دینے والے انسان بھی نہیں آپ۔"

یہ درخواست یا تنبیہہ نہیں تھی۔ یہ سیدھی سادی دھونس تھی۔ حبیب اللہ چاہ کر بھی اس کا کہا ٹال نہیں سکتا تھا لیکن اس کا دل اس کی بات ماننے کو بھی تیار نہیں تھا۔

"یاد کریں میں نے آپ کا جرمانہ معاف کروایا تھا کل۔ پٹھان بنیں۔ احسان فراموش نہ بنیں۔" اب کی بار وہ جتانے والے انداز میں بولی تھی۔ حبیب اللہ کے لیے یہ طعنہ کاری ضرب ثابت ہوا تھا۔ اس نے پانی کا نل بند کیا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

"وہ چیز جس کی وجہ سے ہمیں سزا ملی ہو۔ ہماری انسلٹ ہوئی ہو۔ اس کو درمیان میں کیوں چھوڑیں ہم۔ اس کو تو گھر تک پہنچا کر دم لینا چاہیے۔ زندگی چیلنجز سے ڈرتے نہیں بلکہ انہیں ایکسیپٹ کرنے کا نام ہے حبیب صاحب۔ یہ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔"

پہلے دن کی طرح گاڑی کو دھیرے دھیرے آگے بڑھاتی وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ حبیب اللہ ڈرا ہوا تو تھا لیکن ڈرائیونگ سے نہیں۔ اسے خود پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کو انکار نہیں کر سکتا تھا اور اب وہ خود کو دل ہی

دل میں سرزنش کرنے میں مصروف تھا کہ اس سے اس لڑکی کو انکار کیوں نہیں کیا جاتا۔

"آج میں انتظام کر کے گھر سے نکلی ہوں اس لیے آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے کہا تھا اور ساتھ ہی ایک آڈیو کیسٹ پلیئر میں ڈالی تھی۔ ایک مردانہ آواز گاڑی میں گونجنے لگی تھی۔ حبیب اللہ کو سمجھنے میں چند لمحے لگے تھے۔ وہ ڈرائیونگ کے آڈیولیسن کی ریکارڈنگ تھی۔ ایک شخص انگریزی میں نہایت تفصیل سے ڈرائیونگ کے اسرار و رموز سکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ایک دن آئے گا کہ آپ اس چیز کے لیے دعائیں دیں گے مجھے۔ ایک ہفتے میں فر فر گاڑی نا چلانی سکھائی آپ کو تو آپ نام بدل دیجیے گا میرا۔"

وہ ہنس رہی تھی۔ حبیب اللہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے اس کی گود میں ایک کتاب بھی رکھ دی جس میں تصاویر کی مدد سے گاڑی کے ہر حصے کی تفصیل بھی درج تھی۔ وہ ناراض سا چہرہ لیے کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا تھا۔ سماعتیں نادانستہ طور پر اسی آڈیولیسن کی جانب لگی تھیں۔ وہ شخص نہایت عرق ریزی سے ہدایات دے رہا تھا۔ اس کا لہجہ شستہ اور واضح تھا۔ شیریں بھی بہت دھیان سے نا صرف سن رہی تھی بلکہ ساتھ ساتھ عمل بھی کر رہی تھی۔ وہ دونوں ہی ابتدائی چیزیں جانتے تھے لیکن انہیں مزید رہنمائی درکار تھی۔ گزشتہ بار کی نسبت آج سڑک پر کوئی بھی ذی نفس نظر نہیں آیا تھا اسی لیے اس کے اندر اعتماد بھی زیادہ تھا۔ اس نے پوری سڑک کا اطمینان سے چکر لگایا تھا لیکن سڑک کے آخر میں جب گاڑی موڑنے کا وقت آیا تھا تو وہ رک گئی تھی۔ سڑک اتنی کشادہ نہیں تھی کہ کوئی نو آموز مہارت سے گاڑی موڑ سکتا۔ اس نے گاڑی روک لی تھی مگر اب موڑنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دائیں بائیں سب ولاز اور بنگلوز میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا۔ مت کریں۔" حبیب اللہ نے پریشان ہو کر کہا تھا۔

"اُف۔ حبیب صاحب! پلیز ٹین ایجرز کی طرح بی ہیو مت کریں۔ کوشش کر رہی ہوں میں۔ دو منٹ دیں مجھے۔" وہ ناراضی بھرے لہجے میں بولی تھی۔ حبیب اللہ کو بھی تپ چڑھی۔

"میں ٹین ایجر نہیں ہوں۔ لیکن آپ تو ہیں نا۔ آپ ہی ان کی طرح بی ہیو کر لیں۔" وہ سخت بُرا مان کر بولا تھا۔

"ہاں میں ہوں۔ لیکن آپ کو کیا بتاؤں، زندگی کے اس فیز سے کتنی نفرت ہے مجھے۔ پتا نہیں کب آئے گی میری ایٹینتھ برتھ ڈے۔" وہ بنا گھبرائے اطمینان سے بولی تھی۔

سخت دوپہر تھی اور اس بات کا امکان نہیں تھا کہ کوئی آ کر ان کی خیریت دریافت کرے گا مگر حبیب اللہ کو یہ خدشہ ضرور لاحق تھا کہ اگر چوکیدار کے شکایت لگانے پر خلیق صاحب اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گئے تو بہت بے عزتی ہو جائے گی لیکن شیریں ابھی پُرعزم تھی۔ حبیب اللہ کو اس کے اس پُرعزم انداز پر بھی غصہ آیا۔

"آپ کیوں کرتی ہیں ایسے کام؟ خلیق صاحب ناراض ہوں گے۔" اس نے اس کے باپ کا نام آخری حربے کے طور پر لیا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گی اور ہوا بھی یہی تھا۔ اس نے اس کی بات مکمل طور پر ان سنی کر کے آڈیو کا سبق تھوڑا سا فارورڈ کیا تھا پھر ہدایات کو غور سے سنتے ہوئے وہ کبھی گیئر پر ہاتھ رکھتی تھی پھر گیئر چھوڑ کر اسٹیرنگ کو ہلکے ہاتھوں سے گھمانے لگتی تھی۔ چند لمحوں کی سر توڑ کوشش کے بعد بالآخر وہ گاڑی کو موڑنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ حبیب نے اطمینان کا سانس لیا تھا

"یا ہو۔ میں نے کہا تھا نا، ہم کر لیں گے۔ ہم نے کر دکھایا۔" وہ بہت خوش تھی پھر اس کے چہرے پر نظر پڑی۔ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ناک چڑھا کر بولی۔

"ایک عدد ڈسکلیمر۔ ہم نے نہیں۔ میں نے کر دکھایا۔ آپ تو بہت ہی ڈرپوک ہیں بھئی۔" یہ طعنہ تھا اور

ایسے طعنے اسے اس کے منہ سے سننے کو ملتے ہی رہتے تھے۔
''آپ اتنے بزدل ہیں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ آپ کی اس حرکت سے میرا دل آپ سے ہی نہیں بلکہ ان تمام کتابوں اور کہانیوں سے بھی اٹھ گیا ہے جن میں غیور بہادر اور جری پٹھانوں کی داستانیں جلی حروف میں درج ہیں۔ فکر مت کریں۔ اتنی جلدی نہیں مریں گے آپ۔ اور میں نے تو ابھی ایورسٹ پر جانا ہے۔ کے ٹو ٹاپ پر اپنا نام لکھ کر آنا ہے۔ اپنے سارے خواب پورے کیے بنا کہیں نہیں جانے والی میں۔ وہ اب نہ صرف پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ گاڑی چلا رہی تھی بلکہ اس کا حوصلہ قائم رکھنے کو مسلسل باتیں کرنے میں بھی مگن تھی۔ گھر کے گیٹ کے آگے گاڑی روکتے ہوئے اس نے فخریہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔
''کیسا؟'' آنکھوں کو اچکاتے ہوئے وہ بے پناہ خوش ہو کر سوال کر رہی تھی۔ حبیب اللہ پہلی بار مسکرایا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتا اس نے پھر گیئر لگا دیا تھا۔
''ابھی کہاں۔ ابھی تو ایک چکر اور لگائیں گے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔
اب کی بار حبیب اللہ نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ جیسے اکتا گیا تھا اور وہ جانتا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ اس روز نہ صرف اس نے چار بار ایسے ہی سڑک کا چکر لگایا بلکہ بعد میں حبیب اللہ کو بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر یہی پریکٹس دو بار کروائی۔ حبیب اللہ کو ڈرائیونگ سے ڈر نہیں لگتا تھا لیکن وہ ملازم بندہ تھا۔ مالکوں کی ہدایات کو بلا چوں چرا ماننا اسے پسند تھا۔ خلیق صاحب جس کام سے منع کر دیتے تھے، وہ اسے کرتا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے گزشتہ بار تنبیہہ نہ کی ہوتی تو وہ اس قدر کترا کر گاڑی میں نہ بیٹھتا۔ شیریں کے ٹوکنے، مذاق اڑانے اور بار بار کہنے پر جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تو اس نے شیریں کو اس سے بہتر انداز میں گاڑی چلا کر دکھائی تھی۔
''گڈ جاب۔ اچھی کوشش تھی۔ مجھے یقین ہے آپ ایک ہفتے کے بجائے دو دن میں ہی گاڑی چلانے کے بجائے اڑانے لگیں گے۔ مجھے کہیں واقعی اپنا نام نہ چینج کرنا پڑ جائے۔''
اس نے جب گاڑی گھر کے گیٹ سے اندر کی تو وہ سابقہ انداز میں ہنستے ہوئے بولی تھی۔ حبیب اللہ جھینپ سا گیا پھر جیسے ایک خیال آیا
''کیا نام رکھیں گی آپ؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔
اس کے ہونٹ جب شرارتی انداز میں چمکتے تھے تو اس کی سبز آنکھیں مزید سبز ہو جایا کرتی تھیں۔ شیریں گاڑی سے اتر رہی تھی۔ اس کے سوال پر لحہ بھر کو رکی پھر بولی۔
''جو آپ کہیں۔ وہی نام رکھ لوں گی۔''
حبیب اللہ کی ہارٹ بیٹ بلاوجہ مس ہوئی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لڑکی اس کی دسترس میں کبھی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کے چہرے پر ازلی شرارت کے علاوہ کچھ اور ہے مگر پھر بھی محبت میں خود کو دھوکا دیتے رہنا بہت مسرور کن ہوتا ہے۔ وہ اس سرور سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔
اس نے وہ نام بتایا جو اسے پسند تھا۔ کسی کتاب میں شاید کسی کردار کا نام پڑھا تھا اس نے اور اسے بھا گیا تھا۔ شیریں نے بغور اس لفظ کو سنا پھر دو ہرایا۔
''ہاں۔ اچھا ہے۔ کافی اچھا ہے۔'' وہ ہنس رہی تھی۔ پسندیدگی کے احساس سے اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا یا شاید حبیب اللہ کو ایسا لگا۔ اسے بلاوجہ ہنسنے کی عادت نہیں تھی لیکن اس کا چہرہ ایسا تھا کہ ذرا سی مسکراہٹ کی جھلک، چہرے کو گل گلزار بنا دیتی تھی۔
''ڈن ہو گیا۔'' وہ انگوٹھے کا نشان بنا کر اسے سراہتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی تھی۔ حبیب اللہ اس کے جانے

کے بعد کھل کر مسکرایا تھا۔
پہلی محبت اس قدر گدگدانے والی کیفیت ہے کہ انسان تنہائی میں بھی مسکراتا رہتا ہے۔

☆☆☆

چار دن کی مسلسل پریکٹس کے بعد وہ اپنے ایریا کی سڑک سے باہر نکل کر معروف شاہراہ تک گئے تھے۔ دل میں خوف بھی موجزن رہتا لیکن گاڑی چلانے میں ان دونوں کو ہی اتنا مزا آنے لگا تھا کہ اس خوف کو پیچھے دھکیلنے کے لیے خاص ہمت نہ کرنی پڑتی تھی۔ چھ دن بعد شیریں نے خلیق صاحب کو بھی ساتھ بٹھا کر رات کے وقت گاڑی چلائی تھی اور اپنے ایریا میں بنے آئس کریم پارلر سے آئس کریم بھی کھلائی تھی۔ حبیب اللہ کے خدشات کے برعکس وہ ناراض ہوئے تھے نہ ہی انہوں نے بیٹی کو سرزنش کی تھی بلکہ وہ اسے سراہتے رہے تھے۔ وہ اس کے اس عمل پر فخر محسوس کرتے رہے تھے۔
وہ مصنوعی انداز میں ناک چڑھا کر بولی تھی۔ خلیق صاحب اس کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ آئس کریم سے بھرا چمچ منہ میں رکھتے ہوئے مسکرائے تھے۔
''سزا نہیں جرمانہ۔ میں نے جرمانہ کیا تھا۔'' انہوں نے تصحیح کی تھی۔ شیریں نے سر جھٹکا۔
''میں نے اسے سزا ہی سمجھا تھا۔ اور اپنی سزا کو جزا میں بدلنا آتا ہے مجھے۔'' وہ فخریہ انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔ خلیق صاحب ہنسے اور پھر اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔
وہ ایسی ہی تھی۔ پُراعتماد اور ذہین۔ نڈر اور حوصلہ مند مگر ضدی۔ بے حد ضدی۔
اسے اپنے جائز موقف پر ڈٹ جانے اور اُسے منوا لینے کی عادت وراثت میں ملی تھی۔ جو ٹھیک تھا اسے ٹھیک کہنے میں وہ کتراتی نہیں تھی اور جو غلط تھا اسے دنیا کی کوئی طاقت مان لینے پر مجبور نہیں کرسکتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہونا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے پاس ہر سوال کا جواب، ہر مسئلے کا حل ہوا کرتا تھا۔
وہ مشکلات سے گھبراتی بھی نہیں تھی بلکہ ان کا حل تلاش کرنے لگتی تھی اور جس کام کا ذمہ لے لیتی تھی اسے مکمل کرکے ہی دم لیتی تھی۔ وہ جہاں جاتی تھی، وہاں چھا جاتی تھی۔ اس کی موجودگی کو، اس کے وجود کو نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا۔ ایک کامیاب انسان والی ساری خصوصیات اس کی شخصیت میں موجود تھیں اور ممتاز ہونے کے سارے گر اسے زبانی یاد رہا کرتے تھے۔
وہ خلیق صاحب کی پہلی اولاد تھی اور پہلوٹھی کی اولاد دل کے زیادہ قریب ہوا کرتی ہے اور پھر اس نے پانچ سال تک اکلوتے پن کا خوب فائدہ بھی اٹھایا تھا۔ عمر اس کے پانچ سال بعد دنیا میں آیا تھا۔ وہ فطرتاً بہت معصوم اور بھولا بھالا سا بچہ تھا۔ اس لیے بھی شیریں، خلیق صاحب کی زیادہ لاڈلی تھی کہ وہ نا صرف شرارتی تھی بلکہ ہر کام کرنے میں پیش پیش رہتی تھی۔
اپنی ممی کے برعکس وہ اپنے ڈیڈی سے اٹیچڈ بھی زیادہ تھی۔ خلیق صاحب اسے شہ بھی بہت دیتے تھے۔ اس کا حوصلہ بڑھانے کو وہ اسے ہمیشہ میرا شیر، میرا بہادر بچہ جیسے ناموں سے پکارتے تھے۔ اس کی ممی اگر ٹوکتی بھی تھیں تو وہ زیادہ پروا نہیں کرتی تھی کیونکہ خلیق صاحب اس کا حوصلہ ہمیشہ بلند رکھتے تھے۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی خامی بھی نہیں تھی کہ انہیں بار بار نصیحت کرنی پڑتی لیکن بس وہ ضدی تھی اور یہ ضد وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی تھی۔ خلیق صاحب ارنسٹ ینگ میں سینئر آڈیٹر کے طور پر کام کرتے تھے۔ اسی جاب کی وجہ سے کئی ممالک کی سیر کرچکے تھے۔ یورپ اور امریکہ میں اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ شیریں اور عمر انگلینڈ میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ انگلینڈ کے علاوہ بھی یہ لوگ کافی ممالک گھوم چکے تھے لیکن خلیق صاحب کی اہلیہ چاہتی تھیں کہ انہیں

کسی مسلم ملک میں ٹرانسفر کردیا جائے۔
یہ ان کی دیرینہ خواہش تھی۔ انہیں گلف ریجن میں رہنے کا موقع ملے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ مسلم ملک میں وہ اپنے بچوں کی تربیت زیادہ احسن طریقے سے کر پائیں گی لیکن ایسا ہو نہیں پا رہا تھا پھر اچانک مدتِ ملازمت کے آخری عشرے میں انہیں قطر ریجن میں ٹرانسفر مل گیا۔ وہ سب اس امر سے کافی خوش تھے۔ شیریں چودہ پندرہ سال کی تھی جب وہ لندن سے قطر شفٹ ہوئے تھے لیکن خلیق صاحب وہاں زیادہ خوش نہیں تھے اور اب ان کی خواہش تھی کہ وہی ٹرانسفر کروالیا جائے۔

☆☆☆

''آپ کی کوئی گرل فرینڈ ہے؟''
یہ عمر تھا۔ خلیق صاحب کا بیٹا۔ حبیب اللہ جھینپ کر مزید گاڑی کے اندر گھس گیا۔ سب کی موجودگی میں یہ سوال اس کے کان کی لویں تک سرخ کر گیا تھا لیکن وہ سب نارمل تھے۔ وہ دونوں بہن بھائی پہلے بھی اس سے ایسی باتیں کرتے تھے۔ ان کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا جس میں لڑکے لڑکیاں دونوں ہی شامل تھے۔ وہ دونوں اپنے دوستوں کا ذکر نام لے کر کیا کرتے تھے۔ ان کے دوستوں کے نام بھی حبیب اللہ کو ازبر تھے۔ ان کے لڑائی جھگڑے، ان کی دلچسپ پارٹیز اور پکنک کے احوال وہ سب سنتا رہتا تھا لیکن آج سے پہلے ان دونوں نے ہی بھی اس کی ذات کے متعلق ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس سے اس استفسار کی نوبت پہلی بار آئی تھی۔ خلیق صاحب برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے اہلیہ کے ساتھ چائے کا لطف اٹھا رہے تھے جبکہ شیریں بھائی کے ساتھ ٹینس کھیل کر فارغ ہوئی تھی اور اب گھاس پر بیٹھی ٹشو پیپر سے اپنے ریکٹ کو بار بار صاف کر رہی تھی۔
حبیب اللہ گاڑی دھو کر فارغ ہوا تھا اور اب خشک کپڑے سے بلاوجہ اسے چمکانے میں مصروف تھا لیکن وہ گاہے بگاہے سب پر سرسری نظریں ڈالتا جا رہا تھا۔ چند دن میں ان سب کی واپسی متوقع تھی اور گاڑی واپس گیراج میں بھجوانی جانی تھی۔ اس نے اپنے کسی دوست سے شیریں اور عمر کے لیے سیالکوٹ سے انتہائی اچھی کوالٹی کے نئے ٹینس ریکٹ منگوائے تھے اور شیریں جتنی احتیاط اور محبت سے ان کو استعمال کر رہی تھی اسے اس امر سے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔
عمر کے سوال نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔ وہ بہت شرم و حیا والا انسان تھا۔ ایسی باتیں ان کے یہاں برملا نہیں کی جاتی تھیں اور بچے تو بالکل نہیں کرتے تھے۔
''میں نے اور ڈیڈی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم جب اگلی بار آئیں گے تو آپ کی گرل فرینڈ کے لیے ایک بہت اچھا گولڈ پینڈنٹ لائیں گے۔ ان کے نام کے پہلے لیٹر والا۔ ہے نا ڈیڈی؟''
وہ عادتاً بلند آواز میں بات کرتا تھا لیکن جب کسی کو مخاطب کرنا ہوتا تھا تو آواز مزید اونچی ہو جاتی تھی۔
''وہ کس خوشی میں؟'' یہ شیریں کا سوال تھا۔ حبیب اللہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسی کی جانب دیکھ رہی تھی اور آنکھوں میں ناپسندیدگی بھی تھی۔
''حبیب صاحب ہمارے لیے اتنے اچھے ٹینس ریکٹ لائے ہیں۔ ہمیں بھی تو ان کے لیے کوئی گفٹ لانا چاہیے۔'' اپنے تئیں وہ بہت سمجھداری سے جواب دے رہا تھا۔ شیریں کی پیشانی پر مزید بل پڑ گئے۔
''واہ۔ حبیب صاحب ہمارے لیے گفٹ لائے ہیں اور ہم ان کی گرل فرینڈ کے لیے گفٹ لائیں گے۔ گرل فرینڈ بھی وہ والی جس کے بارے میں حبیب صاحب نے ہمیں بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ بڑی اچھی پروپورشن پڑھائی جاتی ہے تمہیں اسکول میں۔ ہم نہیں لا رہے کسی کے لیے بھی کوئی گفٹ۔'' اس کا لہجہ مستحکم تھا۔
''میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔'' حبیب اللہ نے حیران ہوتے ہوئے فوراً صفائی دی تھی۔

"اگر ڈیڈی نے پلان کیا ہے کہ آپ کی کسی ایکس وائے زیڈ کے لیے گولڈ پینڈنٹ لایا جائے گا تو یقیناً ایسی کوئی محترمہ ہوں گی۔ ورنہ ڈیڈی ایسی پلاننگز نہیں کرتے۔" وہ ناراض ناراض سی لگتی تھی۔ خلیق صاحب تک بھی ساری آوازیں جارہی تھیں۔ انہوں نے قہقہہ سا لگایا۔

"ارے بھائی۔ یہ نہیں کہا تھا میں نے۔ عمر مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اسے حبیب اللہ کے لیے کوئی اچھی چیز خریدنی ہے تو میں نے کہہ دیا کہ اس کی شادی پر خریدنا۔ ہم جب اس کی شادی پر جائیں گے تو اچھا سا گفٹ لے کر جائیں گے۔ یہ بات ہوئی تھی بس۔"

انہوں نے وضاحت کی تھی۔

"حبیب صاحب کی شادی کی باتیں شروع ہوگئیں اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں۔ یہ غلط ہے حبیب صاحب۔ دوستوں میں یہ سب نہیں چلتا۔ آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا۔"

وہ ایک بار پھر حبیب اللہ سے مخاطب تھی۔ وہ خاموشی سے گاڑی کی سطح پر ہاتھ رگڑنے میں مصروف رہا لیکن دل ہی دل میں اسے مزا آرہا تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی پہلے بھی ایسی ہی باتیں کرنے کے عادی تھے۔ لندن میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والے یہ بچے اس کی طرح، پہاڑوں میں پلنے والے لوگوں کی طرح نہیں تھے۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" وہ منمنایا۔ خلیق صاحب کی اہلیہ نے صورتحال کو فوراً سے بیشتر اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

"یہ سب 'انہوں' نے شروع نہیں کیا۔" ان کا اشارہ خلیق صاحب کی طرف تھا۔

"یہ میں نے کہا تھا۔ ان کے یہاں شادیاں اسی عمر میں کی جاتی ہیں۔ اس لیے میں نے ایسا کہہ دیا تھا۔"

"آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا ممی۔ شادی ایک بہت پرسنل میٹر ہوتا ہے۔ حبیب صاحب اپنی شادی کے میٹر کو خود ہی ڈیل کریں گے۔ ہم کون ہوتے ہیں یہ سب کہنے سننے والے۔" اس کا وہی دوٹوک انداز تھا۔ اس کی ممی کو اس کے اس انداز سے الجھن ہوتی تھی۔

"یہ جس برادری سے تعلق رکھتے ہیں وہاں شادیاں پرسنل میٹر نہیں ہوتیں۔ جس سے ماں باپ کردیں۔ بچے چپ چاپ اسی سے کرلیتے ہیں۔" اب کی بار وہ بھی دوٹوک انداز میں بولی تھیں۔

"ممی! آپ اس برادری سسٹم کی بات مت کریں۔"

وہ دھونس جمانے والے انداز میں بولی تھی۔ خلیق صاحب مسکرانے لگے تھے۔ انہیں اپنی بیٹی کی ہر بات کو سراہنے کی عادت تھی۔ اس کی ممی کو بالکل اچھا نہ لگا تھا۔ انہوں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بات مکمل نہ کرنے دی تھی۔

"کیوں نہ کریں برادری سسٹم کی بات۔ انسان اپنے خاندان کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اور تمہارا ہر معاملے میں بولنا ضروری نہیں ہوتا۔ پہلے بات کو سمجھ لیا کرو۔ انسان اپنے قبیلے اور کنبے سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ خاندان برادریاں انسان کو تنہا نہیں ہونے دیتیں۔" وہ ناراض نظر آنے لگی تھیں۔

"واہ واہ! سبحان اللہ۔ تنہا نہیں ہونے دیتیں مگر زندہ بھی نہیں رہنے دیتیں۔ اس لیے ہجوم کے ساتھ مردہ دل ہوکر چلنے سے بہتر ہے انسان تنہا رہ لے۔"

وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ اس کی ممی نے خلیق صاحب کو شکایتی انداز میں دیکھا۔ ہر ماں کی طرح انہیں یقین تھا کہ ان کی تمیزدار، سلجھی ہوئی اولاد کو بگاڑنے میں سارا ہاتھ ان کے باپ کا تھا۔

"شیریں۔ فضول مت بولتی رہا کرو۔ تم ابھی بچی ہو۔ تم نہیں سمجھ سکتیں یہ باتیں۔ حبیب اللہ بے شک شہر میں رہتا ہے لیکن اس کی بنیاد پہاڑوں سے اٹھی ہے۔ وہ ان سے کٹ نہیں سکتا۔ اور پھر بڑوں کی مرضی سے شادی

کرنے میں برائی کیا ہے۔"
وہ ناراض لگتی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ حبیب اللہ کی آڑ میں اپنی بیٹی کو ہی کچھ سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ شیریں نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔
"یہ برادری ورادری کچھ نہیں ہوتا ممی۔ اور کچھ ہوتا بھی ہے تو حبیب صاحب ہمارے گھر کا فرد ہیں۔ یہ اب ہماری برادری کے ہیں۔ ان کی شادی ہماری برادری کے حساب سے ہوگی۔ کیوں ڈیڈی؟" وہ جیسے ایک نئی تجویز دے رہی تھی اور ان کی رائے بھی جاننا چاہ رہی تھی۔
"ٹھیک کہہ رہی ہے شیریں۔ حبیب صاحب اب ہماری برادری کے ہیں۔ ان پر پہاڑوں کا کوئی اصول لاگو نہیں ہوتا۔" انہوں نے اپنے تئیں بحث سمیٹی تھی۔
شیریں نے متشکرانہ انداز میں گہری سانس بھری اور حبیب اللہ کی جانب دیکھ کر آنکھ ماری تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن لمحہ بھر میں اتھل پتھل ہوگئی تھی۔
"آپ کو میرے ہوتے ہوئے بالکل بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی شادی ہماری برادری میں ہوگی۔" وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔
"اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو؟" عمر نے بلاوجہ ایک سوال پوچھ لیا تھا۔ شیریں نے سوچنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگایا تھا۔
"تو بے شک میرا نام تبدیل کر دینا۔"
وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ یہ جملہ کثرت سے اس کی گفتگو میں استعمال ہونے لگا تھا۔ اس کی ممی وہاں سے اٹھ کر چل دی تھیں جیسے انہیں یہ گفتگو بالکل پسند نہ آئی ہو جبکہ حبیب اللہ کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ یہ احساس کتنا زور آور تھا کہ وہ اس کی پروا کرتی تھی۔ اس کی فکر میں مبتلا ہوتی تھی اور یہ امر بے حد خوش کن بھی تھا۔ وہ اسے اچھی لگتی تھی وہ کب اور کیوں اچھی لگنے لگی اسے بھی پتا نہ چل سکا تھا حالانکہ اس کی ایک خالہ نے اپنی بیٹی کو اس کے نام سے منسوب کیا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے یہاں اپنی ذات سے منسوب چیزیں چھوڑ دینے کی سزا موت ہوا کرتی ہے مگر پھر بھی وہ اسے چاہتا تھا۔

☆☆☆

"میرا اندازہ ٹھیک تھا خان۔ یعنی آپ کو۔"
گلے جو خاموشی سے سب سنتی جا رہی تھی یک دم گفتگو کا سلسلہ روک کر انہیں ٹوک بیٹھی لیکن اس سے ایک ننھا سا جملہ بھی مکمل تشکیل نہ دیا جا سکتا تھا۔ وہ کچھ کہتی کہتی رک گئی تھی پھر اس نے خان کا چہرہ دیکھا جہاں ندامت چھائی ہوئی تھی۔
"آپ کو اپنے مالک کی بیٹی سے۔"
یہ استفسار تھا نہ استفہام۔ شکایت تھی نہ گلہ۔ بس حیرانی تھی تاہم اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ بجھ گیا تھا۔ وکٹری اسٹینڈ پر دوسری پوزیشن پر خوش باش کھڑی گلِ لالہ کو یک دم تیسری پوزیشن کی جانب دھکیل دیا گیا تھا۔
اس کا دل یہ تسلیم کرنے میں ضرورت سے زیادہ وقت لے رہا تھا کہ اتنے شریف النفس نظر آنے والے حبیب اللہ خان کا کوئی افیئر بھی ہوسکتا ہے۔ اسے شروع سے پتا تھا، وہ خان کی زندگی میں آنے والی دوسری عورت تھی لیکن دل کو اس بات سے ہمیشہ تسلی رہی کہ پہلی عورت اس کی بہن ہی تھی جو عرصہ پہلے قبر میں دفنائی جا چکی تھی۔ اس سے حسد کیسے کرسکتی تھی وہ۔ لیکن شیریں محمد خلیق سے اسے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی۔

حبیب اللہ خان نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر ہمت نہ ہوئی۔ وہ شرمندہ تھے لیکن وہ صرف گلِ سے شرمندہ نہیں تھے تاہم گلے کو یہ سب بتا دینے کے بعد انہیں لگا تھا سینے سے آدھا بوجھ ضرور ہٹ گیا ہے۔ وہ سانس جو سینے میں اٹک اٹک کر چلتی تھی کسی قدر روانی سے آگے بڑھتی محسوس ہونے لگی تھی۔

"مجھے ہمیشہ سے یقین تھا خان کہ اس سارے قصے میں کہیں نا کہیں کوئی دبا ہوا عشق کا قصہ ضرور نکلے گا۔" وہ ابھی بھی جیسے اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔ حبیب اللہ خان نے صفائی دینے والے انداز میں اپنے ہاتھ اٹھائے۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں گلِ لالا۔ ایسا نہیں تھا۔" وہ بولے تھے۔ گلے نے ان کی بات کاٹ دی۔

"خان کیوں میرے ننھے سے دماغ پر اتنا بوجھ لادتے ہیں۔ کیوں میرے دل کے اتنے ٹکڑے کر رہے ہیں آپ۔ جب اعتراف کر چکے ہیں کہ وہ آپ کو اچھی لگتی تھی تو اس بات پر قائم رہیں نا۔ کم از کم مجھے اور میرے بیٹے کو یہ تسلی تو رہے گی نا کہ آپ نے اپنی محبت میں ہمیشہ ہماری قربانی دی۔ اپنے خاندان کی قربانی۔"

اب کی بار وہ اپنے جذبات کی شدت پر قابو نہ رکھ سکی تھی اور نہ صرف آواز اونچی ہوئی تھی بلکہ لہجہ گلوگیر بھی ہو گیا تھا۔ حبیب اللہ خان نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا پھر ارادہ ترک کر دیا۔ ہر بات مکمل بتا دینے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ وہ گلِ لالہ کو جانتے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ وہ جتنی بات سن چکی ہیں، ان کے لیے اتنی ہی کافی ہے جبکہ مکمل بات یہ تھی۔۔

اسے شیریں اچھی لگتی تھی لیکن اس نے اس کے حصول کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ عادتاً بہت قناعت پسند قسم کا انسان تھا۔ چاند کا تمنائی ہونے میں اور اس کو حاصل کرنے کا خواب دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ عقیدت کے اس مقام پر تھا کہ جہاں بس انسان چاند کو تکنے کی خواہش پال سکتا ہے۔ اس کی چاندنی سے فیض یاب ہونے کی اس کی اوقات ہی نہیں ہوتی۔

خلیق صاحب کا خاندان کچھ عرصہ بعد قطر سے دبئی منتقل ہو گیا تھا۔ دبئی میں رہائش اختیار کرنے کے بعد انہیں صحیح معنوں میں سمجھ میں آیا تھا کہ وہاں کے طرز زندگی میں اور کسی بھی مغربی ملک میں کچھ خاص فرق نہ تھا بلکہ دبئی میں معاشرہ اس قدر ملٹی کلچرل تھا کہ انہیں کچھ عرصے بعد ہی وہاں کی رنگینیاں پریشان کرنے لگی تھیں۔ ان کے بچے بڑے ہو رہے تھے اور ان پر معاشرتی اثرات اپنا رنگ چھوڑ رہے تھے۔

خلیق صاحب اس امر سے زیادہ پریشان نہیں ہوتے تھے کیونکہ انہیں اپنی تربیت پر بھروسا تھا۔ انہوں نے دونوں بچوں کو ہی پُر اعتماد اور جامع طرزِ زندگی دیا تھا۔ اپنی حدود میں رہتے ہوئے ان کے دونوں بچوں کو ہر کام کرنے کی آزادی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شیریں اور عمر دونوں ہی ایک حد تک متوازن شخصیت کے مالک تھے مگر بڑھتی عمر اور بدلتے حالات کا اثر شیریں پر کافی تیزی سے اثر انداز ہونے لگا تھا۔ دبئی شفٹ ہو جانے کے بعد جب وہ پہلی بار چھٹیوں میں پاکستان آئی تو ہی حبیب اللہ نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ انڈیپنڈنٹ (آزاد) ہو چکی تھی اور اس کے اور اس کے والدین کے درمیان فاصلہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ اب اس کے دوستوں میں کثرت سے لڑکے شامل ہو چکے تھے جن کا ذکر وہ برملا اپنے والدین کے سامنے بھی کرتی تھی۔ وہ پارٹ ٹائم جابز کر کے اچھے خاصے پیسے کمانے لگی تھی جس کی وجہ سے اب اس کی ذاتی ضروریات کی چیزیں بھی برانڈڈ ہوتی تھیں۔ اس کے پاس موبائل بھی تھا جو کہ اس کی عمر کے بہت کم لوگوں کی استطاعت میں تھا۔ اس نے اپنی کلائی پر ٹاٹو بنوالیا ہوا تھا۔ وہ فیشن ماڈل بننے کے خواب دیکھنے لگی تھی اور اس کا دیکھا ہوا ہر خواب اسے حبیب اللہ سے مزید دور لے جا رہا تھا۔

اسی لیے حبیب اللہ نے چپ چاپ اپنی خالہ زاد سے شادی کرنے کو ترجیح دی تھی لیکن بادشاہ جس علاقہ کو فتح

کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں وہاں انا رکی پھیلائے رکھنے میں انہیں سرور ملتا ہے اور اس معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔

☆☆☆

"زہرہ! اے زہرہ! سوگئی ہو؟"

یہ غنوئی تھی۔ غنوئی بلوچستان سے درس گاہ آئی تھی اور شروع سے زہرہ کے کمرے میں ہی سوتی تھی۔ زہرہ تجوید میں بہت اچھی تھی جبکہ غنوئی کی قرات بہترین تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے سیکھتی رہتی تھیں۔

"اس وقت کیوں سو جاتی ہو تم۔ اٹھو۔ باہر چلتے ہیں۔ بڑا اچھا موسم ہے۔ سورج نکلا ہوا ہے۔ دھوپ اتنی میٹھی ہے کہ شہد بھی پھیکا لگنے لگے گا۔" وہ اسے جگا رہی تھی لیکن زہرہ منچلی بنی آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔

"مجھے نہیں جانا کہیں۔ مجھے دھوپ میٹھی نہیں لگتی۔" وہ آنکھیں کھولے بنا بولی تھی۔

وہ سو نہیں رہی تھی لیکن جاگنے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ بمشکل اٹھارہ سال کی تھی اور یہ عمر بہت نا سمجھی والی ہوتی ہے۔ اپنا ہی دل عجیب کشمکش میں ڈالے رکھتا ہے۔ اس عمر میں دل کسی بھی وہم کی آبیاری کرنے لگتا ہے کہ وہ محبت محسوس ہونے لگتی ہے۔

اور پھر زہرہ تو بے حد معصوم تھی۔ زندگی میں اسے کسی چیز کا ایکسپوژر نہیں تھا۔ اسکول کی شکل بس ابتدائی جماعت تک دیکھی تھی پھر حفظ قرآن کے لیے درس گاہ نور القلوب آگئی۔ یہاں کا ماحول گھٹا ہوا نہیں تھا اور صندل بی نے ہر ممکن کوشش کر رکھی تھی کہ حفظِ قرآن کے ساتھ بنیادی مضامین بھی پڑھائے جائیں لیکن ان سب کے باوجود سختی بہر حال کافی تھی۔

کسی سے پڑھائی سے ہٹ کر بات کرنا آسان کام نہیں تھا۔ کچی عمر میں بچیاں جو خواب دیکھنے لگتی ہیں، ان کو زیرِ بحث لانے اور ڈیل کرنے کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ وہاں ایک عجیب طرح کا جنریشن گیپ تھا۔ چھوٹی بچیاں جوان ہوتی ہوئی بچیوں سے ڈرتی تھیں اور جوان بچیاں ادھیڑ عمر خواتین سے خائف رہتی تھیں۔

اسی لیے زہرہ پر ایک مصیبت نہیں ٹوٹی تھی۔ وہ دو دھاری تلوار پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

ہری حویلی سے آنے والے شخص نے کب اس کی آنکھوں سے اس کے دل تک رسائی حاصل کی اسے خبر نہ ہو سکی تھی۔ اس روز درس گاہ میں کسی درس کا اہتمام تھا تو سارے حافظ لڑکے مصروف تھے۔ صندل بی سمیت باقی اساتذہ بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ہری حویلی والوں کی طرف سے سوغاتیں آئیں تو ساجدہ باجی کے کہنے پر وہ بس سامان لینے کی خاطر چہرہ ڈھک کر باہر آئی تھی لیکن۔ وہ جو اس روز اس کے دل پر قابض ہوا تھا اس کا چہرہ تو ڈھکا ہوا نہیں تھا نا، اور قیامت یہ ہوئی کہ اس نے اسے مخاطب بھی کر لیا۔

"بات سنیں۔ ہمارا روزہ ہے اور مغرب ہونے والی ہے۔ ہمارے پاس کھجوریں ہیں۔ جوس وغیرہ بھی ہے لیکن اگر آپ پانی کی ایک بوتل لا دیں تو آسانی رہے گی۔ یہاں سے باہر نکل کر کسی دوکان کو ڈھونڈنے میں ہمیں آدھ گھنٹہ لگ جائے گا اور تب تک روزہ افطار ہو جائے گا۔"

وہ نرم سے لہجے میں آنکھیں جھکائے بولا تھا۔ پانی کی بوتلیں تو مہمان خانے کی الماری میں ہی پڑی رہتی تھیں۔ اس نے جھجکتے ہوئے الماری کھول کر دو بوتلیں اسے تھما دیں۔

"بے حد شکریہ اچھی لڑکی۔"

اس نے تشکر آمیز انداز میں کہا تھا۔ اس کا لہجہ اس قدر میٹھا تھا کہ یہ مٹھاس زہرہ کو اب بھی اپنی سماعتوں سے چپکی محسوس ہوتی تھی اور یہ غنوئی کہتی تھی کہ دھوپ میٹھی ہے۔ شہد سے بھی زیادہ۔

"تمہیں کچھ نہیں پتا غنوئی۔ کچھ بھی نہیں۔" اس نے یونہی آنکھیں بند کیے سوچا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے کو اپنی دل کی دیواروں سے کھرچ نہ پائی تھی۔ آنکھیں بند بعد میں ہوتی تھیں اور اس کا چہرہ خواب کے آنگن میں پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ اس کی آواز اور ان دو جملوں کو زہرہ کی سماعتیں کسی سبق کی طرح بار بار دہراتی تھیں اور ہر بار اسے ان میں مٹھاس کا ایک الگ ہی ذائقہ محسوس ہوتا تھا۔

وہ ہر دو ہفتے بعد یا کبھی کبھی ایک ہفتے بعد بھی آجایا کرتا تھا اور زہرہ سب سے نظریں بچا کر اسے دیکھ ضرور لیتی تھی مگر یہ دیکھنا بھی کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ وہ اس کی ایک جھلک کی مسرور ترین کیفیت کو نماز اور قرآن میں بھی ذہن سے جھٹک نہیں پاتی تھی۔ ایک طرف تو دل کی یہ کیفیت تھی دوسری طرف جب بھی دعا مانگنے کا وقت آتا تو بجائے اس کے کہ ''اس'' کے حصول کی دعا مانگتی وہ بلک بلک کر رب سے معافی مانگنے لگتی تھی۔

''آپ کو کوئی انسان اللہ سے غافل بھی کر سکتا ہے۔'' یہ احساس اس قدر تکلیف دہ ہو جاتا تھا کہ پھر وہ لاچار ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا اثر اس کی صحت، اس کی پڑھائی پر بھی پڑ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صندل بی کی اپنی طبیعت اگر ان دنوں خراب نہ ہوتی تو وہ ضرور اس کے دل کا حال جان لیتیں اور اسے اس لمحے سے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ بے حد خوف۔

''زہرہ! صندل بی بلا رہی ہیں۔'' وہ کام جو غنوئی نہ کر پائی تھی وہ طیبہ نے کر دکھایا تھا۔ وہ صندل بی کا سندیسہ لے کر آئی تھی۔ زہرہ نے بستر چھوڑنے میں سیکنڈ بھی نہیں لگایا تھا اور دوپٹہ درست کرتی باہر آگئی تھی۔ وہ دالان میں بیٹھی تھیں۔ ناشتے کے بعد صرف چھوٹی بچیاں سبق لیتی تھیں باقی سب لوگ درس گاہ کی صفائی یا کچن کی ذمہ داریوں میں مصروف ہو جایا کرتے تھے۔

''بہت دن ہوئے ہری حویلی سے کوئی نہیں آیا نا؟'' انہوں نے اس کا نام نہیں لیا تھا لیکن جملے میں موجود ''ہری حویلی'' کے ذکر نے خود بخود زہرہ کے حواس کو جگا دیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا پھر نفی میں گردن ہلائی۔

''اٹھارہ دن ہو گئے ہیں۔ ان کی جیپ نے درس گاہ کی شکل نہیں دیکھی۔ (اور میں نے اس کی)'' نصف جملہ اس نے صرف دل میں ادا کیا تھا۔

''میرا فون لے کر آؤ۔ مجھے کال کرنی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

زہرہ کا چہرہ جیسے چمکنے لگا تھا۔ وہ ترنت ان کے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔ صندل بی کے فون کو ہاتھ لگانے کا اختیار بھی کسی کسی کے پاس تھا۔ ان کا فون ان کے کمرے میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑا رہتا تھا۔ وہ لمبے لمبے قدم بھرتی کمرے میں گئی تھی اور موبائل اٹھا کر اسی انداز میں پلٹی تھی۔ انداز میں عجلت تھی اور لمبا دوپٹہ بھی قدموں سے لپٹ رہا تھا اس لیے صندل کے قریب آتے آتے وہ گرنے والی ہو گئی تھی۔ اس نے بمشکل اپنا توازن قائم کیا تھا تاہم فون پکڑاتے ہوئے اس کی انگلیاں صندل بی کی آستین میں اٹک گئی تھیں اور ان کی آستین ذرا سا اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ عام حالات میں وہ دستانے پہنے رہتی تھیں لیکن چونکہ ابھی صبح کا وقت تھا تو اس لیے بنا دستانوں کے ہی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے فون پکڑنے سے پہلے فوراً اپنی آستین درست کی تھی جو کافی اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ زہرہ کی نظر ان کی کلائی سے ہوتی ہوئی بازو تک گئی تھی۔ ان کے بازو پر لمبا سا انتہائی بھورے رنگ کا نشان تھا۔ ان کی رنگت اتنی کھلتی ہوئی تھی کہ یہ نشان بے حد نمایاں ہوتا تھا لیکن زہرہ نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے یہ جلے کا نشان لگا تھا۔

''یہ کیا ہوا صندل بی۔'' وہ پوچھ بیٹھی حالانکہ وہ ان سے اتنی بے تکلف نہیں تھی۔ صندل بی نے اپنی آستین کو بلا وجہ دوبارہ درست کیا تھا حالانکہ اب وہ درست ہی تھی۔

''کچھ نہیں۔ جاؤ تم۔'' وہ خفا سے انداز میں بولی تھیں جیسے یہ بات اچھی نہ لگی ہو۔ زہرہ خائف ہو کر واپسی کے لیے مڑ گئی۔ صندل بی فون ملانا چاہتی تھیں لیکن جانے کیوں ان کا ہاتھ آستین پر جم سا گیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم یہاں میرے سامنے ہو۔"

داؤد کو اس کے اس طرح آنے سے خوشی تو ہو رہی تھی لیکن وہ حیران بھی تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے سامنے بیٹھی ہے۔ وہ کیمپس میں تھا جب مہر کی کال موصول ہوئی کہ وہ فلاں فلاں جگہ پر کمیونٹی پارک میں موجود ہے اور اس کا انتظار کر رہی ہے۔

داؤد شام کو جاب بھی کرتا تھا لیکن وہاں سے آف کر کے وہ اس تک پہنچا تھا تو وہ اپنا چھوٹا سا سفری بیگ لیے بازو پر اپنی جیکٹ لٹکائے ہاتھ میں کتاب پکڑے بینچ پر بیٹھی تھی۔

"مہر ایسے کیسے۔ یہاں۔ اتنا اچانک؟" وہ اسے دیکھ کر خوش تھا لیکن اپنا تحیر بھی چھپا نہیں پایا تھا۔

مہر اپنی جگہ سے اٹھی اور مسکراتے ہوئے اس کے قریب آ گئی۔ اتنا قریب کہ داؤد کو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے گلے لگانا پڑا۔ آج سے پہلے وہ کبھی کسی لڑکی سے اس قدر قریب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ کچھ جھینپ بھی گیا تھا لیکن مہر بے انتہا خوش تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی دیکھ کر داؤد مزید کھل اٹھا تھا۔

"تمہاری خاطر تو میں مارس (مریخ) پر بھی جا سکتی ہوں داؤد۔ یہ تو بس لندن ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔ داؤد کا دل چاہا اپنے دائیں ہاتھ سے پس منظر میں نظر آنے والی زندگی کی ہر متحرک چیز کو روک کر اس سنہرے لمحے کو جامد کر ڈالے۔ پہلی محبت قیمتی ہوتی ہے لیکن پہلی محبت کا اعتراف قیمتی ہی نہیں منفرد بھی ہوتا ہے۔ محبت جب الفاظ میں ڈھل کر اعتراف کی صورت سماعتوں میں ڈھلنے لگتی ہے تو اچھا خاصا گوشت پوست کا انسان بادل کا ٹکڑا بن کر ہوا میں رقص کرنے لگتا ہے۔ داؤد کو بھی اس لحہ یہی محسوس ہوا کہ وہ انسان نہیں رہا بلکہ کسی عقاب کا ہلکا پھلکا پر بن گیا ہے۔

یہ اعتراف وہ پہلے بھی کر چکی تھی۔ وہ داؤد کو اپنی زندگی میں اس کی اہمیت کا احساس گاہے بگاہے دلاتی رہتی تھی۔ وہ اس کی خاطر بہت کچھ کر سکتی تھی اور وہ اسی کی خاطر بہت کچھ کر رہی تھی۔ وہ ایک قریبی فاسٹ فوڈ کی چین میں آ بیٹھے۔ کھانا کھایا، کافی پی۔

"میرا ایک ماڈلنگ پراجیکٹ ہے۔ دبئی بیسڈ میک اپ برانڈ کے ساتھ۔ وہ ماریشس جانا چاہ رہے تھے لیکن میرے بار بار کہنے پر آخری وقت میں لندن کا پلان کر لیا۔"

مہر نے اسے بتایا تھا۔ داؤد کو کافی تسلی ہوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رہائش وغیرہ کے لیے اس پر انحصار نہیں کر رہی تھی۔ داؤد نے دل ہی دل میں جوڑ توڑ کر لیا تھا کہ اسے کیسے کس جگہ ٹھہرانا ہے مگر پھر بھی وہ شخص ایک طالب علم تھا جس کے پاس پہلے ہی فنڈز کافی محدود ہوتے تھے اور یہی حال مہر کا بھی تھا اگرچہ اس کا اس طرح سے لندن آنا کوئی ایسی ناممکن بات نہیں تھی۔ وہ شہریت کے حساب سے آئرش تھی۔ اسے انٹری ویزہ کے حصول کے لیے لمبے چوڑے مسائل سے گزرنا نہیں پڑتا تھا مگر اس کے باوجود اس کا لندن آ جانا اس قدر آسان نہیں تھا۔ وہ بھی فنڈز کی کمی کا شکار رہتی تھی اور اکثر داؤد کو بتاتی رہتی تھی کہ بارہ گھنٹے والی جاب کے باوجود اس کے خرچے کافی زیادہ ہیں۔ ماڈلنگ سے وہ اچھا کما رہی تھی لیکن اس کی اپنی اسکن کیئر اور گرومنگ وغیرہ پر بھی کافی پیسے خرچ ہو جاتے تھے لیکن ان سب کے باوجود یہ داؤد کی محبت تھی کہ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ کیوں ہواؤں میں نہ اُڑتا۔

داؤد کو اتنی اہمیت زندگی میں کبھی اس کی ممی نے بھی نہیں دی تھی۔ اس کے باقی دوست اور کزنز نے بھی کبھی اسے اتنا معتبر محسوس نہیں کروایا تھا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کا معترف ہوا جاتا تھا۔ اس لڑکی کی وجہ سے اسے اپنا آپ، اپنی زندگی، اپنے حالات سب اچھے لگنے لگتے تھے۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور یہ محبت ہر گزرے لمحے

کے ساتھ عقیدت کا لبادہ اوڑھتی جاتی تھی اور محبت جب عقیدت کے پیراہن میں ڈھلنے لگے تو عشق بن جاتی ہے۔

داؤد کو مہرافروز سے عشق ہوتا جا رہا تھا جس کے چنگل سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔

☆☆☆

"آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے ممی!"

داؤد نے پُر مسرت لہجے میں اپنی ممی کو بتایا تھا۔ ان دنوں موبائلز اور انٹرنیٹ کی دستیابی عام سی بات ہو چکی تھی اور فاصلوں کی فصیل کو پاٹنا بس چٹکیوں کا کام رہ گیا تھا لیکن وائی فائی جیسی سہولت ابھی میسر نہیں ہوئی تھی۔

داؤد اور مہر نے سارا دن لندن کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے گزارا تھا۔ رات کو مہر اپنی رہائش گاہ پر واپس جانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن داؤد اسے اپنے ہاتھ سے بنا ڈنر کھلانا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنے ہاسٹل کے کمرے میں لے آیا تھا اور آتے ساتھ سب سے پہلے اس نے اپنی ممی کو فون کیا تھا۔ یہ آج تک نہیں ہوا تھا کہ داؤد کی بات پر اتنا خوش ہوا اور اس نے ممی سے شیئر نہ کیا ہو۔ ان کی آواز بجھی بجھی سی تھی۔

"داؤد! تم واپس آجاؤ پلیز!" ان کے لہجے کا غیر معمولی دکھ اور بے پناہ اداسی بھی داؤد کو متنبہ نہ کر پائی یا شاید اپنی خوشی میں وہ محسوس نہیں کر پایا تھا۔ اس نے مہر کو ہاتھ کے اشارے سے بولنے پر اکسایا اور ساتھ ہی موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا

"کیسی ہیں آپ آنٹی؟" اس نے ہنسی چھپاتے ہوئے سادہ سے الفاظ میں پوچھا تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

"داؤد! تم واپس آجاؤ پلیز۔ چھوڑ دو سب کچھ۔ اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو فوراً واپس آجاؤ۔"

وہ جیسے ہسٹریا کا شکار ہوتی جا رہی تھیں۔ اب کی بار داؤد ان کے لہجے کے بوجھل پن سے کچھ پریشان ہوا تھا۔ اس نے مہرافروز کا چہرہ دیکھا

"میں مہرافروز ہوں آنٹی۔" اس نے موبائل بالکل چہرے کے سامنے کر لیا تھا تاکہ ان کی آواز کو صحیح سے سن سکے۔

"شٹ اپ یو بچ۔ مجھے آنٹی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ فون میرے بیٹے کو دو۔"

وہ غرا کر بولی تھیں۔ ان کی آواز میں اتنی کاٹ، اتنا غصہ تھا کہ فون مہر کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ داؤد کمرے کے اس حصے میں تھا جہاں اوون اور الیکٹرک پلیٹ وغیرہ پڑے تھے۔ ممی کی اس قدر ناراض آواز نے اسے نا صرف حیران کیا تھا بلکہ وہ شرمندہ سا ہو کر دوبارہ مہر کے قریب آیا تھا۔

"ممی۔ آپ ایسے کیوں بات کر رہی ہیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو۔" وہ انتہائی پریشان ہو کر بولا تھا۔

"داؤد! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ ہوا تمہیں ہے۔ جادو کر دیا ہے اس چڑیل نے تم پر۔ مجھے بتاؤ، یہ لڑکی اس وقت تمہارے کمرے میں کیا کر رہی ہے۔ کیوں ہے یہ تمہارے پاس۔ تمہیں کیوں میری بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ڈائن ہے۔ کھا جائے گی تمہیں کچا۔ چھین لے گی تمہیں مجھ سے۔ کیوں نہیں سمجھتے تم...... تم بس واپس آجاؤ۔ چھوڑ دو ہر چیز کو۔ یہاں سے نکل آؤ۔ میرے پاس واپس آجاؤ۔"

داؤد نے چونکہ اسپیکر آن کر رکھا تھا اس لیے ان کا ایک ایک لفظ مہر کو سنائی دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ ذلت کے احساس سے سرخ ہوا جا رہا تھا اور داؤد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال کو کیسے سنبھالے۔

"ممی! آپ کچھ غلط سمجھ رہی ہیں۔ یہ مہر ہے۔ اپنے کسی پراجیکٹ کے لیے لندن آئی ہے تو مجھ سے ملنے

آ گئی۔اس لیے۔"

اسے مناسب الفاظ بھی نہ مل پا رہے تھے جو اس کی ممی کے مزاج کو ٹھنڈا کر دیتے۔

"داؤد! تم کب تک بدھو بنتے رہو گے۔کوئی پراجیکٹ نہیں ہے اس کا۔یہ صرف میری ضد میں یہ سب کر رہی ہے۔مجھے نیچا دکھانے کو کر رہی ہے۔اسے پتا ہے، میرے پاس صرف میرا بیٹا ہی ہے اور یہ اسے بھی چھین لینا چاہتی ہے۔یہ تم سے کہتی ہو گی اسے تم سے محبت ہے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے مجھ سے نفرت ہے۔یہ میری نفرت میں تمہیں ایک کھلونے کی طرح استعمال کر رہی ہے۔کھلونا تو پھر بڑی بات ہے۔تم ایک اوزار کی طرح استعمال کیے جا رہے ہو۔اپنی طرف سے وہ میری مزمت کر رہی ہے اور وہ بھی میری اپنی اولاد کو استعمال کر کے۔کیوں نہیں سمجھتے تم۔کیوں اتنے بونگے ہو تم داؤد۔"

وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہی تھیں۔وہ پہلے بھی خفگی میں داؤد پر چلاتی تھیں لیکن ان کا یہ انداز اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔وہ ان کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ پر پہلے سے زیادہ زمین میں دھنستا جا رہا تھا۔مہر کی آنکھیں بھی اب خفگی اور ذلت کے احساس سے جلنے لگی تھیں

"داؤد! تم بات کرو۔میں ابھی آتی ہوں۔" وہ یک دم اٹھی تھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔داؤد تذبذب کے عالم میں تھا۔وہ مہر کا ہاتھ تھام کر اسے روکنا چاہتا تھا لیکن ممی کے الفاظ اور انداز نے اس کے اعصاب کو بالکل مفلوج کر دیا تھا۔

"ممی! ایسے کیوں کہہ رہی ہیں۔کیا ہو گیا ہے آپ کو۔طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" وہ لاچاری کے عالم میں بولا تھا۔

"داؤد! تم ابھی بھی مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ مجھے کیا ہوا ہے۔کچھ نہیں ہوا مجھے۔تم بس اس لڑکی سے دور رہو۔اس کو نکلوا لو اپنے کمرے سے۔یہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔میں نہیں چاہتی، تم اس سے ملو یا کوئی بھی رابطہ رکھو۔"

داؤد بے بسی کے عالم میں دروازے کی سمت دیکھ رہا تھا جہاں سے مہر باہر نکل کر گئی تھی۔اسے باہر گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے۔وہ ابھی تک یقیناً کاریڈور میں ہی ہو گی۔داؤد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر باہر جاتا اور اسے واپس لے آتا لیکن اس کی سماعتیں ممی کی آواز کے ساتھ جڑی تھیں۔دل کا نصف حصہ اگر مہر افروز کے لیے تڑپ رہا تھا تو بقیہ نصف ممی کے لیے ہلکان تھا۔

"مجھے بتائیں تو سہی۔ہوا کیا ہے۔آپ اتنا اوور ری ایکٹ کیوں کر رہی ہیں ممی! مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ پیشانی پر ہاتھ رگڑتا ہوا بات کر رہا تھا۔پریشانی کے عالم میں دو قدم آگے بڑھتا تھا اور دو قدم پیچھے۔ممی کی باتیں بے سروپا تھیں۔نہ سمجھ میں آنے والی۔

"اوور ری ایکٹ...... داؤد اسے اوور ری ایکٹ کہتے ہو تم۔میری زندگی کی کمائی۔میری جمع پونجی ہو تم داؤد! وہ چھین رہی ہے تمہیں مجھ سے۔" وہ اب رونے لگی تھیں۔

"وہ بدروح ہے داؤد۔بلا ہے۔اسے غیب کا علم ہو جاتا ہے۔میں جو سوچتی ہوں جو کرنا چاہتی ہوں۔اسے پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔کیسے پتا چل جاتا ہے داؤد۔وہ کالا جادو کرتی ہے داؤد۔اس کے وار سے بچ کر چلو داؤد۔دور رہو اس سے۔پلیز چھوڑ دو اسے۔پلیز۔"

"ممی۔کہاں سے آ جاتی ہیں یہ باتیں آپ کے دماغ میں۔پہلے تو کبھی۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پہلے کبھی اس لیے ایسی باتیں نہیں کی تھیں کیونکہ پہلے ہماری زندگیوں میں مہر افروز نام کی چڑیل نہیں تھی۔

اس کتیا نے ایسا کر دیا ہے مجھے۔ اس غلیظ لڑکی کی وجہ سے اس مقام پر آ کھڑی ہوئی ہوں میں کہ اپنی ہی اولاد کی منتیں کرنی پڑ رہی ہیں مجھے۔"

وہ اب ذرا سنبھل چکی تھیں اور آواز میں آنسوؤں کا غلبہ ذرا کم محسوس ہوتا تھا لیکن مہر افروز کے لیے ان کی نفرت بالکل کم نہیں ہوئی تھی۔

داؤد نے دیوار پر لگے کلاک میں وقت دیکھا۔ اب تو مہر کو باہر گئے پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ اتنا وقت ہی لگتا تھا ہاسٹل کے گیٹ سے باہر نکلنے میں اور وہاں سے مزید پانچ منٹ میں وہ ٹرام اسٹیشن پہنچ جاتی۔ وہ اسے کہاں ڈھونڈے گا۔ وہ تو اپنا بیگ بھی کمرے میں ہی چھوڑ گئی تھی حتیٰ کہ اس کی جیکٹ بھی کرسی کے ہینڈل پر ہی پڑی تھی۔ لندن کا موسم آج کل اتنا سرد نہیں تھا مگر پھر بھی گھر سے باہر رات کے وقت بنا جیکٹ پانچ منٹ کی واک خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

"مہر بیمار پڑ سکتی تھی۔" پہلا خیال اس کو یہی آیا تھا اور مہر کی تکلیف کے خیال سے بھی اس کا دل تڑپنے لگتا تھا۔

"ممی! آپ رکیں، میں آپ کو بعد میں فون کرتا ہوں۔" اس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"داؤد...... رکو...... میری بات سنو...... فون بند مت کرو۔ بات کرو مجھ سے۔"

وہ زور زور سے چلاتے ہوئے اسے روک رہی تھیں لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی تھی۔ ممی سے پہلے مہر کو روکنا ضروری تھا پھر ان دونوں سے بات کی جا سکتی تھی، اس نے ان کی دوسری کوئی بات سنے بغیر فون بند کیا تھا اور تیزی سے چلتا ہوا دروازے تک گیا تھا پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹا تھا اور اپنی ہینگ کی ہوئی جیکٹ کھینچ کر اتارتے ہوئے کرسی پر پڑی مہر کی جیکٹ بھی اٹھائی تھی اور باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

"تم باہر کیوں آ گئیں۔"

داؤد کی توقع کے برعکس وہ ہاسٹل کے وسیع لان میں بینچ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی مل گئی تھی۔

وہ ہانپتا ہوا اس کے قریب آیا تھا اور اس کی جیکٹ کو اس کے کندھوں پر پھیلا دیا تھا۔ اس کے وجود میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ وہ اگر چہ نہیں تھی لیکن خفا لگتی تھی اور داؤد کو اس کی خفگی کے خیال سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ پانچ دس منٹ پہلے اس کے اندر جو بےفکری و سرمستی چھائی تھی، وہ سب کی سب ہوا میں اڑنچھو ہو گئی تھی۔ اسے ممی کے رویے پر بے حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

"ممی کو ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں ان کے......"

وہ بمشکل اتنے ہی الفاظ مجتمع کر پایا تھا لیکن مہر نے وہ بھی ٹھیک سے ادا کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

"نہیں داؤد! چپ رہو۔ تم کب تک ان کے رویے کی وضاحت کرتے رہو گے۔ یہ تو ہر بار کرتی ہیں وہ۔ تمہارے لیے کی گئی میری ہر فیور، میرا ہر عمل، میری ہر خوشی انہیں بُری لگتی ہے۔ وہ میری ہر بات سے، مجھ سے، میرے وجود سے چوتی ہیں۔ انہیں میں اچھی ہی نہیں لگتی۔"

اس کی نظروں کا زاویہ سامنے کہیں کسی نقطے پر مرکوز تھا۔ وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اس کے لہجے میں استحکام تھا۔ وہ یہ باتیں جذباتی ہو کر نہیں کر رہی تھی۔ وہ یہ باتیں اس انداز میں کر رہی تھی جیسے کوئی انسان اپنے اگلے لائحہ عمل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو زیر غور لاتے ہوئے یاد کرتا ہے۔

"ایسا نہیں ہے مہر! اچھی لگتی ہو تم ممی کو۔ دراصل وہ ہائپر ٹینشن کی مریضہ ہیں۔ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے تو وہ مجھ سے بھی اسی انداز میں بات کرنے لگتی ہیں۔" داؤد نے اپنی ایک ٹانگ بینچ کے اوپر رکھ لی تھی اور بالکل

اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بے بس لہجے میں بولا تھا لیکن مہر نے جیسے ایک لفظ نہیں سنا تھا۔

"پہلے دن سے وہ مجھ پر تنقید کرنے کا موقع جانے نہیں دیتیں۔ میری عادات سے انہیں نفرت ہے۔ میری خود اعتمادی کو وہ ہٹ دھرمی کہتی ہیں۔ میرے جاب کرنے سے انہیں الجھن ہوتی ہے۔ میرے ماں باپ کا میرے ساتھ ٹریٹمنٹ انہیں لاپروائی نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ میرا لباس، میرا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا کچھ بھی کبھی ان کی گڈ بک میں نہیں رہا۔ اور میں۔ میں یہاں کیا کر رہی ہوں۔ ان کے بیٹے کی خاطر اس ٹھنڈ میں بینچ پر بیٹھی کیا کر رہی ہوں میں۔ کیوں آئی ہوں میں یہاں۔ نہیں آنا چاہیے تھا مجھے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں با آواز بلند باتیں کرتی چلی جا رہی تھی۔ داؤد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا لیکن وہ ساکت بیٹھی رہی۔ داؤد نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے جو بے حد سرد ہو رہے تھے۔

"مہر پلیز۔ میں معافی مانگ تو رہا ہوں تم سے ان کی طرف سے۔ آئی ایم سوری مہر۔ تم ادھر دیکھو میری طرف۔ پلیز۔" وہ رونکھا ہوا جا رہا تھا۔ مہر نے جامد سا چہرہ لیے گردن اس کی جانب کی تھی۔

"میں ایسی کیوں ہو گئی مجھے واقعی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ انسان کو اپنی سیلف ریسپکٹ کو اتنا سستا نہیں کرنا چاہیے کہ ہر مقام پر ذلت اٹھانا پڑے۔ اور میرے ساتھ کسی نے بھی ایسا کیا بھی نہیں ہے۔ لیکن تمہاری ممی......"
وہ ذرا سی دیر کو چپ ہوئی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ داؤد کو لگا وہ اپنے حواس کھو رہی ہے، اس نے اس کے ہاتھوں کو مزید سختی سے تھام لیا۔

"وہ کیوں کرتی ہیں میرے ساتھ ایسا۔ ہر بار۔" وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی پھر اس نے بھی ایک ٹانگ بینچ پر رکھ کر اپنا رُخ مکمل طور پر اس کی جانب موڑا اور انتہائی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کیا صرف اس لیے کہ ان کو اندازہ ہے کہ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ تمہاری خاطر میں ان کی سب کڑوی کسیلی سنتی رہوں گی۔ سب برداشت کرتی رہوں گی۔ نہیں داؤد۔ ایسا نہیں ہے۔ میرے صبر کی بھی ایک حد ہے۔ اور آج وہ ختم ہو گئی۔ تم ان کو مبارک دے دینا کہ مہر ان کی زندگی سے نکل گئی ہے۔ بہت محبت ہے مجھے تم سے۔ لیکن محبت میرے لیے عزت سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ میں یہ روز روز کا ڈرامہ نہیں برداشت کر سکتی۔ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ آنٹی مجھے تمہاری زندگی سے نکالنے کے لیے اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہیں۔ انہوں نے آنٹی صبیحہ سے کسی خاتون کا نمبر بھی لیا تھا جو تعویز لکھ کر دیتی ہے۔ تمہیں پتا ہے نا آنٹی صبیحہ کا بیٹا میرا کلاس فیلو تھا۔ مجھے خود اس نے ساری تفصیل بتائی ہے۔ یہ تو حال ہے ان کا۔ اتنی پڑھی لکھی ہو کر ایسی حرکتیں کرتے ہوئے ان کو شرم بھی نہیں آتی۔ لیکن چلو ایسے تو ایسے ہی سہی۔ ختم کرتے ہیں اس رشتے کو۔ یہیں اسی مقام پر۔ چلو آؤ میں تمہارے روم سے اپنا سامان اٹھا لوں۔" اپنے ہاتھ چھڑواتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مہر! خاموش رہو تم۔ کیسے کہہ سکتی ہو تم یہ سب...... کیسے ختم کر سکتی ہو تم یہ سب۔ اور پھر تم کہہ دو گی کہ سب ختم ہو گیا تو کیا واقعی سب ختم ہو جائے گا۔ کیا میرے دل میں تمہارے لیے جو محبت ہے وہ اس طرح کہہ دینے سے ختم ہو جائے گی۔ مہر! یہ زندگی ہے۔ ہماری زندگی۔ تمہاری اور میری۔ یہ ڈرامہ نہیں ہے کہ تم بس ریموٹ پر ایک بٹن پریس کرو گی اور سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" وہ بات کرتے کرتے واقعی رونے لگا تھا۔ مہر بے چارگی سے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

"یک طرفہ محبت ایسی ہی ہوتی ہے داؤد! وہ ختم نا بھی ہو تب بھی ایک وقت پر آ کر جھنجھل جاتی ہے۔ تم سمجھو میں نے سنبھلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اکیلی اس محبت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔" اس کی آنکھیں بھی بھرنے لگی تھیں۔ داؤد نے دوبارہ سے اس کے ہاتھ تھام لیے اور اس نے اسے ایسا کرنے سے روکا نہیں تھا۔

"اکیلی کیوں مہر! اکیلی کیوں کرو گی تم یہ سب۔" مہر نے اس کی بات کاٹی۔

”کیونکہ تم نے کبھی کہا ہی نہیں داؤد۔ کبھی ظاہر ہی نہیں کیا کہ میں تمہارے لیے اتنی ہی اہم ہوں جتنا تم میرے لیے اہم ہو۔ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتے بھی ہو یا نہیں۔“ داؤد بینچ پر کھسک کر اس کے قریب ہوا اور اب کی بار اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”میں کرتا ہوں مہر! تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے بہت محبت نہیں کرتا۔ میں نے تو کبھی اپنا فیوچر تمہارے بغیر پلان کیا ہی نہیں۔ میں تو ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس میں تم نہ ہو۔ آئی لو یو سو مچ مہر۔“ وہ اسے یقین دلا رہا تھا۔ مہر کی بھری بھری آنکھیں چھلکنے لگیں۔ وہ اس کے گلے لگ گئی۔ داؤد نے اس کے وجود کے گرد اپنی بانہیں پھیلا کر گھیرا بنا لیا اور اس کی پشت سہلانے لگا۔

”تم بہت اہم ہو میرے لیے۔ بے حد اہم۔ دوبارہ کبھی ایسے مت سوچنا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ تمہارا ساتھ میرے لیے زندگی سے بھی قیمتی ہے۔ زندگی ختم کرو گی کیا میری؟“ اس کی چمکتی بھیگی آنکھیں مسکراہٹ کے رنگ سے جھلملا رہی تھیں۔ مہر نے اپنے انداز نشست میں ذرا تبدیلی نہیں کی تھی۔ اس کے مردہ جسم میں جیسے دوبارہ روح پھونک دی گئی تھی۔ وہ بے حد پُر جوش اور خوش باش نظر آنے لگی تھی۔ حالت داؤد کی بھی ایسی ہی تھی۔ اس کے بھی قدم زمین پر نہیں جم رہے تھے۔ محبت کے اس قدر واضح اعتراف نے ان دونوں پر ہی جادو کر دیا تھا۔

”تمہاری نہیں لیکن اپنی زندگی ضرور ختم کر لیتی۔ تمہارے بغیر زندہ رہ کر مجھے کرنا بھی کیا ہے؟“ مہر کہہ رہی تھی۔

”نہیں۔ ایسی نوبت آئے گی ہی نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے مرتے دم تک۔“ داؤد نے بھیگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔ مہر چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا

”اور تمہاری ممی؟“ داؤد جو اس کی قربت سے نہ صرف مسرور ہوا جا رہا تھا بلکہ اس کے اعتماد کا لیول بھی کافی اونچا ہو چکا تھا۔ پہلی محبت اس قدر طاقت ور ہوتی ہے کہ انسان سدھ بدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اسے بہت سے ناممکن امر ممکن نظر آنے لگتے ہیں اور داؤد کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔

”تم ان کی فکر مت کرو۔ انہیں میں سنبھال لوں گا۔“ اس نے دعوا کیا تھا۔ مہر نے دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔ اس کے پورے وجود سے اطمینان اور سرور چھلکنے لگا تھا۔

☆☆☆

”ممی! آپ میری بات پوری طرح سن تو لیں پلیز۔“

داؤد نے گڑگڑاتے ہوئے فون پر التجا کی تھی۔ اتنی دور سے وہ ان سے فون پر ہی بات کر سکتا تھا لیکن وہ اس کی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ دو بار انہوں نے فون کاٹ دیا تھا اور تیسری بار جب وہ بات کرنے کو تیار ہوئی تھیں تو ان سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایک جملہ بولتی تھیں اور پھر ان کے رونے کی آواز آنے لگتی تھیں۔ داؤد کی کسی وضاحت کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔ مہر داؤد کے ساتھ ہی بیٹھی تھی اور اسے داؤد کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر پریشان ہو رہا ہے۔

”اب بچ کیا گیا ہے سننے والا داؤد! سب ختم ہو چکا ہے۔ وہ لڑکی تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس حد تک ذلت میں، گر چکے ہو تم۔ مزید کیا رہ گیا ہے جو میں سنوں؟“ انہوں نے سسکی بھری پھر بولیں

”بیس سال داؤد......! بیس سال......اپنی زندگی کا سنہرا ترین دور دیا تھا میں نے تمہیں۔ اپنی ذات کی نفی کر کے اپنے ساتھ رکھا تھا تمہیں۔ جب تمہارا ذلیل باپ تمہیں چھوڑ کر کینیڈا فرار ہو گیا تھا۔ یہ میں تھی جس نے تمہیں پالا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ ایک سنگل مدر کس قدر اذیت سے اپنی اولاد پالتی ہے۔ باقی مائیں دودھ پلا کر بچے پالتی ہوں گی۔ سنگل مائیں تو اپنا کلیجہ کھلا کر اولادوں کو بڑا کرتی ہیں اور اولادیں یہ صلہ دیتی ہیں جو تم نے مجھے دیا ہے۔“

وہ پھر رونے لگی تھیں۔ داؤد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ طعنے وہ بچپن سے سن رہا تھا۔

”تم نے سب ختم کردیا داؤد! میرا غرور۔ میری سیلف ریسپیکٹ۔ کچھ باقی نہیں بچا میرے پاس۔ ایسا کیسے کرسکتے تھے تم داؤد!“

وہ ایک بار پھر رُکی تھیں۔ داؤد کا چہرہ سُرخ ہوا جاتا تھا۔ زندگی نے اسے کبھی کھل کر ہنسنے کھلکھلانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اس کی زندگی میں ہر فیصلہ عجب کشمکش میں ہوا تھا۔

”لیکن تم کرسکتے تھے۔ تم ہی کرسکتے تھے یہ سب۔ اولاد کس کی ہو تم۔ ایک سانپ کی۔ جیسا باپ۔ ویسی اولاد۔ تمہاری رگوں میں انسانی خون نہیں ہے۔ سانپ کا خون ہے۔ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر ہی چلنا تھا تمہیں۔ جیسے اس کمینے نے میری زندگی برباد کی تھی۔ ویسے ہی تم نے بھی کردی۔ میری ہر قربانی، میرے سارے ایثار کا اچھا بدلہ دیا ہے تم نے۔“

وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی تھی۔ داؤد کی رگوں میں خون کی روانی تیز ہوئی جارہی تھی اور چہرہ ایک دم سُرخ ہوچکا تھا۔

”اس سے بہتر تھا، میں تمہیں پیدا ہوتے ہی کسی جھولے میں ڈال دیتی۔ وہیں پلتے تم۔ اور وہیں گل سڑ کر ختم ہوجاتے۔ تم جیسے باسٹرڈ یہ ڈیزرو ہی نہیں کرتے کہ انہیں ماؤں کی گود لاڈ پیار اور آسائشیں میسر ہوں۔ تم دفع ہوجاؤ میری زندگی سے۔ یو سن آف بچ۔“

وہ ابھی بھی گزشتہ رات کی طرح بنا سوچے سمجھے بولے چلی جارہی تھیں

”ممی! اچھی لڑکی ہے وہ۔ آپ ایک موقع تو دیں۔ آپ ایک بار میری بات تو سُنیں۔“

وہ منت سماجت پر اتر آیا تھا مگر وہ سن نہیں رہی تھیں۔ ان کی آواز آنا بھی بند ہوچکی تھی۔

”وہ نہیں سنیں گی۔ کال کٹ چکی ہے داؤد۔“ مہر نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر میز پر رکھ دیا تھا۔ داؤد دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

”وہ تمہیں ایموشنلی بلیک میل کررہی ہیں۔ لیکن وہ تمہاری ممی ہیں داؤد! آج نہ سہی کل سہی۔ ان کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ ہم انہیں مل کر منالیں گے۔“ مہر نے تسلی دی تھی۔

”نہیں مہر! ان کو منانا اتنا آسان نہیں ہے۔ تم ان کو بمشکل دو سالوں سے جانتی ہو۔ میں ان کی اولاد ہوں، انہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ بچپن سے لے کر اب تک مجھے ایسے ہی بلیک میل کرتی آئی ہیں۔ میری ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو میرے ہی لیے اذیت بنادیتی ہیں وہ۔ مائیں ایسی نہیں ہوتیں۔ ماؤں کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“

وہ جذبات پر قابو نا رکھ سکا تھا اور رونے لگا تھا۔

”میرے ڈیڈی نے کبھی میری شکل نہیں دیکھی۔ میں ان سے اپنے ہوش میں تو کبھی ملا بھی نہیں ہوں، مگر زندگی کے ہر مرحلے پر انہوں نے مجھے ان ہی کے نام کا طعنہ دیا ہے۔ کبھی باسٹرڈ کہہ کر، کبھی سن آف بچ کہہ کر وہ ہمیشہ میری سیلف ریسپیکٹ کو ہرٹ کرتی آئی ہیں۔“

وہ دو جملے بولتا تھا اور پھر اس کی آنکھیں نم ہوجاتی تھیں۔ مہر نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ داؤد اپنے دل کا غبار نکال لے۔

”انہیں خوش رکھنے کے لیے میں نے ہمیشہ اپنی ہر خواہش قربان کی ہے۔ ہر ضد سے منہ موڑا ہے۔ انہوں نے جو کھلایا، کھالیا۔ جو پلایا، پی لیا۔ دوست وہ بنائے جو انہیں پسند آئے۔ کپڑے وہ پہنے جو انہوں نے سلیکٹ کیے اور اب وہ تم سے خائف ہوگئی ہیں۔ وہ تمہیں بھی مجھ سے چھین لینا چاہتی ہیں۔ اپنی ہی زندگی میں میرا وجود تو جیسے ہے ہی نہیں۔ تم بتاؤ مہر! میں خود کہاں ہوں۔ کہیں بھی نہیں۔ اور پھر بھی وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ میں کب تک اپنی خواہشات سے دست بردار ہوکر انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہوں۔ میں تھک گیا ہوں مہر! بے حد تھک گیا ہوں۔“

سر کو دونوں ہتھیلیوں میں گرائے وہ لاچار بیٹھا تھا۔
"اب کی بار آنٹی یہ نہیں کر پائیں گی داؤد! میں تمہیں چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ مر کر بھی نہیں۔ وہ چاہے کسی بھی بنگالی بابا کا تعویذ لے آئیں۔ لیکن اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو پائیں گی۔"
وہ پُرعزم انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دے رہی تھی۔ داؤد کچھ نہیں بولا۔ وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا پھر اس نے سر اٹھا کر مہر کو دیکھا تھا۔
"مہر! تم مجھ سے شادی کرو گی۔ ابھی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ مہر کو جھٹکا لگا تھا۔
"شادی......؟" اتنی دور تک نہیں سوچا تھا ابھی اس نے۔
"ہاں۔ ابھی...... ابھی نہیں کر پایا تو کبھی نہیں کر پاؤں گا۔ میں جانتا ہوں ممی مجھے پھر بلیک میل کرلیں گی اور میں تمہیں کھو دوں گا مہر! میں تمہیں کھو دوں گا۔" وہ کسی ضدی بچے کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر منت کرنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ مہر کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔
"داؤد! میں کہہ تو رہی ہوں کہ میں سب سنبھال لوں گی۔ تم فکر کیوں کرتے ہو۔ شادی کے لیے ابھی ہم چھوٹے ہیں۔ ہمارا کوئی کریئر نہیں ہے۔ اور پھر میرے بھی تو پیرنٹس ہیں۔ میں بھی تو ان کی اجازت کی پابند ہوں۔" وہ اس بات کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔
"مہر! ایسے مت کرو۔ پلیز...... اس معاملے کو پار ہو لینے دو اب۔ ہم اگر آج یہ فیصلہ نہ کر سکے تو کل کو ہمارے بڑے مل کر ہمیں بلیک میل کرنا شروع کر دیں۔ ہم دونوں اٹھارہ سال سے بڑے ہیں۔ لیگلی ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن پھر بھی تم کہو تو میں آنٹی انکل سے بات کر لیتا ہوں۔"
داؤد کی دماغی حالت کافی ابتر ہونے لگی تھی۔ مہر اس کی جانب دیکھتی رہی پھر اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
"تھینک یو۔ اینڈ آئی لو یو۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتی۔" وہ اس کا ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام کر بولا تھا۔

☆☆☆

"یہ فارم پہلے فل کرنا پڑے گا۔"
نکاح کی رجسٹریشن کے لیے وہ دونوں آفس میں موجود تھے۔ نکاح مسجد میں ہی ہونا تھا لیکن باقی کی کارروائی کے لیے انہیں آفس میں اپنا سارا ڈیٹا جمع کروانا تھا۔ وہ دونوں ہی اپنا اپنا فارم فل کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد داؤد نے شیریں کے ہاتھ سے فارم لے کر جمع کروانے سے پہلے عادتاً سرسری نظر ڈالی تھی۔
"یہ کس کا نام ہے؟" نام والے خانے کو دیکھ کر اس نے حیرانی سے مہر افروز کی شکل دیکھی تھی۔ وہ عام سے انداز میں مسکرائی پھر کندھے اُچکا کر بولی۔
"یہی میرا اصلی نام ہے۔ لیکن میرے سب دوست مجھے مہر ہی کہتے ہیں۔ اور مجھے بھی اسی نام کی عادت ہو چکی ہے۔" داؤد نے سر ہلایا پھر فارم پر لکھا اس کا نام پڑھا تھا۔
"شیریں محمد خلیق۔" پھر اس نے مسکرا کر اسے دیکھا
"مہر افروز۔ تم میرے لیے مہر افروز تھی اور مہر افروز ہی رہو گی۔"

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اماں مہراں ساگ کے پتیلے میں ڈوئی چلاتے ہوئے سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ آگ جل رہی تھی۔ پتیلے میں پتوں کے درمیان سے جوش مارتا پانی سبز دکھائی دیتا تھا۔ آگ مدھم ہونے لگتی تو اماں مہراں لکڑیوں کو ذرا آگے سرکا دیتی شعلے پھر سے بھڑکنے لگتے۔ ایک ایسی ہی آگ اماں کے دل میں برسوں سے لگی تھی۔

دھویں کی دیوار کے پار اماں کے چہرے کی جھریوں میں یادوں کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ آنکھوں کی دھندلاہٹ میں کرب کا دھواں شامل تھا۔

رات کا مہمان ابھی تک سویا ہوا تھا۔ وہ کئی بار دیکھ آئی تھی۔ اس نے کروٹ تک نہ بدلی تھی۔

''نہ جانے کب کا تھکا ہوا ہے بے چارہ!'' یہی سوچ کر اماں نے اسے نہیں جگایا۔ رات کا منظر بار بار ذہن کے پردے پر چل رہا تھا جب بارہ بجے کے قریب گھر کے دروازے پر دستک ہوئی تو اماں کو بہت حیرت ہوئی کہ رات کے اس پہر ان کے گھر کون آسکتا ہے۔ خوف زدہ ہونا تو کوئی معنی ہی نہ رکھتا تھا کہ اس ویران کھنڈر نما گھر میں اماں نے اتنے ماہ سال تنہا گزارے تھے کہ درودیوار اور تنہائی غمگسار لگتی۔

''کون ہے؟'' اماں نے دروازے پر جا کر پوچھا۔

''مسافر ہوں!'' جواب ملا، اور اماں مہراں نے فوراً دروازہ کھول دیا، آنے والا اجنبی تھا سوٹڈ بوٹڈ نوجوان جس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔

''تم کون ہو بیٹا! کہاں سے آئے ہو؟''

اماں کے سوال میں اجنبی کے شناسا نکل آنے کی آس چھپی۔

''میں بہت دور سے آیا ہوں اماں! یہاں گاؤں میں کچھ رشتہ دار تھے میرے، ان سے ملنا تھا۔ دس بجے ایئرپورٹ پہنچا اور یہاں تک آتے ہوئے یہ وقت ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا اس وقت ان کا گھر کیسے تلاش کروں تو میں نے آپ کے دروازے پر دستک دے دی۔''

نوجوان نے ذرا سا پریشان ہو کر وضاحت دی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، بہت اچھا کیا جو میرے غریب خانے پر آگئے۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ آؤ آرام کر لو صبح تمہارے رشتہ داروں کا پتا کروا لیں گے۔ آؤ...... اندر آجاؤ۔''

اماں نے کہتے ہوئے ہٹ کر اسے راستہ دیا تو وہ حیران ہوتا ہوا اندر داخل ہوا۔ گھر نہایت بوسیدہ سا لگ رہا تھا ایک کچا کمرہ اور ایک کوٹھری دوسرا کوئی فرد اسے نظر نہیں آیا۔

''کھانا کھاؤ گے بیٹا؟''

''نہیں! بس میں آرام کروں گا۔''

اماں مہراں نے فوراً بستر لگا دیا۔ ''تم تو فوم والے گدوں پر سوتے ہو گے بیٹا! اب پتا نہیں اس بستر پر تمہیں نیند آئے گی یا نہیں!''

اماں کی الجھن پر وہ مسکرایا۔

''بہت اچھے سے آئے گی، پتا ہے نیند آنے کے لیے تھکا ہوا ہونا ضروری ہے اور میں بہت تھکا ہوا ہوں۔''

''اچھا بیٹا آرام کرو، شب بخیر!'' اماں نے کہتے ہوئے دروازہ بھیڑ دیا۔

''تھکاوٹ تو میرے روم روم میں بس چکی ہے مگر مجھے تو نیند نہیں آئی۔'' اماں نے کوٹھری میں اپنا بستر لگاتے ہوئے سوچا۔ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نیندیں روٹھنے لگتی ہیں۔ جبکہ اماں مہراں کی نیند تو برسوں پہلے جوانی میں ہی روٹھ چکی تھی۔ وہ بستر پر لیٹ کر اجنبی نوجوان کے بارے میں سوچنے لگی۔ نہ جانے کہاں سے آیا ہے بے چارہ اور یہاں گاؤں میں اسے کس سے ملنا ہے۔

☆☆☆

خدیجہ بی بی کا بیٹا باہر سے پڑھ کر آیا تھا۔ نوکری بھی مل گئی تھی۔ اور شہر میں گھر بھی اب خدیجہ بی بی اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ بیٹے کی نظر میں کئی لڑکیاں تھیں۔ کلاس فیلوز، کولیگز وغیرہ مگر خدیجہ بی بی شہری لڑکی نہیں لانا چاہتی تھی کہ اس نے بارہا دیکھا تھا کہ شہر کی لڑکیاں گاؤں میں نہیں ٹکتی تھیں۔ اور اکثر تو شوہروں کو لے کر شہر سدھار جاتیں اور ماں باپ خالی گھونسلے میں بیٹھے رہ جاتے۔

خدیجہ یہ غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی اپنی

بھانجی رضیہ بڑی خوب صورت اور ہر کام میں طاق تھی مگر اس کے لیے فرید راضی ہی نہ تھا کہ وہ ان پڑھ تھی۔ خدیجہ بی بی نہ چاہتے ہوئے بھانجی سے دستبردار ہوگئی اور پڑھی لکھی لڑکی کی تلاش جاری رکھی۔ نتیجتاً ساتھ والے گاؤں کی مڈل پاس مہر النسا بہو بن کر خدیجہ بی بی کے آنگن میں اتری، فرید کو دیہاتی انداز واطوار رکھنے والی مہر خاص پسند نہ آئی۔ وہ خاموش سا ہوگیا۔

وقت گزرتا رہا۔ مہر جان چکی تھی کہ فرید کو اس کی ذات میں دلچسپی نہیں ہے۔ مگر پاگل دل پھر بھی اس کی وجیہہ صورت پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی، ضرورتاً کلام کرنا دیر سے گھر آنا۔ وہ سب چپ چاپ برداشت کرتی رہی، خدیجہ بی بی مطمئن تھی۔

کچھ وقت گزرنے پر مہر کو شوہر کے انداز کھلنے لگے۔ نوکری تو شہر میں تھی مگر ماں کی خواہش پر بیوی کو گاؤں میں رکھا ہوا تھا۔ خود بھی روز شام کو گھر واپس آجاتا کہ شہر زیادہ دور نہیں تھا۔ مگر اب وہ کئی کئی دن بعد گھر آتا۔ بات بے بات مہر سے الجھ پڑتا۔ لہجے کے روکھے پن سے چھلکتی بے زاری ایسی چیز نہ تھی جو مہر کو محسوس نہ ہوتی۔ وہ مزید خاموش ہوتی گئی۔ دل ہار دیا تھا اور پھر کبھی جیت کی تمنا ہی نہ رہی۔

اسی اثنا میں کمپنی نے فرید کو باہر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ خدیجہ بی بی بیٹے کو دوبارہ خود سے دور کرنے کو تیار نہ تھیں مگر فرید فیصلہ کرچکا تھا۔ وہ ان کی سنتا ہی نہ تھا۔ اور اپنے انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ خدیجہ بار بار مہر سے کہا کہ وہ اسے روک لے مگر وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اکیلے میں اس سے سیدھے منہ بات کرنے کا روادار نہیں ہے۔ بس ماں کے سامنے اس سے نارمل بات چیت کرلیتا ہے کہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو۔ وہ ساس سے بس اتنا کہتی کہ ”میری نہیں مانتا۔“

”اری کیوں نہیں مانتا۔ ساری باتیں تیری ہی تو مانتا ہے۔ تو خود ہی چاہتی ہے کہ وہ چلا جائے اور میں تڑپتی رہوں۔“

خدیجہ بی بی کو اس کی بات پر کیسے یقین آتا کہ جہاں بستی کے اکثر مرد ضروریات زندگی تک کے لیے اپنی عورتوں کو ترساتے تھے۔ بات بات پر ہاتھ اٹھاتے تھے، وہاں فرید مہر کے ایک بار کہنے پر گھر کے سارے سودے لا دیتا۔ پسند کے جوتے، کپڑے دلوادیتا اور کبھی اونچی آواز سے اسے ڈانٹا تک نہ تھا۔ وہ اس کی کیسے نہیں مانتا تھا سو وہ مہر کو ہی کوسنے لگتی۔

خدیجہ بی بی کی التجائیں بے سود رہیں اور فرید غیر ملک سدھار گیا۔ وہ تو پڑھنے کے لیے بھی اکلوتی اولاد کو اتنی دور کبھی نہ بھیجتی مگر اس کے مرحوم شوہر کو بیٹے کو پڑھانے کا شوق تھا جو فرید اتنے سال باہر رہا۔ اور باپ بیٹے کی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی عدم سدھارا اور بیٹے کی خوشیاں بھی نہ دیکھ سکا۔

”بڑا شوق تھا تیرے باپ کو تجھے افسر بنانے کا مگر نصیب ایسا کہ نہ وہ تجھے افسر بنا دیکھ سکا نہ تو اس کا آخری دیدار کرسکا۔“

خدیجہ بی بی اکثر قلق کا اظہار کرتی۔ بیٹے کو شاید قلق بھی نہ تھا جواب بھی ماں کے رونے دھونے کو نظر انداز کرکے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد چند ماہ بعد مہر کے ہاں جڑواں بیٹیوں کی پیدائش ہوئی مگر وہ اپنی سانسیں گن کر لکھوا کر آئی تھیں جو دو دن بعد ہی مہر کی گود خالی ہوگئی۔ مہر نصیب کی ستم ظریفی پر تڑپ کر رہ گئی۔

سال بعد پتا چلا کہ فرید اپنی کولیگ سے جانے سے پہلے شادی کرچکا تھا اور اسے بھی ساتھ لے گیا ہے۔ مہر نے یہ دکھ بھی صبر سے سہہ لیا کہ اسے صدمات جھیلنے کی عادت پڑ چکی تھی۔

☆☆☆

”اماں آپ نے اتنی رات گئے اجنبی کے لیے دروازہ کھول دیا۔ آپ کو ڈر نہیں لگا؟ کوئی چور ڈاکو بھی تو ہوسکتا تھا؟“

نوجوان مسافر نے ساگ کے ساتھ روٹی

کھاتے ہوئے اماں مہراں سے سوال کیا تو وہ مسکرا دی۔
"کس چیز کا ڈر بیٹا؟ یہاں چرانے کے لیے کچھ ہے؟"
"پھر بھی اماں! بعض دفعہ واردات کرنے کے بعد پناہ لینے کے لیے بھی گھروں میں گھس جاتے ہیں، گھر والوں کو یرغمال بنالیتے ہیں۔"
"ٹھیک کہتے ہو بیٹا! ہوتا ہے ایسا بھی......
میرے گھر بھی ڈاکہ پڑا تھا۔ اور میرا سارا خزانہ لوٹ لیا تھا انہوں نے اور انہیں پناہ گاہ بھی بڑی مضبوط ملی تھی اتنی کہ مجھے آج تک کچھ واپس نہ ملا۔
"واقعی! یہ کب کی بات ہے؟"
نوجوان نے چونک کر گھر کی ویرانی اور غربت کو دیکھا اور سوچا تب ہی اتنی غربت ہے شاید!
"بہت سال ہو گئے ہیں!" اماں کے لہجے میں تھکاوٹ تھی۔
"کوئی ایف آئی آر وغیرہ؟"
"درج کروادی تھی، اب تک انصاف کا انتظار ہے۔" اماں مہراں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ نوجوان کچھ دیر خاموش رہا پھر پوچھا۔
"آپ کے بچے...... کوئی رشتہ دار وغیرہ......؟"
"تھے بیٹا...... سب اپنی اپنی منزلوں پر پہنچ گئے۔"
وہ سمجھ گیا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"اچھا اماں میں چلتا ہوں اور اپنے رشتہ داروں کا گھر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ابھی میرا سامان یہیں رکھا ہے۔ میں انہیں تلاش کر کے سامان لے جاؤں گا۔"
"ٹھیک ہے بیٹا۔ خیر سے جاؤ، یہ تمہاری امانت رکھی رہے۔ جب دل چاہے لے جانا، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"
نوجوان رخصت ہو گیا۔ اماں مہراں کام نمٹانے لگی اسے خوشی تھی کہ وہ دوبارہ اس کے گھر آئے گا۔

☆☆☆

فرید دو سال بعد آیا تھا۔ مہر کو اسے پہلی نظر میں پہچاننے میں دقت ہوئی۔ اس کا لباس انداز واطوار سب بدل چکے تھے۔ وہ کسی ہیرو جیسا لگتا تھا۔ مہر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ خوش ہو یا پریشان۔ وہ جو اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں تھا۔ اس سے بات کرنا بھی مشکل لگتا۔ وہ اب اسے طعنے نہیں دیتا تھا نہ ہی کسی بات پر جھڑکتا بلکہ بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مہر اس سے شکوہ کرنے کا سوچتی ہی رہ گئی۔ اس کی نظروں میں اتنی بے اعتنائی ہوتی کہ مہر کے لب سل جاتے۔ وہ اجنبیت کے صحرا میں بھٹک رہی تھی۔ اس کا دل کرتا کہ وہ اس سے بات کرے، چاہے جھڑکے طعنے دے۔ اس کے عیب گنوائے جن کی وجہ سے اس نے اسے چھوڑ کر دوسری عورت کو اپنے ساتھ کے لیے منتخب کیا۔ مگر نہیں شاید وہ اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔
"مہر میں کیا کمی تھی جو تو نے دوسری عورت کر لی؟"
مہر کے جامد لبوں کا سوال خدیجہ بی بی کے منہ سے نکلا اور وہ وہیں چوکھٹ پر پتھر ہو گئی۔ رواں رواں جسم سماعت بن گیا۔
"وہ تیری پسند کی ماں! اور عالیہ میری پسند ہے۔"
"تو اس میں مہر کا کیا قصور؟"
"اور اس میں میرا کیا قصور؟"
خدیجہ بی بی اس کے سوال پر ساکت رہ گئی۔
"پسند میری تھی۔ مگر تو نے قبول کیا تھا تو وہ اس گھر میں آئی۔"
"تو میں کب اسے گھر سے نکال رہا ہوں؟ میں خرچ بھیجتا رہوں گا، سال بعد چکر بھی لگ ہی جاتا ہے۔"
وہ چپ چاپ وہاں سے ہٹ آئی۔ بے وقعتی کے احساس نے گال بھگو دیے تھے۔ تو یہ تھی اس کے

دل میں مہر کی وقعت۔ "واہ مہر تمہارے نصیب!" اس نے دل ہی دل میں خود کو مخاطب کیا۔ دو دن بعد فرید نے چلے جانا تھا اور یہ دو دن اندرونی کشمکش کی وجہ سے مہر پر بھاری پڑ گئے۔
بالآخر ایک فیصلے پر پہنچ کر وہ دل مضبوط کر کے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
"آپ کو میری ضرورت نہیں، آپ مجھے چھوڑ دیں۔"
اس نے ہمت کر کے کہہ دیا تو مخاطب کی نظروں سے حیرانی چھلکی، پھر شاید وہ مبہم سا مسکرایا۔
"نہیں چھوڑ سکتا۔"
"ماں کی خدمت کے لیے رکھنا چاہتے ہیں نا؟"
وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو اس کا چہرہ سخت ہوا۔
"ماں کے لیے نوکر رکھ سکتا ہوں، بس میں نے کہا نا، کہ نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ مہر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہ گئی۔ وہ چلا گیا تھا اور مہر کے شب و روز اس گتھی کو سلجھانے میں گزرنے لگے۔
"نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ اس کے الفاظ یاد کرتی، اس کا لہجہ، چہرے کا اتار چڑھاؤ۔ "کیا یہ محبت تھی؟ نہیں نہیں....." اس کا دماغ فوراً رد کر دیتا محبت تو خوشبو کی طرح ہوتی ہے بلا اجازت اپنا وجود بتا دیتی ہے۔ چاہے کوئی لبوں کو جنبش بھی نہ دے۔ آنکھوں پر پہرے بٹھائے تو بھی چھلک پڑتی ہے یہی تو جذبہ ہے جسے مخاطب کا دل پرکھ لیتا ہے۔
محبت نہیں تو کیا ضرورت......؟ اس کے پاس بیوی ہے۔ ماں کی خدمت کے لیے نوکر رکھ سکتا ہے۔ رشتہ داروں کے گھر پاس پاس ہیں۔ اسے ماں کے اکیلے پن کا ڈر بھی نہیں تو پھر...... وہ سوچ سوچ کر تھک گئی مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔
شب و روز ایک ہی انداز سے گزر رہے تھے۔ آس پڑوس کی عورتوں کا، ہمدردی کی آڑ میں نوہ لینا۔ ترحم بھری نظریں، اسے سب بہت برا لگتا مگر وہ صبر سے برداشت کیے جاتی۔ کئی بار میکے جا کر بیٹھنے کا سوچا مگر سود و زیاں کا حساب لگانے پر اسے یہاں رہنا بہتر لگتا۔ والدین فوت ہو چکے تھے۔ دونوں بھائی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اپنی زندگی میں مگن تھے۔ میکے میں غربت کا ڈیرہ تھا۔ بھائی پرائیویٹ فیکٹری میں معمولی ملازم تھے۔ اور بمشکل زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے۔ یہاں اسے مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ بھابھیوں کی پیشانیوں کے بل گننے کے بجائے اپنے گھر کے مان کے ساتھ اسے یہاں رہنا مناسب لگا اور پھر دل بھی تو اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ جو جانے والے کے قدموں سے لپٹا جاتا اور اس کے آنے پر پلکیں بچھانے کو تیار رہتا۔

☆☆☆

"آپ کا نام غلام رسول ہے؟"
نوجوان پرچون کی بڑی سی دکان پر کھڑا کاؤنٹر پر بیٹھے دیہاتی حلیے والے شخص سے پوچھ رہا تھا۔
"نہیں! میں سلطان ہوں۔ غلام رسول میرے والد کا نام ہے۔"
"برطانیہ سے غلام فرید کے خدیجہ بی بی کے نام منی آرڈر آپ کی دکان پر آتے ہیں؟" نوجوان نے پوچھا تو دکاندار اسے قدرے حیرت سے دیکھنے لگا۔
"آپ کون ہو؟" اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔
"میں کوئی بھی ہوں۔ مجھے ان کے گھر کا ایڈریس لینا ہے؟"
نوجوان کو اس کی جرح اچھی نہیں لگی۔
"ابا سائیں!" دکان دار نے پیچھے مڑ کر آواز دی تو ایک سفید باریش شخص اٹھ کر آگے آیا۔ دکان دار نے اسے نوجوان کے بارے میں بتایا۔
"کون ہو بیٹا۔ کہاں سے آئے ہو؟"
"پھر وہی سوال!" نوجوان دل ہی دل میں جھنجلایا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں اور باخبر بھی۔ وہ کسی

اجنبی کو وجہ جانے بغیر کسی کا پتا نہیں بتائیں گے۔

"مجھے خدیجہ بی بی کے گھر کا پتا بتایئے، میں ان کا رشتہ دار ہوں۔ کراچی سے آیا ہوں۔" اب بزرگ صورت شخص نے اسے اپنے دیہی اسٹائل میں خوش آمدید کہا اور ایک بچے کو ساتھ کر دیا جو اسے خدیجہ بی بی کے گھر تک پہنچا آئے۔

وہ جب بچے کے ساتھ خدیجہ بی بی کے دروازے پر پہنچا تو حیرت زدہ رہ گیا۔

☆☆☆

فرید کے جانے کے نو ماہ بعد مہر کی گود میں بیٹا آگیا۔ مہر نے رو رو کر اس کی زندگی کی دعائیں مانگیں۔ اس نے خوش خبری ملنے پر فرید کو نہیں بتانے دیا تھا مگر اب خدیجہ بی بی نے گاؤں کے اکلوتے پی ٹی سی ایل فون بوتھ سے فون کر کے بیٹے کو بتایا تو وہ خلاف توقع بہت خوش ہوا۔ اور ماں کو بتایا کہ وہ پندرہ دن کے اندر آجائے گا۔

"دیکھا! بیٹے کی محبت میں بھاگا آرہا ہے۔ اتنی موہنی صورت ہے میرے پوتے کی۔ تم دیکھنا اب اسے چھوڑ کر جا ہی نہیں سکے گا۔"

خدیجہ بی بی خوش گمانیوں کی انتہا پر تھی۔ وہ ہر دفعہ اسے جانے سے روکنے کی بھرپور کوشش کرتیں مگر فرید کا تو یہاں ایک ماہ مشکل سے گزرتا۔

مہر کوئی خوش فہمی نہیں تھی...... اسے تو اس بات پر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ فرید بیٹے کا سن کر خوش ہوا اور اسے دیکھنے کے لیے جلد از جلد آرہا ہے۔

مہر کی اس کے دل میں کوئی وقعت نہیں اور مہر سے ہونے والے بیٹے پر اتنی خوشی؟ دل خوش فہم آس کا کوئی جگنو اس کے ہاتھ میں تھماتا۔ ہو سکتا ہے اب اس کا رویہ تمہارے ساتھ بدل جائے۔ مگر وہ سختی سے ہاتھ جھٹک دیتی۔ اسے یاد تھا یہاں گزرے ایک ماہ میں سارے دن اور نصف راتیں اس کی شہر میں دوستوں کے ساتھ گزرتی تھیں۔ مستقل یہاں رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس سب کے باوجود مہر جیسے ہی فرید کے آنے کا سوچتی دل عجیب انداز سے دھڑک اٹھتا۔

ہاتھ سست پڑ جاتے۔ آنکھیں بے وجہ نم ہو جاتیں۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیسا احساس تھا کم از کم خوشی کا تو نہیں...... تو کیا انتظار کا؟ نہیں۔ پھر کیا تھا؟ اس کا جواب بھی اسے جلد مل گیا جب فرید کے ساتھ شوخ وشنگ، تیز طرار اور خوب صورت سی عالیہ بھی چلی آئی۔ مہر ساکت رہ گئی۔

عالیہ دونوں ساس بہو سے یوں ملی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ آتے ساتھ ہی گھل مل گئی۔ سارا دن مہر سے باتیں کرتی۔ کبھی خدیجہ بی بی کے پاؤں دباتی۔ سر میں تیل ڈالتی کبھی نت نئی ڈشز بناتی۔ اور اکثر تو منے کو اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ خدیجہ بی بی جو بڑا ارادہ کر کے بیٹھی تھی فرید کی عالیہ سے چھڑوانی ہے خود اس کی گرویدہ ہو بیٹھی۔

وہ اکثر سوچتی کہ "وہ خواہ مخواہ ہی شہر کی لڑکیوں کو برا سمجھتی تھی۔ عالیہ کتنی اچھی ہے بالکل چہکتی مینا...... اتنا سج کر رہتی ہے، اتنے اچھے کھانے بناتی ہے اور اوپر سے صورت ایسی موہنی...... تو فرید میاں کیسے لٹو نہ ہوتے اس پر! اور ایک یہ مہر ہے مٹی کی مورت، نہ بولنا نہ بجنا سنورنا، میرا اتنا شاندار بیٹا ہے اس کے ساتھ تو عالیہ جچتی ہے۔"

اور ان لمحوں میں خدیجہ بی بی بھول جاتی تھی کہ بولنے بجنے سنورنے اور خوش رہنے کے لیے دل کی خوشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مہر کو دل کی خوشی ملی ہی کب تھی جو اسے بولنے پر اکساتی۔

فرید بے حد خوش تھا اور تقریباً سارا وقت گھر پر گزار رہا تھا۔ مہر اس کے چہرے کی خوشی اور مسکراہٹ کو دیکھے جاتی۔ وجہ جو بھی ہو مگر یہ مسکراہٹ اس چہرے پر کتنی بھلی لگتی ہے کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ اسے عالیہ سے نفرت نہیں ہوئی کہ اس کی صورت و سیرت اتنی اچھی تھی کہ اس کا نفرت کرنے کا دل ہی نہ چاہا۔ مگر جب اسے فرید کے ساتھ ہنستا بولتا دیکھ لیتی تو دل پر قیامت گزر جاتی۔

مہر کے ساتھ فرید کا رویہ پہلے کی طرح ہی تھا مگر اجنبیت نہیں تھی مگر کچھ اور ہی جذبہ تھا جو اس کی

نظروں سے جھلکتا تھا۔ شاید رحم کا ترس کا یا کچھ اور ......وہ کوئی نام نہیں دے پائی۔ وہ صبر سے دن گن رہی تھی اور پہلی بار وہ شدت سے فرید کے چلے جانے کی منتظر تھی۔ عالیہ کو برداشت کرنا اب مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

عشا کے بعد کا وقت تھا۔ خدیجہ بی بی تسبیح ہاتھ میں لیے بستر پر لیٹی سوچ رہی تھیں کہ دو دن رہ گئے ہیں۔ فرید کے چلے جانے میں اور وہ اسے یہاں رکنے پر قائل نہیں کر سکی۔ اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا، فرید اندر آیا۔ خدیجہ بی بی کو حیرت ہوئی کہ وہ اس وقت اس کے پاس کبھی نہیں آتا تھا۔ کچھ دیر معمول کی باتوں کے بعد فرید نے ماں سے کہا۔

''ماں مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔''

''پہلے میری بات سن لو بیٹا۔ میں نے عالیہ کو بہو مان لیا ہے۔ بس اب تم یہیں رہ جاؤ۔ بھلے شہر میں گھر لے لو، عالیہ کو ساتھ رکھ لو، مگر اب باہر مت جاؤ۔ اب تو تمہارا بیٹا ہے، اسے چھوڑ کر جانے کو دل کر رہا ہے تمہارا؟'' خدیجہ بی بی نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔ اس کی بات پہلے سن لیتی تو ممکن تھا کہ اپنی سنا کر اٹھ جاتا اور اسے موقع ہی نہ ملتا۔

''بیٹے کو چھوڑ کر جانے کا تو واقعی دل نہیں کر رہا۔''

وہ بولا تو ماں خوشی سے کھل اٹھی۔

''تو اب یہیں رہو گے نا؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''نہیں...... میں اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں!'' اس نے دھماکا کیا۔

خدیجہ بی بی دھک سے رہ گئی۔

''تو کیا مہر کے کاغذات بنوا لیے؟''

''نہیں، وہ یہیں رہے گی اسے نہیں لے جا رہا۔''

اصل دھماکا تو اس نے اب کیا تھا۔ خدیجہ بی بی سکتے میں آ گئی۔

''فرید! تم ہوش میں تو ہو؟''

''وہ میرا بیٹا ہے۔ میں اسے لے جا سکتا ہوں۔''

اس کے لہجے میں بے گانگی اتری خدیجہ بی بی کی آنکھیں پھٹ گئیں اس کا بیٹا اس کی سوچ سے بڑھ کر بے مروت اور سنگ دل تھا۔ وہ لرز گئی۔

''ایک ماہ کے بچے کو ماں سے چھینو گے تم......؟ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ مہر کبھی نہیں مانے گی، نہ میں تمہیں یہ ظلم کرنے دوں گی۔ سمجھے تم!''

''میں اپنے بیٹے کو اس ماحول میں جاہل ماں کے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ عالیہ ہے ناں وہ اسے سنبھال لے گی۔ ماں کا پیار دے گی۔''

''واہ...... کیا خوب پلاننگ ہے تمہاری...... مہر جاہل ہے تو تمہاری پڑھی لکھی بیوی سے ہو جائیں گے بچے۔ تمہارے پاس گھر نوکری بیوی سب کچھ ہے، مہر کے پاس کیا ہے جو تم اس سے بیٹا بھی چھیننا چاہتے ہو؟''

''اماں! عالیہ کے اندر کوئی نقص ہے بچے نہیں ہو سکتے اس کے۔''

اس نے ایک اور بم پھوڑا۔ خدیجہ بی بی کا دم جیسے گھٹنے لگا۔ سانس لگتا تھا رک جائے گی مگر اسے آج ہارنا نہیں تھا۔ وہ خم ٹھونک کر میدان میں اتری۔

''تم ابھی کے ابھی اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ یہ گھر میرا ہے اور مجھے خرچ بھیجنا نہ آئندہ کبھی شکل دکھانا۔ ہم محنت کر کے اپنا پیٹ پال لیں گے۔ اور دوبارہ کبھی بھول کر بیٹے کا نام بھی نہ لینا!'' خدیجہ بی بی سخت جلال میں تھی۔

وہ لب کاٹتے سرخ آنکھوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا کہ دروازے سے لگی عالیہ اچانک ہی اندر آ گئی۔

''معاف کر دیں اماں! ہمارا یہ مقصد نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ ہم مہر سے بیٹا مانگیں گے۔ منت کریں گے اگر وہ مان جائے گی تو ہم اسے لے جائیں گے۔ یہ آپ کا اور اس کا ہم پر احسان ہوگا۔ کیونکہ میری اولاد تو ہو نہیں سکتی، مہر کو خدا اور بچے دے

دے گا۔"

عالیہ کی آخر میں آواز نم آلود ہوگئی۔ اس نے ساس کے ہاتھ تھام لیے تھے اور اب مزید کہہ رہی تھی۔

"اگر آپ لوگ راضی نہیں تو کوئی بات نہیں، میرا اپنا نصیب!"

وہ آنسو پونچھنے لگی۔ اس کی باتوں سے خدیجہ بی بی کا جلال کم ہوا مگر وہ راضی پھر بھی نہیں ہوئی۔

"یہ بے تکی باتیں کرنے کے بجائے تم لوگ یہیں رہ جاؤ۔ دوسری شادی گناہ نہیں ہے مگر انصاف ضروری ہے۔ مہر کو بھی حقوق ملیں اور تم بھی بچوں سے محروم نہ رہو۔ باقی بچہ اس سے مانگنے کی دوبارہ بات بھی نہ کرنا۔" وہ دونوں بے نیل و مرام کمرے سے نکل آئے۔

"آپ کی جذباتیت نے کام بگاڑ دیا ہے۔" عالیہ آہستہ آواز میں مسلسل فرید کو گھرک رہی تھی۔

☆☆☆

فرید بچے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ عالیہ اسے بار بار پیار کر رہی تھی۔ کل صبح دس بجے ان کی فلائٹ تھی اور گاؤں سے تو منہ اندھیرے نکلنا تھا۔ سو وہ بچے کو جی بھر کر پیار کر لینا چاہتے تھے۔ مہر کو امید تھی کہ فرید اس سے نہ سہی بیٹے کے لیے تو آئے گا۔ بچے کے متعلق جو باتیں خدیجہ بی بی اور ان کے درمیان ہوئیں وہ ان سے بے خبر تھی۔ رات گیارہ بجے وہ سب عالیہ کے ہاتھ کی بنی مزے دار چائے پی کر سو گئے اور اگلے دن مہر کی آنکھ ساس کے چلانے کی آواز سے کھلی۔

اس نے گھڑی دیکھی گیارہ بج رہے تھے۔ بیٹا بستر پر نہیں تھا۔ دادی لے گئی ہوگی۔ وہ اتنی دیر تک تو کبھی نہیں سوتی۔ مہر خود پر حیران ہوتی ہوئی اٹھ کر باہر آئی تو دیکھا۔

خدیجہ بی بی سر پکڑے رو رہی تھی۔ وہ چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

"اماں کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟"

دفعتاً اسے احساس ہوا، خدیجہ بی بی کی گود میں منا نہیں تھا۔ اس نے نظر دوڑائی۔ سارے گھر میں کہیں نظر نہ آیا۔

"اماں! منا کہاں ہے؟" اس کی پھٹی پھٹی آواز نکلی۔

"لے گیا فرید بدبخت اور اس کی میسنی بیوی...... ہائے میرے اللہ!"

خدیجہ بی بی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ مہر کو چند لمحے تو سمجھنے میں لگے اور جب سمجھ میں آیا تو آہ...... یوں لگا جیسے کسی نے کلیجے میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ وہ پورے قد سے گری اور ہوش سے بیگانہ ہوگئی۔

آن کی آن میں خبر پھیلی اور صحن عورتوں سے بھر گیا مہر کو ہوش میں لایا جاتا مگر وہ "میرا بچہ" کہہ کر پھر بے ہوش ہو جاتی۔

خدیجہ بی بی کی حالت خراب تھی۔ بیٹے کی سنگ دلی بہو کی حالت، لوگوں کی باتیں وہ کس کس کا سامنا کرتیں، بچہ نہ مرا تھا، نہ اغوا ہوا تھا اسے اس کا باپ لے گیا تھا وہ بھی اتنی دور...... لوگ لعنت ملامت کر رہے تھے۔ مہر کو تین دن تک غشی کے دورے پڑتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ حالت معمول پر آئی۔ مگر اب زندگی یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ مہر چپ ہو گئی تھی۔ جامد، خاموش بس بچے کے کپڑے سینے سے لگائے بیٹھی رہتی۔ کوئی ہزار باتیں کرتا اسے بلوانے کی کوشش کرتا مگر اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلتا۔ وہ ہمدردی کرنے والوں کو اجنبی نظروں سے دیکھتی جیسے پہچانتی ہی نہ ہو۔

خدیجہ بی بی کے سر دہری مصیبت پڑ گئی تھی۔ پوتے کی جدائی رلاتی، بیٹے کی بے حسی، سنگ دلی تڑپاتی اور ادھر مہر کی حالت نے اسے تھکا دیا تھا۔ اسے زبردستی کھانا کھلانا، نہلانا، گھر کے سارے کام کرنا۔ لوگوں کی باتیں سننا۔ اس کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان کہاں تھی۔ اس کی صحت گرنے لگی۔ جلد ہی وہ بستر سے جا لگی۔

آہستہ آہستہ مہر کی حالت میں تبدیلی آنے لگی۔

وہ تھوڑا بہت گھر کے کاموں میں حصہ لینے لگی۔ بولتی تو بس اپنے بچے کی باتیں کرتی، ورنہ خاموش ہی رہتی۔ فرید نے جانے کے بعد کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

”عالیہ میرے بچے سے پیار کرتی تھی۔ وہ اس کا خیال رکھ رہی ہوگی۔“ مہر اپنے دل کو تسلی دیتی مگر پھر بھی کسی پل قرار نہ آتا۔ خدیجہ بی بی کی بہنیں بھانجیاں آتی جاتی رہتیں۔ وہ مکمل طور پر بستر کی ہوگئی تھی۔ مہر کو گھر سنبھالنا ہی پڑا۔ دن ہفتوں، ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بدل گئے۔ فرید آیا نہ مہر کو بچے کی صورت دیکھنے کو ملی۔ البتہ منی آرڈر باقاعدگی سے آجاتا۔

خدیجہ بی بی نے پندرہ سال کی رفاقت کے بعد اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھیں آخر وقت تک بیٹے اور پوتے کی منتظر رہیں۔ مگر کسی کے پاس فرید کا ایڈریس ہی نہیں تھا کہ اسے اطلاع دی جاتی۔

مہر جو اب مہراں کہلاتی تھی۔ تنہا رہ گئی۔ غم نے اسے گھلا کر ہڈیوں کا ڈھانچہ کردیا تھا۔ بالوں میں سفیدی اور چہرے پر وقت سے پہلے جھریاں پڑ گئی تھیں۔ دل کا موسم ہی آباد نہ ہو تو جسم کو ویران کھنڈر بنتے دیر نہیں لگتی۔ اس کا تو کلیجہ ہی نکال لیا گیا تھا۔ اسے کیونکر قرار آتا۔

توہمات کی ماری عورتیں اپنی بہو بیٹیوں کو اس کے سائے سے بچاتیں وہ خود بھی کہیں نہیں جاتی تھی۔ خدیجہ بی بی جب تک زندہ تھی تو اس کی رشتہ دار عورتیں آیا کرتیں۔ اس کے جانے کے بعد مہراں کے پاس گاؤں کی چند بڑی بوڑھیوں کے علاوہ کوئی نہیں آتا تھا۔ چند ایک ہمدردی کے مارے آبھی جاتیں۔ تو مہراں کے پاس بیٹے کی باتوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ جلد ہی اکتا کر گھر کی راہ لیتیں ایسے میں صرف ایک رضیہ تھی خدیجہ بی بی کی بہن صفیہ کی پوتی جو اکثر مہراں کے پاس آجاتی۔

”چاچی! آج اماں نے ساگ پکایا ہے، میں آپ کے لیے لے آئی۔ چاچی یہ میٹھے چاول میں نے خود بنائے ہیں۔ کھا کر دیکھیں نا کیسے بنے ہیں؟“

وہ شوخ اور زندگی سے بھرپور لڑکی اکثر ہی کچھ نہ کچھ لے کر آتی اور خود ہی ڈھیر ساری باتیں کیے جاتی۔ کتنے ہی کام بھی لگے ہاتھوں کردیتی۔ مہراں کو اس کی آمد اچھی لگتی۔ مگر اسے پتا تھا کہ اس کی ماں اسے یہاں آنے سے روکتی ہے۔ ساتھ والا گھر ہی تو صفیہ بی بی کا تھا۔ آوازیں تو آتی ہی تھیں۔ اور تب ہی مہراں کو پتا چل جاتا کہ یہاں آنے پر رضیہ کو ماں گھرکتی تھی مگر وہ لاابالی سی لڑکی کبھی پروا نہیں کرتی تھی۔ وہ کسی نحوست کو نہیں مانتی تھی۔ اسے اس دکھیاری اماں سے انس سا محسوس ہوتا۔

”رہنے دو چاچی! اماں تو مجھے کہیں بھی نہیں جانے دیتی۔ مامی سے جھگڑا ہے تو خالہ کے بیٹے جوان ہیں۔ فلاں کے گھر یہ ہے تو ڈھمکاں کے گھر وہ..... تو کیا اب میں کہیں بھی نہ جاؤں؟“

وہ معصوم سا سوال کرتی اور مہراں مسکرا دیتی۔ وہ مہراں کی داستان کی بھی بہترین سامع تھی۔ وہ اکتاتی نہیں تھی بس سوال کیے جاتی اور کام کیے جاتی۔ یہاں تک کہ دیوار پار سے اس کی ماں کی آواز آتی۔

”رضیہ گھر واپس آؤ، روٹی بنانی ہے۔“ تب وہ گھر بھاگ جاتی اور مہراں کے گھر کے درودیوار سے پھر اداسی اور ویرانی ٹپکنے لگتی۔ مہراں اکیلے میں اپنے رب سے باتیں کیے جاتی۔ اور دیکھنے والے اسے نیم پاگل سمجھتے تھے۔

☆☆☆

دروازہ بند نہیں تھا وہ۔ کواڑ دھکیل کر بنا دستک دیے اندر داخل ہوا اور صحن میں بچھی چارپائی کے پاس جا کھڑا ہوا جہاں وہ بوڑھی عورت آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ نوجوان کے قدموں میں لرزش تھی اور آنکھوں میں نمی۔ وہ اس ڈھانچہ بنے وجود اور جھریوں بھرے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایک آس کے سہارے زندگی کی ڈور تھامے گھسٹتے وجود کو کیسے پکارے۔ کیسے بتائے کہ اس کے انتظار کی طنابیں لپیٹ دی گئی ہیں۔ مسافت ختم ہوچکی ہے اور اس کی زندگی کا حاصل اس کے سامنے کھڑا ہے۔

وہ اسی مشکل میں گرفتار گنگ کھڑا تھا جب اماں مہراں کے وجود میں حرکت ہوئی مندی ہوئی آنکھیں کھلیں تو اسے دیکھا۔

"ایسے کیوں کھڑے ہو بیٹا۔ بیٹھ جاؤ، ڈھونڈ آئے اپنے رشتہ داروں کو؟" وہ چونکا اور آہستہ سے بیٹھ گیا۔

"میرا یہاں آپ کے علاوہ کوئی رشتہ دار نہیں ہے اماں!" اس کی آواز میں لرزش تھی۔ حلق میں نمی، مہراں نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"میں آپ کی تلاش میں آیا تھا۔ میں آپ کا بیٹا ہوں جسے آپ سے چھین لیا گیا تھا۔ آپ کا فہد ہوں!"

وہ یک دم کہہ گیا۔ مہراں ساکت ہو گئی وہ خود ہی آگے بڑھ کر اماں کے گلے لگ کر سسکنے لگا۔ اور مہراں کا وجود لرزا...... آنسو بہہ نکلے......

آہ...... چوبیس سال سے کلیجے میں لگی آگ آج ٹھنڈک میں بدلی تھی۔ آنسوؤں کا سیال رواں تھا جو بہہ رہا تھا۔

مہراں بار بار اس کا سر چومتی کبھی پیشانی اور کبھی ہاتھ......

"تم واقعی میرے بیٹے ہو...... ہائے میں نے پہچانا کیوں نہیں...... میں سوچتی تھی کہ جب میرا بیٹا میرے سامنے آئے گا میں ایک لمحے میں پہچان لوں گی۔" وہ فرط جذبات سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

مگر میرا دل تمہاری طرف کھنچا تھا...... میں حیران تھی کہ ایسا کیوں ہے؟

"اماں! دو ماہ کے بچے کو چوبیس سال بعد دیکھ کر کون پہچان سکتا ہے۔"

وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ فرید جیسی تھی۔ مہر کو پہلی بار محسوس ہوا۔ مگر نقش سارے مہر سے لیے تھے۔ جب ہی بستی کے کسی مرد نے اسے فرید کا بیٹا نہیں سمجھا۔ جذبات کا طوفان تھما تو مہراں نے اٹھ کر دیوار سے آواز دی۔

"اری او رضیہ! اماں اور دادی کو بتا میرا بیٹا آ گیا ہے۔"

سکینہ نے سمجھا شاید مہراں کو پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ اس نے دیوار سے جھانکا اور مہراں کے ساتھ بیٹھے نوجوان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ساس کو لے کر مہراں کے گھر آ گئی۔

پھر تو خبر خوشبو کی طرح پھیلی اور چند ہی منٹوں میں مہراں کا گھر عورتوں سے بھر گیا۔ خوشی حیرت اور جوش سے تمتماتے چہرے، مبارک باد کا شور...... کوئی جا کر مٹھائی لے آیا تھا۔ مہراں خوشی سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ مبارک بادیں وصول کر رہی تھی۔ مٹھائی تقسیم کر رہی تھی۔ کوئی فہد سے سوال وجواب کر رہا تھا۔ وہ محبت و یگانگت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر حیران تھا۔ تھوڑی دیر بعد رش چھٹا تو وہ ماں سے پوچھنے لگا۔

"اماں! کیا یہ سب آپ کے رشتہ دار ہیں؟"

"میرا تو کوئی ایک بھی رشتہ دار نہیں ہے۔ ہاں کچھ تمہارے باپ کے رشتہ دار ہیں اور باقی سب بستی کے لوگ ایک دوسرے کے سگی بہنوں رشتہ داروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ تم نے کہاں دیکھے ہوں گے اس طرح کے مناظر......"

وہ جانتی تھی کہ وہ روبوٹ جیسے بے حس اور مشینی انسانوں کے درمیان پلا بڑھا ہے اور فرید کا زیادہ وقت بھی تو مغربی ممالک میں گزرا تھا جب ہی وہ اتنا سنگ دل ہو گیا تھا یا شاید اس کی فطرت ہی ایسی تھی۔

"اماں میں ذرا آرام کر لوں!"

"ضرور بیٹا! ماں صدقے! آرام سے سو جاؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا بناتی ہوں، تمہیں کیا پسند ہے؟"

نصیب کا کھیل تھا کہ ماں کو بیٹے کی پسند معلوم نہیں تھی۔

"چاول......" بیٹے نے ایک لفظی فرمائش کی اور اندر جا کر سو گیا۔ مہران نے دل میں اٹھتے بے تحاشا سوالات پر ضبط کا کڑا پہرہ بٹھاتے ہوئے کچن کا رخ کیا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اپنے سگے بیٹے کے لیے کھانا بنا رہی تھی۔ آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔

☆☆☆

''عالیہ تجھے پیار کرتی تھی؟''
''بہت! اتنا کہ میں چڑ جاتا تھا۔''
رات بھیگ چکی تھی۔ تارے چمک گئے تھے۔ ماں بیٹے کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔
''تجھے کیسے پتا چلا کہ وہ تیری حقیقی ماں نہیں ہے؟''
''میں بہت چھوٹا شاید ساڑھے تین سال کا، میں ضد بہت کیا کرتا تھا تو کبھی کبھار زچ ہو کر ممی مجھے کہتیں کہ ''چڑیل کا بیٹا چڑیل کا اثر لے کر آیا ہے'' میری یادداشت اچھی تھی۔ یہ جملہ اور اس پر پاپا کی ممی کو تنبیہ کہ ''ایسا نہ کہا کرو۔ وہ جان جائے گا کہ اس کی ماں تم نہیں ہو'' میری یادداشت میں رہ گیا۔ اور ذرا بڑے ہونے پر مجھے سمجھ میں آیا تو تجسس فطری تھا۔ اور پھر کچھ پاپا کے دوستوں کی باتوں سے مجھے شک گزرا اور پندرہ سال کی عمر سے مجھے کھوج لگ گئی۔ پاپا پاکستان نہیں جاتے تھے اور کبھی ایک آدھ بار گئے بھی تو میرے کہنے کے باوجود ساتھ نہیں لے گئے اور جب میں پوچھتا کہ ہمارے کوئی رشتہ دار بھی ہیں! تو پاپا کا نفی میں جواب دینا مجھے حیران کرتا تھا۔ اور جب میں کھوج میں لگا تو میں نے ممی پاپا کی ڈائریاں کھنگالیں، فون کالیں ٹیپ کیں۔ پرانے دوستوں سے ملا اور بالآخر تین سال بعد راز پا لیا۔''
''یعنی تم چھ سال سے جانتے تھے۔''
مہراں کی آواز نم ہوئی۔
''ہاں مگر میں بااختیار نہیں تھا۔ میں نے انہیں ہوا بھی نہ لگنے دی کہ میں سب جانتا ہوں۔ پھر آج سے ایک سال قبل ممی کو کینسر تشخیص ہوا۔ تو وہ پاپا سے بار بار کہتیں کہ یہ میرے گناہ کی سزا ہے۔ میں پوچھتا تو وہ ٹال دیتیں انہیں خوف تھا کہ میں انہیں چھوڑ دوں گا۔ ایک ماہ قبل جب ڈاکٹر نے انہیں جواب دے دیا تو انہوں نے مجھے سب کچھ بتایا اور کہا کہ اپنی ماں اور دادی سے کہنا مجھے معاف کر دیں۔ اور انہیں بتانا کہ منصوبہ فرید کا تھا۔ میں اس کا ساتھ دینے کی مجرم تھی۔ اس کے دو دن بعد ہی ان کی ڈیتھ ہو گئی۔''
مہراں کا سر جھکا ہوا تھا۔ آنسو پھر بہنے لگے تھے۔ آہ...... ہر بات سینہ چیرتی تھی۔ جس سکھ کے لیے عالیہ نے اس کی گود اجاڑی تھی وہ سکھ تو اسے بھی نہ ملا اور وہ ہمیشہ کی بے قراری دل میں چھپائے قبر میں جا سوئی تھی۔
فرید اپنی جاب سے ریٹائر ہو چکا تھا مگر پاکستان آنے کو تیار نہیں تھا۔ فہد کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ وہ پاکستان کے وزٹ کے بہانے آیا تھا اور باپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے عالیہ، ماں کے بارے میں سب بتا چکی ہے۔ اور وہ اس کی تلاش میں جا رہا ہے۔ فرید کو اب بھی نہ مہر یاد آتی تھی نہ کوئی پچھتاوا تھا۔ کچھ لوگ زندگی بھر نہیں بدلتے، وہ ان ہی لوگوں میں سے تھا۔

☆☆☆

کچھ ہی دنوں میں مہراں کے گھر کا نقشہ بدل گیا تھا۔ اس کے ویران کھنڈر نما گھر میں رونقیں اتر آئی تھیں۔ جو عورتیں اپنی بہو بیٹیوں کو مہراں کے سائے سے بچاتی تھیں وہ اب خود انہیں لے کر آیا کرتیں۔ رضیہ پر بھی اب کوئی پابندی نہیں تھی۔ مگر اب وہ کم آیا کرتی۔
دو ہفتوں بعد فہد نے باپ کو حقیقت بتا دی تھی اور یہ بھی کہ اب وہ یہیں رہے گا اور نوکری بھی یہیں تلاش کرے گا۔ فرید کو سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ جس وقت سے بچتا آیا تھا وہ وقت آچکا تھا۔ اس نے بے حد کوشش کی مگر فہد نہ مانا۔ اب وہ دو ماہ کا بچہ نہیں تھا جسے وہ مہر سے چھین لیتا۔ وہ مہر کا تھا اور قدرت نے دوبارہ اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ مہر نے لمبی آزمائش صبر سے کاٹی تھی اور اب پھل ملا بھی تو شکر گزار تھی۔ فرید کی اکڑ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔
فہد کو کچھ ہی عرصے میں جاب مل گئی۔ اب اس کے سر پر سہرا سجانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ کئی بیٹیوں کی ماؤں نے خود آکر کہا تھا۔ مگر گاؤں کی تقریباً ساری لڑکیاں پڑھی لکھی نہیں تھیں اور جو اپنے تئیں پڑھی لکھی تھیں بھی تو پرائمری پاس، مہر ایسی لڑکی لانا چاہتی تھی جو اس کے بیٹے کے لائق ہو۔
''تمہاری کوئی پسند ہے تو بیٹا مجھے بتا دو۔''
اس نے فہد سے کہا تو وہ ذرا دیر کو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ''نہیں اماں! بس جو آپ کو پسند ہو۔''
اس کی کلاس فیلو منا ہل اسے پسند تھی اور ردا،

عدین، شیبا، ایک لمبی لائن تھی جو اس کی سوفٹ نیچر اور خوب صورتی کی وجہ سے اسے پسند کرتی تھیں۔ مگر اسے پتا تھا کہ ہائی فائی کلاس سے تعلق رکھنے والی یہ لڑکیاں نہ اس کی دیہاتی ماں کو پسند آئیں گی نہ وہ یہاں رہنا پسند کریں گی۔ اس کی ماں نے عمر بھر دکھ جھیلا تھا اور اب وہ اسے ہر ممکن طور پر خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

"تمہیں رضیہ کیسی لگتی ہے؟"

ماں کی آواز نے اسے سوچوں سے نکالا۔

"رضیہ؟" لال پراندے اور شوخ رنگ لباس والی رضیہ کی شبیہ اس کے ذہن کے پردے پر لہرائی۔ اف! اس کے دل نے بے اختیار نفی کی۔ مگر اس نے خود پر قابو پالیا۔

"آپ کو اچھی لگتی ہے تو ٹھیک ہے؟"

اس نے جی کڑا کر کے کہہ دیا۔ مہر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ایک عمر کے دکھ نے اسے جو سبق دیا تھا وہ اسے بھولی نہیں تھی۔ وہ خدیجہ بی بی نہیں تھی۔ جس کے لیے بیٹے کی چپ ہی ہاں کا عندیہ تھی۔ وہ کوئی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی جو عمر بھر کے لیے کسی کو جلتے تنور پھینک دے۔

"اتنا تو میں جان گئی ہوں بیٹا کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو مگر وہ کون ہے میں نہیں جانتی۔ تم جاؤ اور اس سے ملو۔ اس کی ڈیمانڈز معلوم کرو۔ ظاہر ہے وہ کسی گاؤں گوٹھ کی تو ہوگی نہیں اور نہ یہاں رہنا چاہے گی۔ وہ جیسے کہے تم مان لینا...... میری فکر مت کرنا...... تم جب کہو گے میں رشتہ اس کے گھر لے جاؤں گی۔"

فہد حیران رہ گیا۔ یہ اس کے باپ کے بقول ان پڑھ ماں تھی جسے دنیا اور اس کے تقاضوں کا کچھ پتا نہ تھا۔

وہ ماں کے گلے لگ گیا۔ "اماں! مناہل بہت اونچے گھرانے کی لڑکی ہے۔ وہ یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو سکے گی۔ میں آپ کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا۔"

"وہ جہاں چاہے گی ہم وہیں رہ لیں گے۔ اگر میرا رہنا اسے پسند نہ ہوا تو میں یہیں رہوں گی۔"

"بس کریں اماں! کیوں دل چیرنے والی باتیں کرتی ہیں۔ میں اس سے شادی کروں گا جو میری ماں کو بھی دل سے قبول کرے۔"

وہ ماں کے ہاتھ چومتے ہوئے بے ساختہ بولا۔ "نہیں تو پھر رضیہ ہی ٹھیک ہے۔" وہ اس انداز سے بولا کہ مہر کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"رضیہ؟ وہ تو میں تمہارا امتحان لے رہی تھی۔ جھلے! میں اپنے بیٹے کے لیے اس کے جوڑ کی لاؤں گی۔" مہر کھل کر مسکرائی تو فہد بھی مسکرا دیا۔

☆☆☆

مناہل کے والدین رضامند نہیں تھے مگر مناہل نے کھلے دل سے فہد کی ماں کو قبول کیا تھا۔ وہ بہت اچھی طبیعت کی مالک تھی۔ جبکہ اس کی ماں کو فہد کے دیہی پس منظر اور سادہ سی ماں پر سخت اعتراضات تھے۔

"تم اپنے سرکل میں ایسی دیہاتی عورت کا تعارف اپنی ساس کے حوالے سے کیسے کراؤ گی؟" انہوں نے چڑ کر پوچھا تھا۔

"وہ فہد کی ماں ہیں اور میرے لیے یہی کافی ہے۔ انہیں کسی سے متعارف کرواتے ہوئے مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہوگی۔"

مناہل نے والدین کو منا کر ہی چھوڑا اور یوں فہد سے اس کی شادی ہوئی۔ فہد نے ماں کے کہنے پر شہر میں گھر لے لیا تھا اور مہر پورے استحقاق سے ساتھ بیٹے اور بہو کے ساتھ رہ رہی تھی۔

خوشیوں، اچھی خوراک، توجہ اور محبت نے اسے سرتا پا بدل دیا تھا۔ اسے لگتا کہ اس کا ماضی لوٹ آیا ہے۔ اچھی صحت، صاف رنگت، نرم ہاتھ پاؤں والی مہر ہلکے رنگوں والے خوب صورت کپڑوں میں باوقار چال اور پراعتماد چہرے کے ساتھ گاؤں آتی تو دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ مناہل نے بڑی محبت سے اسے گروم کیا تھا۔

فہد نے بارہا فرید کو یہاں لانے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں مانا۔ مہر کے دل میں اس کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ رب نے اس کے صبر کا صلہ بہترین کر کے دیا تھا وہ اس پر مطمئن اور دل سے آسودہ تھی۔

☆

بے سبب یونہی سرِ شام نکل آتے ہیں
ہم بلائیں تو انہیں کام نکل آتے ہیں

روتے روتے جو ہنسا ہوں تو تعجب کیا ہے
سختیوں میں بھی تو آرام نکل آتے ہیں

ایک مجنوں ہی نہیں دشت میں تنہا ٹھہرا
رونے والوں میں کئی نام نکل آتے ہیں

بار ہا پہنچے ہیں دربار میں اوروں کی طرح
دام لگتے ہیں تو بے دام نکل آتے ہیں

نئی تہذیب کے روزن سے یہ دیکھا منظر
سچ کے اظہار سے ابہام نکل آتے ہیں

منظر نقوی

اے سامانِ سفرِ جان، یہ جگنو رکھ لے
راہ میں تیرگی ہوگی، مرے آنسو رکھ لے

تُو جو چاہے تو ترا جھوٹ بھی بِک سکتا ہے
شرط اتنی ہے کہ سونے کی ترازو رکھ لے

وہ کوئی جسم نہیں ہے کہ اسے چھو بھی سکیں
ہاں اگر نام ہی رکھنا ہے تو خوشبو رکھ لے

تجھ کو اَن دیکھی بلندی میں سفر کرنا ہے
احتیاطاً مری ہمت مرے بازو رکھ لے

مری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اُٹھے
مرے بھائی مرے حصے کی زمیں تُو رکھ لے

راحت اندوری

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

ضبط کی کوشش ہے جانِ ناتواں مشکل میں ہے
کیوں عیاں ہو آنکھ سے وہ غم جو پنہاں دل میں ہے

جس سے چاہو پوچھ لو تم میرے سوزِ دل کا حال
شمع بھی محفل میں ہے پروانہ بھی محفل میں ہے

عشق غارت گر نے شہ دی حسنِ آفت خیز کو
شوقِ بسمل ہی سے کس بل بازوئے قاتل میں ہے

خود تجھے آجائے گا عاشق نوازی کا خیال
تیرا رہرو کیوں خیالِ دوریٔ منزل میں ہے

مدعائے عشق میرا کچھ نہیں جز ذوقِ عشق
حسن کو حیرت کہ یہ کس سعیٔ بے حاصل میں ہے

اپنی شانِ بے نیازی پر تمہیں کیا کیا ہیں ناز
کاش تم اس شوق کو جانو جو میرے دل میں ہے

وحشت رضا علی کلکتوی

سب گناہ و حرام چلنے دو
کہہ رہے ہیں نظام چلنے دو

ضد ہے کیا وقت کو بدلنے کی
یونہی سب بے لگام چلنے دو

اہلیت کیا ہے میری چھوڑو اسے
نام کافی ہے، نام چلنے دو

مُفت مرتا نہیں تو راہوں میں
تجھ کو دیتے ہیں دام، چلنے دو

حق کو چھوڑو، کتاب کو چھوڑو
حکمِ حاکم سے کام چلنے دو

ہم جو اُترے تو پھر اندھیرا ہے
سو یہی غم کی شام چلنے دو

شاہ جائے گا، شاہ آئے گا
تم رہو گے غلام، چلنے دو

اتباف ابرک

دردِ مشترک

جج صاحب طلاق کے مقدمے میں شوہر سے پوچھتے ہیں۔

"تمہیں طلاق کیوں چاہیے؟"

شوہر کہتا ہے۔ "جج صاحب! میری بیوی مجھ سے لہسن چھلواتی ہے۔ پیاز کٹواتی ہے۔ برتن دھلواتی ہے۔"

جج صاحب۔ "تو اس میں کیا ہے۔ لہسن چھیلنے سے پہلے تھوڑا سا گرم کرلیا کرو، آسانی سے نکل جائے گا۔ پیاز کاٹنے سے پہلے تھوڑی دیر انہیں فریزر میں رکھ دیا کرو، اس سے کاٹتے وقت آنکھوں میں جلن نہیں ہوگی۔ برتن دھونے سے پہلے انہیں پانی سے بھرے ٹب میں دس منٹ بھگو دیا کرو، آسانی سے صاف ہو جائیں گے۔ کپڑے سرف میں بھگونے سے پہلے سادہ پانی میں بھگو لیا کرو، داغ آسانی سے نکلیں گے اور ہاتھوں میں تکلیف بھی نہیں ہوگی۔"

شوہر۔ "سمجھ گیا حضور۔"

جج صاحب۔ "کیا سمجھ گئے؟"

شوہر۔ "یہی کہ آپ کی حالت مجھ سے بھی بری ہے۔ آپ کی بیوی لہسن، پیاز اور برتنوں کے علاوہ کپڑے بھی دھلواتی ہے۔"

وجہ

ایک صحافی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ "فلاں صحافی بک گیا، فلاں نے اتنی رقم لے کر اپنا قلم بیچ دیا۔ اس نے صحافت کے مقدس پیشے کو بدنام کیا۔ غرض یہ کہ ہر صحافی اور ادیب بک گیا لیکن میں آج تک نہیں بکا۔"

دوسرے صحافی نے ساری بات سن کر کہا۔

"بھائی! تم جس اخبار میں لکھتے ہو، وہ اخبار کبھی فروخت نہیں ہوا پھر تم کیسے فروخت ہو سکتے ہو۔"

معصومیت

ایک دوست دوسرے دوست سے۔ "میں ملک کے مشہور رسائل میں اپنے مضامین بھیجتا ہوں اور مجھے ان اخبارات و رسالوں کے ایڈیٹرز کی طرف سے خطوط بھی آتے ہیں۔"

دوسرا دوست متاثر ہوتے ہوئے۔ "اچھا پھر تو تم بہت مشہور ہو گئے ہو گے مگر یہ تو بتاؤ، ایڈیٹر تمہیں خط میں کیا لکھتے ہیں۔"

پہلا دوست۔ "یہی کہ میری کہانیاں اور مضامین قابل اشاعت نہیں ہیں۔"

اندازہ

ایک ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں مریض کا مرض نہیں آتا، وہ اسے کہتے ہیں۔

"اس وقت یہ اندازہ لگانا کہ تمہیں کون سی بیماری ہے، ذرا مشکل ہے۔ میرے خیال سے یہ نشے کی وجہ سے ہے۔"

مریض۔ "بہت اچھا ڈاکٹر صاحب! میں اب اس وقت آپ کے پاس آؤں گا، جب آپ نشے میں نہیں ہوں گے۔"

ازالہ

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "اچھا تو تم نے گویا محبت کی اور دھوکا کھایا اور اس کے ساتھ ساتھ مالی نقصان بھی اٹھایا۔"

"نہیں، میں نے محبت تو کی لیکن نہ دھوکا کھایا نہ ہی مالی نقصان اٹھایا۔" دوست نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" اس شخص نے استفسار کیا۔

"انزلہ نے میری منگنی کی انگوٹھی اور میرے دیے ہوئے تحائف واپس کیے تو اس میں غلطی سے دوسروں کے دیے ہوئے کچھ تحائف بھی شامل تھے۔" دوست نے مسکرا کر جواب دیا۔

☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے نزدیک سب سے قابل رشک وہ مومن ہے جو ہلکا پھلکا (کم آمدنی والا) ہو، اسے نماز سے وافر حصہ ملا ہو (نفلی نماز اور تہجد زیادہ پڑھتا ہو) لوگوں میں گم نام ہو، اس کی پروا نہ کی جاتی ہو، اسے ضرورت کے مطابق رزق میسر ہو (اتنا زیادہ رزق نہ ہو کہ بچا کر رکھا جائے) وہ اس پر صبر کرے۔ (مزید کا لالچ نہ کرے) اسے جلدی موت آ جائے، اس کا ترکہ تھوڑا ہو، اور اسے رونے والیاں بھی کم ہوں۔"

تکبر،

ایک دن حضرت سلیمان بن داؤد نے انسانوں، جنوں، پرندوں اور چوپایوں سے کہا۔

"باہر نکلو۔"

دو لاکھ انسان، دو لاکھ جن باہر نکلے اور حضرت سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اڑنے لگا۔ اور اتنا بلند ہو گیا کہ آپ نے آسمانوں پر فرشتوں کی تسبیح کی گونج سن لی پھر آپؑ نیچے کو ہوئے تو آپ کے قدم سمندر کو چھونے لگے۔ آپؑ نے ایک آواز سنی کہ کوئی کہہ رہا ہے۔

"اگر تمہارے ساتھی کے دل میں ذرے کے برابر بھی تکبر آیا تو جتنا انہیں اونچا اڑایا ہے، اس سے زیادہ انہیں نیچے پھینک دیا جاتا۔"

کیڑے،

"جھوٹ، غیبت اور ناشکری ایسے کیڑے ہیں جو رزق کی کشادگی اور گھر کی خوش حالی کو آہستہ آہستہ کھا جاتے ہیں۔"

آخرت کی پہچان،

حضرت سعید بن عمرو فرماتے ہیں کہ ان کے شہر میں ایک عبادت گزار خاتون تھیں۔ رات میں وہ بہت کم سوتی تھیں۔ جب ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا۔

"قبر کی نیند بہت لمبی اور گہری ہے۔"

وہ خاتون سخت گرمی میں بھی برابر روزے رکھتی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کے چہرے کا رنگ کالا پڑ گیا تھا۔ جب ان سے روزے میں کمی کرنے کے لیے کہا گیا تو فرمایا۔

"اب میری آسودگی اور سیرابی تو آخرت میں ہی ہو گی۔"

حضرت محمد بن نضر اور ان کے ساتھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر آخرت کی باتیں کرتے۔ کچھ دیر بات کرنے وہ بزرگ خاتون فرماتیں۔

"اب اٹھ جاؤ، بات وہیں اچھی لگے گی، جہاں نہ کوئی غم ہو گا، نہ موت ہو گی اور نہ کوئی تھکن ہو گی۔"

رستم زماں،

گاما پہلوان کو بیس سال کی عمر میں "رستم ہند" اور اس کے بعد "رستم زماں" کا خطاب ملا تھا۔ ایک بار جلسہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال صدر تھے۔ گاما بھی جلسے میں موجود تھے۔ لوگ بول چکے تو آخر میں ڈاکٹر محمد اقبال نے اعلان کر دیا کہ گاما اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

گاما پہلوان کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر انہوں نے جسم کو حرکت دی، ہاتھ ادھر ادھر ہلایا اور کہا۔
"بھائی تھوڑی ورزش کیا کرو۔"
جب وہ اپنی مختصر تقریر ختم کر کے بیٹھے تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ گاما پہلوان کی نہ صرف پیشانی پر قطرات نمایاں تھے بلکہ کرتا بھی بھیگ چکا تھا۔
بڑے سے بڑا طاقت ور اور اپنے کام میں ماہر انسان اس وقت کمزور پڑ جاتا ہے، جب اسے وہ کام کرنا پڑے جس پر وہ عبور نہیں رکھتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

"کسی آدمی کے حسن اخلاق پر بھروسا مت کرو جب تک غصے کے وقت اس کا تجربہ نہ کر لو۔"

دعویٰ،

اسلام میں داخل ہونے کے بعد اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ دوسرے مسلمانوں پر فوقیت رکھتا ہے تو اسے غلط سمجھیں۔ اپنی فضیلت کو فضیلت کے طور پر بیان کرنا ہی فضیلت کی نفی ہے۔ انسان کی خود ستائی بے جہالت ہے۔ اصل فضیلت تو دوسروں کو فضیلت دینے میں ہے۔

(واصف علی واصف)

اقوال رومی،

پر سکون زندگی بسر کرنے کے دو ہی آسان، قابل عمل اصول سمجھ میں آئے۔
1۔ جس پر من ٹھکے، اس پر مکمل یقین، اعتماد اور ایمان رکھو۔ اس کے ظاہری قول و فعل کا موازنہ نہ کرو کہ بہت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔
2۔ جو من کو نہ بھائے، آنکھوں میں نہ سمائے، اس پر کبھی یقین اور بھروسا نہ کرو، اس سے کوئی خوشی ملے گی نہ برکت و بہتری۔

زاویۂ نگاہ،

تین آدمی اینٹیں جوڑ جوڑ کر رکھ رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔
"میں روزی کما رہا ہوں۔"
دوسرے نے کہا۔ "میں اینٹیں جوڑ رہا ہوں۔"
تیسرے نے کہا۔ "میں خوبصورت یادگار تعمیر کر رہا ہوں۔"
تین آدمی ایک ہی کام کر رہے تھے لیکن ان کا زاویہ نگاہ مختلف تھا۔ اسی لیے اپنے کام کے حوالے سے ان کا زاویہ بالکل مختلف تھا۔ سوال یہ ہے کہ ان کے رویے کا اثر ان کی کارکردگی پر پڑ رہا تھا؟ جواب ہے یقیناً۔
کوئی شخص اعلا کارکردگی کا مظاہرہ تب ہی کرتا ہے، جب وہ اپنے کام پر فخر محسوس کرتا ہے۔ ہر کام اس کے کرنے والے کا سیلف پورٹریٹ ہوتا ہے۔ کام خواہ کوئی بھی ہو، کاریں دھونا، فرش صاف کرنا یا کسی گھر پر رنگ و روغن کرنا۔
مائیکل اینجلو ایک مجسمے پر کئی دن سے کام کر رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بار بار دیر تک کام کر رہا تھا۔ ایک دیکھنے والے نے سوچا کہ وہ غیر اہم کام کر رہا ہے۔ اس نے مائیکل اینجلو سے پوچھا۔
"وہ اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے؟"
مائیکل اینجلو نے جواب دیا۔
"کاملیت چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ابھرتی ہے اور کاملیت کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے۔"
اکثر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی کام آپ نے کتنی دیر میں کیا تھا لیکن یہ یاد رکھتے ہیں کہ آپ نے اسے عمدگی سے کیا تھا۔

ایسے لوگوں کی مدد کرو جو تمہیں صلہ نہیں دے سکتے،

عالمی شہرت یافتہ نفسیات داں ڈاکٹر کارل مینگر نے ایک مرتبہ کہا تھا۔
"اگر تمہیں علم ہو کہ کسی شخص کا نروس بریک ڈاؤن ہونے والا ہے تو تم اسے کیا نصیحت کرو گے؟"
سامعین کو توقع تھی کہ ڈاکٹر مینگر کہے گا کہ اسے کسی

نفسیاتی معالج کے پاس جانا چاہیے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کہا۔

"میں اس شخص کو نصیحت کروں گا کہ وہ شہر کی دوسری جانب جائے۔ کسی ضرورت مند کو ڈھونڈے اور اس کی مدد کرے۔ ایسا کرنے سے اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

رضاکار بنو۔ اس سے تم میں اپنے قابل قدر ہونے کا احساس جنم لے گا۔ جس طرح تمہیں توقع ہے کہ دوسرے تمہاری مدد کریں، اسی طرح دوسروں کی مدد کرو گے تو تم میں طمانیت کا احساس پیدا ہو گا۔ صلے کی توقع کے بغیر دینے سے انسان کی عزتِ نفس بڑھ جاتی ہے۔

صحت مند شخصیت کا حامل فرد نہ صرف حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے بلکہ دینے کا۔

سنہرے حروف

- بری صحبت سے تنہا رہنا بہتر ہے۔
- مجھے وہ دوست پسند ہے جو محفل میں میری غلطیاں چھپائے اور تنہائی میں میری غلطیوں پر مجھے سمجھائے۔
- کمزور انسان کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ معاف کرنا مضبوط لوگوں کی صفت ہے۔
- گناہوں کی بدبو کی وجہ سے ہماری دعائیں مردہ ہو جاتی ہیں۔
- بات الفاظ کی نہیں لہجے کی ہوتی ہے۔
- زندگی بہت مختصر ہے۔ اسے عداوتوں کے پیچھے ضائع نہ کیجیے۔
- بڑا انسان وہ ہے جس کی محفل میں کوئی خود کو چھوٹا نہ سمجھے۔
- آزادی کی تکلیف، غلامی کے آرام سے بہتر ہے۔
- نیکی کرنا آسان ہے لیکن نیکی کی حفاظت کرنا بہت مشکل ہے۔

آسیہ جاوید۔ (بارہ دری) علی پور چٹھہ

صائب مشورہ

محمد تغلق کی سختیوں اور حماقتوں سے ملک میں بغاوت رہتی تھی۔ مخلوق تباہ اور ملک ویران تھا۔ ایک دفعہ نہایت پریشانی کے عالم میں تھا کہ ضیائے برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کو بلایا اور کہا۔

"میری حکومت کو مختلف امراض نے گھیر لیا ہے۔ ایک کا علاج کرتا ہوں۔ وہ اچھا نہیں ہو پاتا کہ دوسرا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ ان امراض سے نجات ہو سکے۔"

ضیائے برنی کو خدا نے جرأت کی توفیق دی وہ آزادانہ بولا۔

"جب کسی بادشاہ سے خلائق کو نفرت ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ اپنی حکومت اپنے کسی بھائی بیٹے کو دے کر گوشہ نشین ہو جائے یا اس کام کو چھوڑ دے کہ جس سے مخلوق کو نفرت ہو۔"

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

- کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم نے اس چیز کو سمجھے اور اس کے دل میں اتر جانے کی بھی [illegible] کی جسے تم بدصورتی [illegible] ہو۔ (یونانی)
- کسی کو بدصورت نہ کہو سوائے ان بھیانک یادوں کے جن سے تمہاری روح خوف محسوس کرے۔ (سقراط)
- بدصورت چہرہ بدصورت دماغ سے بہتر ہے۔ (ورجل)
- دنیا کا کوئی آئینہ انسان کو اتنا بدصورت نہیں دکھا سکتا، جتنا زندہ ضمیر تمہارے گناہ دکھاتا ہے۔ (جلال السیدی)
- کسی انسان کو بدصورت مت کہو۔ (ارسطو)
- بدتر وہ ہے جس کی سیرت بدصورت ہے۔ (ہٹلر)

رضوانہ وقاص ــــــ ہری پور

کوئی اس سے جا کے پوچھے کہ ملا ہے کیا بچھڑ کے
میں بھی خاک چھانتی ہوں، وہ بھی خاک چھانتا ہے

عنبر افشاں ــــــ ناظم آباد کراچی

یہ کیوں رک گئے کارواں چلتے چلتے
چلو دیکھتے ہیں نشاں چلتے چلتے
زمیں کی کوئی بات من کو لگی کیا
جو یوں رک گیا آسماں چلتے چلتے

فرخندہ ــــــ ملتان

میں نے کھویا وہ جو میرا تھا ہی نہیں
اس نے کھویا وہ جو صرف اسی کا تھا

زرینہ خانم ــــــ مظفر گڑھ

عمر مصروف کوئی لمحہ فرصت ہو عطا
میں کبھی خود کو میسر نہیں ہونے پایا

فرح شاہد ــــــ کراچی

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے رکتے ہیں گزر جاتے ہیں

ثمرہ عاقب ــــــ گرین ٹی

جمع تم ہو نہیں سکتے ننفی سے مجھے نفرت ہے
تمہیں تقسیم کرتا ہوں تو حاصل کچھ نہیں ہوتا

فضہ بلال ــــــ ڈیفنس گارڈن

آیا ہوں کہاں سے سرِ شام نہ پوچھا
بستی کے چراغوں نے مرا نام نہ پوچھا
میں نے بھی اسے دیکھ کے رخ پھیر لیا تھا
اس نے بھی مرا حال سرِ عام نہ پوچھا

ارم کمال ــــــ فیصل آباد

بچھڑنے کا وہ پہلے سے ارادہ کر چکا تھا
اسے بس میری طرف سے بدگمانی چاہیے تھی

فائقہ سہیل ــــــ کراچی

یہ عبادت ہے کہ تو ہی عبادت ہے
جب کوئی یاد نہ آیا تو خدا یاد آیا

نادیہ فیصل ــــــ گجرات

صرف اتنا ہی بتا دے میرے خاموش مسیحا
اور کس کرب سے گزروں کہ تو بول اٹھے

نادیہ یاسر ــــــ گوجر خان

میری محبت کے دونوں عالم، تمام روشن تمام محکم
میں یاد کرنا بھی جانتا ہوں میں یاد آنا بھی جانتا ہوں
مجھے سمندر کے پانیوں میں کسی کی خاطر تو ڈوبنا ہے
اگر چہ لہروں کے درمیاں سے میں پار جانا بھی جانتا ہوں

ندا طارق ــــــ کراچی

نظر نظر میں ہے کامرانی، قدم قدم پہ ہے کامیابی
مگر کوئی مسکرا کے دیکھے تو ہار جانا بھی جانتا ہوں

حریم عاشر ــــــ گوجرہ

تجھ سے درکار محبت ہے محبت کے عوض
میں نہیں چاہتا مجھ پہ کوئی احسان رہے

صدف عمران ــــــ کے ڈی اے

اپنی تنہائی سے وحشت نہیں ہوتی مجھ کو
کیا عجب شے ہوں محبت نہیں ہوتی مجھ کو

صفیہ سلطان ــــــ گوجر خان

حل نکالا ہے یہ اداسی کا
اب مکمل اداس رہتا ہوں

عابدہ نثار ــــــ کراچی

ہم ہی ممکن ہے ترے ناز اٹھانے لگ جائیں
پہلے یہ زخم پرانے تو چھپانے لگ جائیں
روتے روتے کبھی آنکھ چھلک اٹھتی ہے
کیا کریں دل کو اگر روگ پرانے لگ جائیں

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

رضوانہ وقاص، ہری پور ہزارہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے
ماڈل ہنستی مسکراتی پسند آئی۔ "پہلی شعاع" پڑھا۔
یہ موسم بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ ہر طرف پھول کھل رہے ہیں، مجھے پھول، پودے بہت پسند ہیں۔ بات ہو رہی تھی پھولوں کی تو میں ادھر کوٹ نجیب اللہ سے گلاب کی قلمیں لے کر آئی۔ امی کو بولا لگائیں۔ میں خود زمین پر بیٹھ کر نہیں لگا سکتی پودے وغیرہ۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔ وہ گملے لے کر آتے ہیں، پھول لگے ہوئے۔ دو نارنج منگل کو شعاع بھی لائے اور پھولوں والے گملے بھی کیونکہ پھول کھلتے دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ میرے بیٹوں کو بھی میرے شوق کا پتا ہے۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ عباس تیسری میں، عالیان پہلی میں پڑھتا ہے۔ وہ بھی اپنے پاپا کے ساتھ بازار جائیں تو بولتے ہیں، پاپا پھول لینے ہیں، مما کو پسند ہیں۔ اللہ میرے بچوں کو لمبی زندگی دے، صحت و تندرستی والی۔ میں ان کی خوشیاں دیکھ سکوں، آمین۔ آپ سب سمجھتے ہوں گے میں بہت بڑی عمر کی ہوں نہیں، لیکن مجھ کو پتا نہیں کیا بیماری ہو گئی ہے جس کا ڈاکٹر بھی علاج نہیں بتا رہا ہے۔
"حمد و نعت" پڑھی، دل کو سکون ملتا ہے۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" بہت ہی اچھی تھیں۔ اس دفعہ خوابوں کی تعبیر کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ز۔ ڈ کا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ لیکن اس بات پر ہنسی آ گئی کہ شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا ہے۔ واہ جی، کیا بات ہے آپ کی۔ "بندھن" پڑھا۔ مصباح نوشین نے بھی بہت اچھا انٹرویو دیا۔ شادی نبھانے کے لیے میاں بیوی دونوں کو خیال رکھنا چاہیے۔ ان کی یہ بات اچھی لگی کہ جب شوہر کو غصہ آئے تو سامنے سے ہٹ جانا چاہیے۔ بدر خلیل کا انٹرویو پڑھا۔ اللہ آپ کے بچوں کو خوش رکھے، جو آپ کا اتنا خیال رکھ رہے ہیں۔ اب ڈراموں میں محبت کے علاوہ کچھ نہیں دکھایا جا رہا ہے۔ ہمارے بچے خراب ہو رہے ہیں نہ ہی سر پر دوپٹا ہوتا ہے۔ شرم تو رہی نہیں لڑکیوں میں۔ ہم مسلمان ہیں لیکن ہم میں مسلمانوں والی کوئی بات نہیں رہی۔ "نور القلوب" ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ "یار دل دار" کا مزاج اچھا ہے۔ جنت حسین کا مکمل ناول اچھا جا رہا ہے۔ پلیز جنت و فارس سے علیحدہ نہیں کرنا۔ یہ فارس اتنا روکھا کیوں ہے جنت کے ساتھ۔ "شام کی حویلی میں" پلیز بتائیں نا کشف کس کی بیٹی ہے۔ تھوڑا اس کے صفحات بڑھائیں، جب پڑھنے کا مزا آنے لگے تو آئندہ ماہ دیکھ کر پورا مہینہ انتظار کرتے رہیں۔ "یہ زندگی کی راہ گزر" پڑھا۔ اپنے اپنوں کے ساتھ ایسا رویہ کیسے رکھ لیتے ہیں۔ امیری غریبی تو اللہ کی طرف سے آتی ہے۔ صائمہ گل آپ کے بچوں نے قرآن حفظ کر لیا۔ ترجمہ کے ساتھ پڑھا، دلی مبارک باد۔ میری بھی شادی میں دو لہنگے تھے، ایک سسرال کی طرف سے، ایک میکے کی طرف سے۔ سیدہ بخاری کا خط اچھا لگا، خاص کر چھوٹے بچوں کی باتیں، بہت ہی اچھی لگتی ہیں۔ ماشاء اللہ میرا بیٹا ارسلان بھی پونے تین سال کا ہے۔ وہ بھی ایسی

باتیں کرتا ہے کہ بندہ ہنستا ہی رہے اور جو آپ نے اپنی دوست کے مالٹے کھانے کا احوال سنایا۔ بہت ہنسی آئی۔

کیا بات ہے جی، واہ واہ۔ سائرہ نورین اللہ آپ کو صبر دے۔ آپ کا بیٹا ایکسیڈنٹ میں جان سے گیا، بہت افسوس ہوا اور اللہ آپ کے بیٹے کو جنت میں جگہ دے، آمین۔ صفیہ مہر آپ کا خط پڑھا، اب جیسا کہ آپ کو پتا ہے میں زیادہ چل نہیں سکتی تو میں اپنے چھوٹے بیٹے ارسلان کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ چڑی اڑی، یہ ہمارا بھی پسندیدہ کھیل تھا اب بچوں کو بتاتی ہوں وہ کہتے ہیں، مما یہ کیسا کھیل ہے۔ چڑی اڑی، کوا اڑا، طوطا اڑا وغیرہ وغیرہ۔ مافیہ ارشد اللہ آپ کی والدہ کے دل میں آپ کے لیے جگہ بنائے۔ آپ کوئی کورس کرلیں۔

☆ پیاری رضوانہ! اللہ آپ کو صحت کاملہ سے نوازے۔ آپ نے بیماری کے باوجود ہمیں اتنی محبت سے خط لکھا، ہم آپ کی دل سے قدر کرتے ہیں۔

گوجرانوالہ سے صدف ناصر نے لکھا ہے

تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر سے حاضر خدمت ہیں۔ دیور کی شادی، بے انتہا کام، تن تنہا تمام تیاریاں پھر شادی کے بعد کی تھکن۔ اف...... اللہ کا شکر ہے تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے سر انجام دیں۔ خط لکھنے کی وجہ صرف اور صرف ”خالدہ جیلانی“ ہیں۔ انتہائی دکھ ہے۔ ایسے ہی روئی ہوں، جیسے اپنے سگوں کے جانے پر انسان روتا ہے کیونکہ میرے لیے پورا ڈائجسٹ ایک طرف اور ”خالدہ جیلانی“ ایک طرف۔ میری ان سے دلی وابستگی ہوگئی تھی، بہت سالوں سے۔ وجہ؟ نہ کبھی خالدہ جیلانی کو دیکھا نہ سنا، پھر کیوں؟ تو وجہ یہ ہوئی مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا تھا سوائے ابلے چاولوں اور چائے کے۔ شادی کے بعد جب ذمہ داری سر پر پڑی تو یہ چیز طعنہ بن گئی۔ موبائل بھی نہیں تھا نہ ٹی وی میں دلچسپی۔ تب اپنے ڈائجسٹوں کا ڈھیر کام آیا۔ آسان سے آسان کھانا بنانے کی تراکیب خالدہ جیلانی کے پاس موجود تھیں۔ جنہیں شادی سے پہلے سرسری نظر دوڑا کے گزر جاتے تھے۔ اب رفتہ رفتہ ہر ڈش اپلائی کی۔ کچھ گوجرانوالہ شہر کے لوگ ماشاء اللہ سے کھانے میں کمپرومائز پسند بھی نہیں کرتے تو خالدہ جیلانی کی بدولت آج الحمدللہ میں بہت اچھا کھانا بنانا سیکھ گئی۔ میرے ہر تبصرے میں لازمی کوکنگ کے سلسلے میں خالدہ جیلانی سے فرمائش ہوتی اور وہ پوری بھی ضرور کرتیں۔ کریلوں کی ڈشز ہمیشہ میری فرمائش پر آتیں اور میں گھر والوں کو کھلا کھلا کر خوب تعریفیں سمیٹا کرتی۔ گلی میں بہت سی دوست ہیں انہیں بھی ہر ڈش بھیجتی۔ وہ مجھے آ کے کہتیں، اتنی زبردست بنائی، اس کی ترکیب بتاؤ۔ میں بتا دیتی۔ وہ ٹرائی کرتیں تو اچھی نہ بنا پاتیں۔ دوبارہ آ کے غصہ کرتیں کہ گھر والوں نے تمہاری ڈش بہت مزے اور شوق سے کھائی، پر ہم نے بنائی تو کھائی نہیں (ہاہاہا)۔ تو میں ڈائجسٹ ہی دے دیتی کہ خود دیکھ کر بنالو۔ باجی سائرہ جو خود بہترین کھانا بناتی ہیں، انہیں میرا کھانا کبھی پسند نہیں آتا تھا۔ اب وہ برملا کہتی ہیں کہ ”واہ! تمہیں تو بہت اچھا کھانا بنانا آگیا۔“ اور آج میری محسن خالدہ جیلانی خالق حقیقی سے جاملیں۔ اللہ پاک ان کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے درجات بلند فرمائے۔ جتنی آسانیاں انہوں نے ہم سب کو دی ہیں، اس سے زیادہ آسانیاں انہیں عطا ہوں، آمین۔

بہترین سرورق سے سجا شعاع ازحد پسند آیا۔ ”حمد و نعت“ ہمیشہ کی طرح شان دار۔ ”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ سے ایمان افروز ہوئے۔ ”کچھ باتیں کچھ یادیں“ افسردہ کر گئیں۔ ”نانا جوڑا ہے“ بے حسی کی عملی جیتی جاگتی تصویر۔ ساس صاحبہ، بہت بھگتی ہیں ہم نے بھی، اس رشتے کے نام پر کبھی خالہ ساس، کبھی پھوپھو ساس، دادی ساس اف...... ایک سے بڑھ کر ایک۔ ”بندھن“ نے حقیقتاً کمال کردیا۔ ماشاء اللہ مصباح تو بہت بہت شان دار ہیں۔ اللہ ہمیشہ اپنا کرم رکھے، آمین۔ مکمل ناول ”بمبئی کی بانو“ آغاز سے اختتام تک تقریباً اردگرد سے بے ہوش اور بے خبر ہو کر پڑھی۔ سچی کہانی تھی، کسی بچی لڑکی کی، اینڈ تھوڑا الجھا ہوا، جلد سمیٹ لیا گیا کہانی کو۔ مگر بہرحال شان دار تحریر۔ شکریہ امت العزیز شہزاد۔

”طلوع و غروب“ نعیمہ ناز آپ کا یہ اسٹائل تو نہیں پھر کیوں لکھا آپ نے اس ٹاپک پر۔ آپ کے انتہائی

گھریلو، محبتوں سے گندھے ناول اور ناولٹ ہمیں پسند ہیں۔ معذرت کے ساتھ، یہ تحریر تھوڑی سی پڑھ کر چھوڑ دی۔

"نور القلوب" اور "عسر یسرا" زیر مطالعہ ہیں۔

"عسر یسرا" کے کردار واضح ہو رہے ہیں۔

افسانوں کی نگری میں "خیالی پلاؤ" نے بے ساختہ بے حد ہنسایا۔ افسوس ہمیں بھی بہت ہوا۔ "نہ والی بریانی" کا۔ "نور نظر" نے بھی زبردست لکھا۔ "لوگ کیا کہیں گے" سچی کہانی۔ بھئی لوگ تو کسی حال میں بھی جینے نہیں دیتے۔ ابا نے دیر سے ہی سہی پر اچھا فیصلہ کیا۔ "شمیم رانی" بہت ترساترسا کر ملاقات کرواتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح "سوزش دل" سبق آموز اچھی تحریر۔ بابا اور بھائی دونوں ظالم تھے۔ بالآخر اپنے انجام کو پہنچے۔ واقعی اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ "یار دل دار" میں پتا نہیں کیوں مجھے مزاح ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ سوری۔ حنا بشریٰ نے "تدبیر" لکھ کر کمال کر دیا۔ مشتاق اور اقصیٰ جیسے بظاہر سادہ لوح لوگ جنھوں نے اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی ہوتی، یہی لوگ بڑے بڑے پڑھے لکھوں کو "چونا" لگا جاتے ہیں۔ فریحہ اشتیاق نے اچھا لکھا۔ اگرچہ ٹاپک پرانا مگر چلیں ہماری نو آموز رائٹر ہیں۔ ابھی ان کو خصوصی رعایت ہے۔ پچھلے افسانے فریحہ کے نئے موضوعات پر تھے۔ آفٹر آل بھی میرے اپنے شہر کی ہیں، ہاہاہا۔ "خط آپ کے" پسندیدہ ترین محفل۔ وکٹری اسٹینڈ پر اپنی صائمہ گل براجمان ہیں۔ آپ کے بچے ماشاء اللہ راہ ہدایت پر ہیں، مبارک باد۔ امرحہ کا نام بہت پیارا ہے۔ آپ حسنہ حسین کی بہن تو نہیں؟ سیدہ بخاری ویلکم بیک۔ آپ کا شکوہ غلط ہے۔ سب قاری بہنوں اور ادارہ نے آپ لوگوں کو یاد کیا۔ ثریا راجپوت کے جب سے گھریلو حالات پڑھے ہیں تب سے ہم ان سے بہت اُنسیت محسوس کرتے ہیں۔ باقی سب بہنوں کے خطوط بھی اچھے رہے البتہ ریحانہ چوہدری ہماری طرح غیر حاضر ہی ہیں۔ حمیرا شفیق بھی خاموش۔ حمیرا گل بھی۔ واپس آجاؤ، ساری بہنو!

"آئینہ خانے میں" ختم کر کے کوئی اور سلسلہ شروع کر دیجیے، مہربانی ہوگی۔ "تاریخ کے جھروکے" زبردست سلسلہ۔ مجموعی طور پر شعاع اس مرتبہ تھوڑا اداس کر گیا کیونکہ ایک ہی ناولٹ وہ بھی نہیں پڑھا۔ دو ناولٹ ہوتے، دونوں ہی شاندار تو مزا آتا۔ "بندھن" بے حد اچھی تبدیلی۔ ہماری رائٹرز کو بھی جگہ دیجیے گا پلیز۔

☆ پیاری صدف! تفصیلی تبصرہ کے لیے بہت شکریہ۔ کوشش کریں گے، ناولٹ کی تعداد بڑھائی جاسکے۔

لاہور سے ریحانہ نے لکھا ہے

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاموشی سے آپ کے رسالے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ہم بھی ان میں سے ایک ہیں۔ نہ جانے کتنے سال بیت چکے ہیں آپ کے رسالے بلکہ اب تو ہمیں اپنا ہی لگتا ہے۔ جس سے ہمارا گہرا رشتہ ہے۔ ہماری بڑی بہن جس کی شادی کو بھی پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ شادی سے پہلے سے لے کر اب تک جب بھی نیا شعاع خریدتی ہے تو پہلے اس کو اچھے سے کور کرتی ہے پھر پڑھتی ہے اور دوسروں کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی۔ اس کے پاس رسالوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، خیر میں اب آتی ہوں شعاع کی طرف۔ اس مرتبہ کے افسانے "ماں اور ساس"، "چھوٹے عمل"، "ایک گلاس کی پیاس" اچھی تحریریں تھیں۔ "چار سو پھیلی محبت" کچھ خاص تاثر نہیں چھوڑ سکی۔ ناولٹ "بلی پھپھو" اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ یہ ہر گھر کی کہانی ہے، ہماری خود کی دو عدد نندیں ہیں جن کے آنے اور جانے پر خوب پروٹوکول دیا جاتا ہے اور جاتے وقت وہ جتنا مرضی مال غنیمت لوٹ کر لے جائیں، ہمت نہیں ہماری کہ اف بھی کر جائیں ورنہ وہ قیامت آتی ہے کہ پڑوسی خوب مزا لیتے ہیں۔ بنا بتائے بیڈ کی چادریں، سوٹ، میک اپ کا سامان، غرض جو دل میں آئے اپنی مرضی سے لے جاتی ہیں۔ خیر یہ ازل سے ابد تک کی کہانی ہے۔ اچھا میری بہنوں سے التماس ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی ٹوٹکا یا وظیفہ ہے تو پلیز مجھے بتا دیں۔ میرا چھ سال کا بیٹا ہے، اس کے بولنے کا مسئلہ ہے۔ میں نے ہر طرح کا علاج کروا لیا ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اس کی زبان کی نوک پر کمزوری ہے۔

☆ پیاری ریحانہ! اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ آپ

کے بیٹے کو شفائے کلی عطا فرمائے۔ زبان کی نوک کی کمزوری والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ اسپیچ تھراپی بھی اس کے لیے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔

اتنے طویل عرصہ بعد آپ نے خاموشی توڑی اور خط لکھنے کی ہمت کی۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ اپنی بہن کو ہمارا اسلام پہنچا دیں۔

مبین، معافیہ اور ثمرین منڈی بہاؤ الدین سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

شعاع سے ہمارا تعلق تین سال پرانا ہے۔ رسالے شروع سے ہی ہمارے گھر میں پائے جاتے تھے۔ میری آپی اور کزنز پڑھتی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ہمیں بھی شوق ہوا۔ اب وہ تو پیا دیس سدھار گئیں لیکن ان کی جگہ ہم نے سنبھال لی۔ اب ہم چار کزنز اور تین بہنیں مل کر رسالہ منگواتی اور پڑھتی ہیں۔ اس بات پر ہمیشہ جھگڑا رہتا ہے کہ شعاع ہم رکھیں کہ وہ۔ اب یہ ہماری خوش قسمتی کہ شعاع ہمارے حصے میں آیا۔ میری بھابھی رسالہ نہیں پڑھتیں مگر سمیرا حمید کی "طواف عشق" پڑھ کر وہ ان کی دیوانی ہو گئیں۔ اب وہ صرف سمیرا حمید کو پڑھتی ہیں۔ کہانی پڑھنے کے بعد ہم سب کزنز ان پر تبصرہ کرتی ہیں اور وہ کزنز جو رسالہ نہیں پڑھتیں، وہ اس بات پر بہت چڑتی ہیں۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" بلاشبہ ایک اچھا سلسلہ ہے جو میری بھابھی شوق سے پڑھتی ہیں۔ ثمرین کو کہانی لکھنے کا بہت شوق ہے۔ زینب نور کے خط مجھے بہت پسند ہیں۔ تبسم کافی دن ہو گئے، آئی نہیں۔ خیریت ہے؟

☆ مبین، معافیہ اور ثمرین! آپ تینوں کزنز نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ سمیرا حمید واقعی بہت اچھی رائٹر ہیں۔ ہمیں بھی بہت پسند ہیں۔ آج کل وہ کچھ کم لکھ رہی ہیں۔ ثمرین کی کہانی بھجوا دیں، قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہو گی۔

صاحبہ حیات، جام پور ضلع راجن پور سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

آپ کی خوش قسمتی یہ ہے کہ آپ وہ پہلے ہیں جس کو ہم خط لکھ رہے ہیں (اب خوش قسمتی اور بدقسمتی کا اندازہ تو آپ خط پڑھنے کے بعد ہی لگا سکتے ہیں) ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ خط لکھنے کا فیصلہ تو میں نے شوق میں آ کر کر لیا مگر مجھے خط لکھنا آتا نہیں تھا اور ہر بار کی طرح یہ مسئلہ اپنی والدہ محترمہ کی دو نمبر اولاد (اپنی چھوٹی بہن) کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئی کہ بتاؤ بھئی خط کیسے لکھا جاتا ہے۔

بولیں۔ "توبہ ہے صاحبہ! فرسٹ ایر میں آ گئی ہو مگر آج تک خط لکھنا نہ آیا تمہیں۔"

بولی۔ "لکھ دو، امید ہے شعاع آپ خیریت سے ہوں گی (واقعی)۔"

میں نے کہا۔ "شعاع کسی لڑکی کا نام نہیں ہے۔"

مگر قصور اس کا نہیں ہے یقیناً...... ہمارے گھر میں تو کسی کو ناولز اور ڈائجسٹ نامی بلا کا علم ہی نہیں ہے۔ مجھے بھی نہیں تھا وہ تو بھلا ہو، ہمارے انگریزی کے سر راشد صاحب اک دن مجھ سے بولے۔ "صاحبہ! تم کوئی ڈائجسٹ لے آؤ۔ تمہیں اردو سے انگریزی ترجمہ کرنا اسی سے سکھاؤں گا۔" جانتے ہیں میرے دماغ میں ڈائجسٹ سن کر کیا چیز آئی "نظام انہضام" (ناقص علم)۔ میں نے کہا۔ "سر اخبار سے پڑھا دیں، اب کیا میں نظام انہضام کی کتابیں پڑھتی پھروں۔" (یہ تقریباً چار ماہ پہلے کی بات ہے) ابھی تو دہم جماعت میں سائنسی مضامین سے جان چھڑائی ہے۔ مکمل ایف اے کر کے خاندان والوں کو ناراض کر رکھا ہے (یعنی سائنسی مضامین کے شیدائی جو ٹھہرے سب کے سب) تو بولے۔ "بیٹا آپ کو واقعی ڈائجسٹ کا علم نہیں ہے یا پھر مذاق کر رہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "سر ڈائجسٹ کا علم ہے مگر سائنس سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔"

اگلے دن انہوں نے ایک 2016ء کا پرانا شعاع لا کر میرے حوالے کر دیا۔ اس میں سب سے پہلے جو کہانی میں نے پڑھی وہ ایمل رضا کا "پیالہ ساز" تھی۔ ہمارے گھر میں کسی کو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور چار ماہ پہلے کی گئی سر کی گفتگو کے بعد مجھے ادب کے علاوہ کسی چیز سے لگاؤ نہیں رہا۔ میں نے ناولز پڑھنے شروع کر دیے، کرونا لاک ڈاؤن کی وجہ سے میرے پاس وقت ہی وقت تھا اور اس سارے عرصے میں، میں نے تقریباً انیس ناولز

پڑھے۔ شعاع ایک بار پڑھا تو معلوم تھا خطوط کی ذریعے میں آپ سے رابطہ کرسکتی ہوں تو کیوں نہ ان کی تحریر خود تک پہنچانے والوں کا شکریہ ادا کیا جائے جنہوں نے مجھے نمرہ اور عمیرہ سے ملوایا اور ایمل رضا کے ذریعے فلسفے سے محبت کرنا سکھائی، پھر کیا میں نے قلم اٹھایا اور آپ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

شکریہ آپ نے مجھے جینا سکھایا اور آپ نے مجھے ایک نئی دنیا سے روشن کرایا۔

آپ کی وجہ سے میں نے بھی لکھنا شروع کردیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا، اپنے اندر کے ہنر کا مگر آپ نے مجھے میری صلاحیتوں سے روشناس کرایا، آپ کا شکریہ۔

آخر میں اپنے کزن عبداللہ کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جس نے آپ تک خط پہنچانے کی ذمہ داری لی ہے۔

☆ پیاری صاحبہ! دس فل اسکیپ صفحات پر مشتمل آپ کا خط پڑھا۔ بہت دلچسپ ہے لیکن کچھ زیادہ ہی طویل تھا۔ جس کی بنا پر ہمیں ایڈیٹ کرنا پڑا۔

صاحبہ! ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خط لکھا۔ اس خط میں کسی کہانی کے متعلق نہیں لکھا۔ آئندہ خط لکھیں تو شعاع کی کہانیوں کے بارے میں بھی لکھیں۔

حریم نواز ملغانی نے بستی سوکڑ سے لکھا ہے

تنزیلہ ریاض کا لازوال ناول "نور القلوب" پڑھا۔ اس ماہ کی قسط بھی زبردست تھی۔ اس کے بعد پہلے "عمر یسرا" پڑھا۔ واہ واہ حسنہ جی! مجھے لگتا ہے یہ ناول آپ کو شہرت کی بلندیوں تک لے جائے گا۔ حسنہ جی سے درخواست ہے کہ "عمر یسرا" کے ختم ہونے کے بعد ٹریٹ کے طور پر ایک مکمل ناول ہونا چاہیے۔ "شام کی حویلی میں" کیا کشف سونیا کی بیٹی ہے؟ یہ جان کر جھٹکا لگا۔ دیکھیں، اب آگے رخسانہ جی کیا کرتی ہیں۔ سمیرا حمید اور سائرہ رضا کہاں ہیں۔ نظر ہی نہیں آتیں، اس کے بعد سارا شمارہ پڑھا۔ زبردست۔ اگر ہم پرانے ڈائجسٹ منگوانا چاہیں تو ایک شمارے کی قیمت کیا ہوگی؟

☆ پیاری حریم! آپ کون سے پرانے ڈائجسٹ منگوانا چاہتی ہیں۔ اگر ہمارے پاس دستیاب ہوئے تو آپ کو بھجوادیں گے۔ قیمت وہی ہوگی جو ایک عام شمارے کی ہوتی ہے۔

ثانیہ بلال، کائنات، عائشہ لاریب نے عالیوالہ سے لکھا ہے

میں ثانیہ بلال ہوں، خانیہ بلال نہیں۔ آپ نے پہلے بھی میرا نام غلط شائع کردیا۔ "نور القلوب" بہت اچھا ہے۔ "شام کی حویلی" اب ختم ہونے والا ہے۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا کہ کشف سونیا کی بیٹی ہے۔ "عمر یسرا" بہت ہی اچھی کہانی ہے۔ "یار دل دار" بہت اچھا افسانہ ہے۔ ہم کالج میں بیٹھ کر لکھ رہے ہیں۔ بارہویں جماعت کی اقراء ہمارے ساتھ بیٹھی ہے۔ اقراء کو ڈاکٹر فریال کے خط بہت اچھے لگتے ہیں۔ زینب نور جہانیاں! میں بھی دوستوں کو بہت عزیز رکھتی ہوں۔ مجھے بھول جانے کی غلطی مت کرنا۔ خالدہ جیلانی کا بہت افسوس ہوا۔ میں ان کی ساری چیزیں، سارے پکوان بناتی تھی۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ جب میری کزنز نے میرا خط دیکھا تو حیران رہ گئیں۔ وہ بچپن سے آپ کے رسالے پڑھتی ہیں لیکن خط لکھنے کی ہمت کسی نے نہیں کی۔ بقول ان کے ثانی! تم تو چھا گئی ہو۔ میں کائنات ہوں اور ثانیہ مجھ سے خط لکھوا رہی ہے۔ ہم نے پیریڈ نہیں لیا۔ ثانیہ مجھے بہت ہی اچھی لگتی ہے۔ وہ مجھے کہتی ہے کہ رسالے پڑھا کرو۔

☆ پیاری ثانیہ! آپ نے ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی لیکن پیریڈ چھوڑ کر خط لکھا۔ یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ پڑھائی پہلے پھر سارے مشاغل۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو کامیاب کرے، آمین۔

کائنات، عائشہ اور لاریب کو ہمارا اسلام پہنچادیں۔

ثانیہ مرتضیٰ کراچی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

الحمد للہ 18 فروری کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔ زندگی ایک نئے سفر پر چل نکلی۔ کبھی خوشی تو کبھی اپنوں سے جدائی کا غم۔ زندگی کچھ عجیب سی بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ اب جاکر ذہن کچھ واپس اپنی اصلی صورت حال پر آرہا ہے۔ سسرال والے اور شوہر (محمد نواز) دونوں ماشاء اللہ بہت ساتھ دینے والے ہیں تو اس لیے بہت

زیادہ وقت نہیں لگا نئے شہر اور نئے گھر میں ایڈجسٹ ہونے میں۔ الحمدللہ شوہر کے بارے میں جو سوچ میرے ذہن میں تھی، اس سے بڑھ کر انہیں پایا۔

اس ماہ کے پرچے کے بارے میں "پہلی شعاع" پڑھ کر ہی تھوڑا پریشان ہوگئی۔ کراچی کے موسم کے بارے میں بہت خطرناک باتیں سن رکھی ہیں۔ اب آپ نے بھی ڈرا دیا۔ دیکھیں میری پہلی گرمیاں کیسی گزرتی ہیں۔ اوہ میں نے تو آپ کو بتایا ہی نہیں کہ شادی ہو کر اسلام آباد سے کراچی آگئی ہوں۔ اب آپ کی پڑوسن ٹھہری۔ خالدہ جیلانی کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔

مصباح نوشین سے مل کر اچھا لگا اور ان کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی کہ وہ اتنی کم عمر ہیں۔ "نور القلوب" نئی سمت پر چل نکلا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ لاریب شیریں کی بیٹی ہے اور شیریں ہی صندل ہے۔ دیکھیں میرا اندازہ کتنا درست ثابت ہوتا ہے۔

"شام کی حویلی میں" کشف پر بہت غصہ آتا ہے۔ ذرا بھی مستقل مزاجی نہیں ہے اس بندی میں۔ "عمر یسرا" جنت کی کہانی اتنی اموشنل اف۔ افسانوں میں "خیالی پلاؤ" اور "حیرانی" بہت اچھا لگا۔ ساجدہ لطیف نے کہیں میرا مستقبل تو نہیں لکھ دیا (ہاہا......) یار دلدار اس دفعہ چپ خاص ستارہ نہ کر سکے۔ نہال بھائی کون ہیں اس میں مجھے کوئی بتا دے۔ "لوگ کیا کہیں گے" اور "سوزش دل" حالات دونوں کے ایک جیسے مگر نیت کا فرق تو انجام دونوں کے الگ۔ نیت صاف تو منزل آسان۔ "تدبیر" اتنی اچھی تربیت کرنے والی آپا کے ہوتے ہوئے بھی اقصیٰ سنبھل نہ سکی۔ خیر خون کا بھی بہت اثر ہوتا ہے۔

"زندگی کی راہ گزر" بس ٹھیک ہی لگا۔ باقی ناول وغیرہ ابھی تک نہیں پڑھ سکی صرف خط ہی پڑھے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا شادی کے بعد بظاہر کوئی اتنی خاص مصروفیت نہیں مگر پھر بھی اتنی مصروف رہتی ہوں کہ رسالہ پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ وقت تو خیر پہلے بھی بڑی تیزی سے گزرتا تھا پر اب تو بالکل ہی حد ہوگئی ہے۔ لگتا ہے صبح کے بعد ڈائریکٹ رات آجاتی ہے دن کہاں جاتا ہے پتا ہی نہیں لگتا۔ "رضوانہ وقاص" نے مجھے خوش آمدید کہا ان کا شکریہ۔ بخاری سسٹرز کا خط پڑھ کر بہت مزہ اور ہنسی آئی۔ خاص طور پر میرب کے بہانے اور ان کی دوست کا یہ کہنا کہ "اگر میں مرگئی تو زنگر میرے ختم میں رکھنا"، پڑھ کر بے اختیار ہنسی اور اپنے اسکول کالج کا زمانہ یاد آگیا۔ اس وقت ہم بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ "یہ شرارتیں نہیں بڑھاپے کا زاد راہ ہیں" دل کو لگا یہ جملہ۔ فائزہ بھٹی کافی عرصے بعد آئیں ان کو بتایئے گا کہ ان سے میری یک طرفہ دوستی بھی ہو چکی ہے۔ یاد آیا فروری کے شمارے کا "رومیو جولیٹ" بہت پسند آیا مجھے۔ لڑکیوں کو ایسے ہی ہونا چاہیے اپنی عزت نفس کا پاس رکھنے والی۔ خط بہت لمبا ہو چکا آخری دو باتیں کر رہی ہوں۔ پہلی تو یہ کہ کیا خواتین ڈائجسٹ میں مرد حضرات بھی لکھ سکتے ہیں یا پھر خاص طور پر خواتین رائٹرز کے لیے ہے۔

ج: پیاری ثانیہ! آپ کو اور محمد نواز کو شادی کی دلی مبارک باد اور دعائیں خیال رکھنے والا ہم مزاج شوہر ہو تو زندگی خوشی سے گزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین۔

سانحہ ارتحال

ہمارے ساتھی کارکن عبدالعلیم کے والد محترم عبدالوحید صاحب مختصر علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم عبدالعلیم کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

نہال بھائی، عادل کے بھائی ہیں۔
خواتین میں مرد حضرات نہیں لکھ سکتے ہیں۔ یہ صرف خواتین کے لیے ہے۔
تبصرہ بہت خوب ہے، بہت شکریہ۔

مریم انصاری تے بھاول پور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

"بندھن" مصباح نوشین کے انٹرویو نے اس شمارے کی قیمت بڑھا دی۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بہترین سلسلہ۔ "ماں" کو خالق کائنات نے اعلیٰ وارفع منصب عطا کیا ہے۔ اس کا امتحان تب شروع ہوتا ہے۔ جب وہ ساس کے رتبے پر فائز ہوتی ہے۔
بدر خلیل کا انٹرویو اچھا لگا۔ "سوزش دل" نے دل کے تاروں کو چھو لیا۔ شمیم رانی نے معاشرے کے تلخ حقائق بے نقاب کیے ہیں۔ خود غرض، ظالم ہوتا ہے۔ "بمبئی کی بانو" سانس روک کر پڑھا۔ امت العزیز شہزاد، دل موہ لیا آپ نے۔ حنا بشریٰ کے افسانے "تدبیر" نے چونکا دیا۔ اچھا تو یوں بھی ہوتا ہے۔

ج: پیاری مریم! شعاع آپ کو پسند آیا۔ ہمارے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کیا ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی قارئین کے لیے پوری محنت سے پرچا ترتیب دیتے ہیں اور قارئین کی پسندیدگی ہی ہمارا سب سے بڑا انعام ہوتی ہے۔ محفل میں شرکت کرتی رہیے گا۔

زرینہ خانم لغاری مظفر گڑھ سے لکھتی ہیں

بادامی آنکھوں والی خوب صورت دوشیزہ سرورق پر براجمان اچھی لگیں۔ آگے بڑھے حمد و نعت پڑھ کر دل کو خوش کیا۔ پیارے نبیﷺ کی پیاری باتیں نہ پڑھیں تو ہم جیسا بدقسمت کوئی نہیں ہوگا ناتا جوڑا پڑھا ہر بہن کی اپنی کہانی ہوتی ہے۔ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیجنڈ فنکارہ سے ملاقات بہت اچھا سلسلہ ہے، پچھلے دنوں قیصر نقوی سے ملاقات کرائی گئی تھی اب بدر خلیل سے ملاقات ہوئی۔ اتنی مشہور ترین سینئر فنکارہ میں اب کہاں اور کس حال میں ہیں۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے۔ "لوگ کیا کہیں گے" محنت میں عظمت ہے کہانی میں یہی بتایا گیا پرانے زمانے کی مثال ہے۔ بھوک مرنے سے تھک مرنا اچھا ہے طلوع و غروب سو سو کہانی تھی۔ خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے بریانی کو بلکہ ہوگئی واہ بھئی خوب۔ اس شمارے کی سب سے بہترین کہانی "بمبئی کی بانو" تھی، مدتوں یاد رہے گی۔ بانو بدقسمت تھی، ساری زندگی دوسروں کے لیے جیتی رہی۔ کاش بانو اور ماسٹر جی ساتھی بن جاتے "تدبیر" آپا جی نے خدا ترسی دکھائی دونوں باپ بیٹی مکار۔ گھر کے مالک بننے کی سازش کرنے لگے۔ شکر ہے آپا جی کی بچت ہوگئی۔ شام کی حویلی بور کرنے لگی ہے۔ اب کشف سونیا کی بیٹی نکل آئی۔ مسکراہٹوں میں وجہ نمبرون تھی۔ "تاریخ کے جھروکے" قانکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ "باتوں سے خوشبو آئے" بہت پیارا سلسلہ ہے۔

ج: پیاری زرینہ! بمبئی کی بانو جیسی ہزاروں کہانیاں ہمارے معاشرے میں بکھری پڑی ہیں۔ یہ کہانی بھی ان ہی میں سے ایک کہانی تھی۔ "اگر" کی بات جانے دیں۔ ماسٹر سے شادی ہو بھی جاتی تو کون سا سکھ مل جانا تھا۔ ماسٹر صاحب بھی تو کینسر کا شکار ہوئے اور دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ہر انسان اپنی تقدیر کے دکھ سکھ لکھوا کر لاتا ہے۔ تقدیر کے لکھے سے فرار ممکن نہیں۔

تسنیم کوثر کراچی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے "کچھ باتیں کچھ یادیں" پر نظر پڑی۔ خالدہ جیلانی کی وفات کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے ہم نے اپنے پڑھے قرآن پاک میں سے ایک قرآن پاک کا ثواب ان کو ایصال ثواب کر دیا ہے۔ اگر ہم غلطی پر نہیں تو کیا "کھلتا کسی پہ کیوں" کی خوب صورت محفل سجانے والی خالدہ جیلانی تو نہیں ہیں، پلیز بتایئے گا۔ اس بار امت العزیز کا ناول "بمبئی کی بانو" بہت زبردست لگا۔ اتنا طویل ہونے کے باوجود بھی بالکل بوریت محسوس نہیں ہوئی بلکہ کئی بار تو آنسو بھی نہ رک سکے۔ اس کے علاوہ حسنہ حسین کا "عمر یرا" کو بھی بہترین تخلیق کہہ سکتے ہیں کیونکہ اب اس ناول کی اسٹوری واضح ہو کر عمدہ ہوگئی ہے۔ دل سے پسند آ رہی ہے

اور بھی رخسانہ نگار عدنان تو ''شام کی حویلی'' کو بالکل منفرد موڑ پر لارہی ہیں، بہت مزا آرہا ہے۔ ''نور القلوب'' کے بارے میں کیا عرض کریں، ابھی تو ہم خود بھی گومگو کی کیفیت میں ہیں۔ بہرحال آگے دیکھتے ہیں، کیا صورت حال ہوتی ہے اور جناب افسانوں میں ''خیالی پلاؤ'' کے پلاؤ نے مزا دے دیا اور لوگ کیا کہیں گے ''نور نظر'' نے اچھا لکھا ہے۔ سچی بات ہے، ہم لوگ بس ڈرتے ہی رہتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اس کے علاوہ فریحہ اشتیاق کی کہانی ''یہ زندگی کی راہ گزر'' بہت بہت عمدہ اور شان دار لگی۔ ''سوزش دل'' بھی اچھا افسانہ تھا۔ اسی طرح حنا بشریٰ کا ''تدبیر'' بھی لاجواب رہا۔ بھئی کیا بات ہے شعاع تو دن بدن نکھرتا جارہا ہے۔

☆ پیاری تسنیم! آپ کا اندازہ درست ہے۔ اشعار کی محفل خالدہ جیلانی ہی سجاتی تھیں۔ آپ ہماری باقاعدہ قاری اور تبصرہ نگاہ ہیں۔ ہمیشہ ہی آپ کا تبصرہ بہت جان دار اور خوب صورت ہوتا ہے۔ حوصلہ افزائی اور ستائش کے لیے ممنون ہیں۔ شعاع آپ کو پسند آیا، یہ جان کر بہت بہت خوشی ہوئی۔

نورین شفیع نے چاہ باغ والا ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع پڑھتے تقریباً چودہ پندرہ سال ہوگئے، اس وقت پڑھنا شروع کیا جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر پھر بھی پڑھتے تھے، آپی نازیہ جو کہ میری نند بھی ہیں، وہ رسالے لاتی تھیں، پڑھ کر پیٹی میں چھپادیتی تھیں۔ ہمیں ہاتھ تک نہیں لگانے دیتی تھیں۔ آپی چونکہ کزن بھی ہیں، ان کے رسالے میں اور ثمینہ (آپی کی بہن) چھپ کے پڑھتے تھے، ان کی شادی ہوئی۔ سب سے پہلے رسالے اٹھا کے اپنی جہیز کی پیٹی میں رکھے اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔ وہاں جاتے ہی ان کی نندوں نے پڑھنے ہی نہ دیے، کچھ جلادیے، کچھ ادھر اُدھر پھینک دیے۔ ہم نے کہا، اب مزا آیا ہمیں تو ہاتھ تک لگانے نہیں دیتی تھیں تو وہ بچے کھچے لے کر آئیں پھر اس کے بعد 2011ء میں باقاعدہ لینا شروع کیا۔ میں اور ثمینہ اکٹھے پیسے ملا کر لیتے تھے پھر اس کی بھی شادی ہوگئی اور میری بھی۔ سب کزنوں نے پڑھنے چھوڑ دیے مگر میں نے نہیں۔ جب میری شادی نہیں ہوئی تھی، خالہ جو میری ساس ہیں۔ کہتی تھیں میرے گھر آؤ، سب سے پہلے تمہارے رسالے چھڑاؤں گی مگر میں نے موقع ہی نہیں دیا۔ اپنا فرض اچھے سے نبھایا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب میری ساس بازار جاتیں، میں لکھ کر دے دیتی، وہ لادیتی تھیں۔ ایک وقت جب نیا رسالہ آتا تھا جب تک ختم نہ ہوتا، سکون ہی نہیں ملتا تھا۔ شادی سے پہلے کی بات ہے اور ایک وقت ایسا بھی آیا، ایک کہانی کو شروع کیے پندرہ دن گزر جاتے۔ کہانی ختم ہی نہیں ہوتی۔ خریدتی ہر مہینے ہوں۔ بعض اوقات تین چار ماہ کے اکٹھے ہوجاتے مگر لیتی ضرور ہوں۔ میرے چار بچے ہیں، ایک بیٹا، بیٹی اور دو ٹونز بیٹیاں ہیں۔ میرے سرہانے والی سائیڈ پر جھولا باندھا ہوا اور ایک سائیڈ پر جھولا ایک بچہ، ایک بازو پر دوسرا، دوسرے بازو، ایک جھولا ٹانگ سے

سانحہ ارتحال

ایک اور روشن ستارہ ڈوب گیا۔

ہماری عزیز مصنفہ سیما یاسمین تجلی مختصر سی علالت کے بعد اس دار فانی سے رخصت ہوگئیں۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

سیما یاسمین بے حد محبت کرنے والی اور عمدہ اخلاق کی مالک تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت ساری خوبیوں سے نوازا تھا، بہت ذہین اور ہنسنے ہنسانے والی تھیں۔ کافی عرصہ سے انہوں نے لکھنا چھوڑ رکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں، انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔

ہلاتی، دوسرا ایک بازو۔ درمیان میں رسالہ ہاتھ میں پکڑ کر پڑھتی۔ میری دیورانیاں دیکھ کر ہنستیں کہ تھوڑا ٹائم ملتا ہے، وہ تو سکون سے گزار لیا کرو کیونکہ گھر، بچے، بھینسوں کا کام...... ان سب میں وقت نہیں ملتا۔ میرا پہلا خط اس وقت شائع ہوا تھا جس شمارے میں ''دل موم کا دیا'' شائع ہوا تھا۔

اب تبصرہ کہانیوں پر۔ فیورٹ ناول ''جنت کے پتے'' پڑھ کر اتنا سوچا، اتنا ذہن پر سوار، بس پاگل ہونے کی کسر رہ گئی تھی۔ ''رقص جنوں''، ''سرسوں کے پھول'' اور بہت سے ناول، نام یاد نہیں اور پلیز پلیز ثمرہ بخاری سے کہیں شیلی، جوادی کو لے آئیں۔ میں بہت مس کرتی ہوں۔ ''عصر یسرا'' بہت پیارا ناول ہے۔ ''نور القلوب'' میں داؤد کی شادی بہترین ہے، پسند تو وہ مہر کو کرتا ہے۔ گلے بہت اچھی ہے اور لاریب کچھ عجیب سی نہیں؟ ایویں بے چارے خوشحال خان کو پھنسادیا اور پلیز فرح سعدیہ کا انٹرویو شائع کریں اور ایک اور بات بتاؤں، میرے رسالے اتنے نئے رہتے ہیں، جیسے کسی نے ہاتھ تک نہ لگایا۔ بچوں سے کوسوں دور، کوئی مانگنے آئے تو ایک شرط پر کہ پھاڑنا نہیں اور نہ گندا ہو۔

☆ پیاری نورین! آپ کے خط کا ایک ایک لفظ آپ کی شعاع سے محبت کی گواہی دے رہا ہے۔ اتنے کاموں میں وقت نکالنا واقعی مشکل ہے۔ دل موم کا دیا 2011 میں شائع ہوا تھا۔ آپ نے تقریباً دس سال بعد ہمیں یاد کیا، اب اتنا لمبا وقفہ نہ دیجیے گا۔

آپ کی باجی کی نندوں نے بہت زیادتی کی۔ انہیں سوچنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد وہ آپ کی باجی سے محبت کی توقع رکھیں گی تو بے وقوفی ہوگی۔ محبت یا خیال بھی یک طرفہ نہیں ہوتا۔ انسان جو دیتا ہے اسے وہی جواب میں ملتا ہے۔

صفا اکبر نے خیاباں اکبر علی بہاول پور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں ماہنامہ خواتین اور شعاع کی تقریباً بلا ناغہ بارہ سال سے خاموش قاری ہوں۔ سرورق ہمیشہ کی طرح بہترین۔ ''حمد و نعت'' خوب صورت اور احادیث سبق آموز تھیں۔ خطوط پڑھنے کے بعد دل میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ''نور القلوب'' بہترین اور زبردست جا رہا ہے۔ تنزیلہ ریاض ہمیشہ کی طرح کچھ منفرد ہی لکھتی ہیں۔ ''شام کی حویلی میں'' بھی بہت زبردست جا رہا ہے۔ ''عصر یسرا'' حسنہ حسین صاحبہ کی کمال کی تحریر ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ تمام کہانیاں بھی عمدہ اور لاجواب تھیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہر دل عزیز مصنفات نمرہ احمد، عمیرہ احمد، تنزیلہ ریاض، سمیرا حمید اور ماہا ملک کے انٹرویو بھی شائع کریں تاکہ ہمیں ان کے بارے میں اور زیادہ جاننے کا موقع ملے۔

☆ پیاری صفا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ اتنی خوب صورت، صاف ستھری لکھائی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بارہ سال بعد آپ نے خاموشی توڑی ہے، اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

فہمیدہ سعید نے ساہیوال سے لکھا ہے

نصف صدی کا قصہ ہے یہ پل دو پل کی بات نہیں تو جناب جب اسکول میں اردو پڑھنا شروع کی تو ساتھ ہی گھر میں آتا اخبار امروز، نوائے وقت، زیب النساء زندگی، اردو ڈائجسٹ اور تفہیم القرآن میں سے دو چار لائن لازمی پڑھتے، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ یوں حالات حاضرہ، سیاست اور دین سے ہوتے ہوئے ہمارے ٹائم تک شعاع اور خواتین آئے اور یہ باقاعدہ پڑھنا شروع کیے۔ رسالہ پڑھنے کا شوق اپنی امی کی طرف سے ملا۔ میٹرک میں آ کے بتول میں لکھنا شروع اور پھر لمبی خاموشی کے بعد شعاع کے عید سروے میں ایک دفعہ شرکت کی اور پتا چلا کہ کبھی دوبارہ افسانہ بھی لکھ سکتے ہیں۔

رائٹرز کو تو چھوڑیں، باقاعدگی سے خط لکھنے والوں سے بھی دلی انسیت ہو جاتی ہے۔ فائزہ بھٹی کو بہت بہت مبارک۔ بھئی فائزہ جس طرح آپ نے پھولوں سے سجے کھیتوں اور خوشبوؤں کا نقشہ کھینچا ہے۔ آپ کے ماموں پر پہنچ کر صحیح بہار دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔

☆ پیاری فہمیدہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ بتول میں لکھتی رہی ہیں، ہمارے پرچوں کے لیے بھی لکھیں، ہمیں خوشی ہوگی۔

آپ کی محبتوں کے لیے ممنون ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

س۔م

س: شادی کب ہوئی؟

ج: 19 اگست 1987 زندگی مکمل بدل گئی ہجرت کا آغاز۔

س: شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج: پروین شاکر کی نظم ”میں رنگ میں سوچتی تھی“ میرے خیال میں ہر لڑکی کی ترجمانی کرتی ہے۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد نہایت لاڈلی۔ ابو کی کوئی بہن نہیں تھی۔ آٹھ بھائی تھے۔ امی کے بھی کوئی بہن بھائی نہیں تھے تو امی نے مجھے پیدا ہوتے ہی سہیلی بنالیا۔ ابو منہ سے نکلنے سے پہلے بات مان جاتے تھے۔ اتنے شان دار والدین کے گھر میں زندگی کیسی تھی۔

منوڑہ کا وسیع وعریض پھولوں پھلوں سے لدا ہوا گھر جہاں ہر سہولت موجود تھی۔ اسکول کالج میں ہم چار دوستوں کا گروپ مطالعہ ریڈیو ٹی وی کے بہترین پروگرام، چھٹیوں میں فیبرک پینٹنگ، بیکنگ فلاور میکنگ، وغیرہ کے ورسز رنگوں والا ہال سے لیے۔ آرمی کی اور رنگوں والا ہال کی لائبریریاں میری دسترس میں میں کالج کی ادبی سرگرمیوں میں اپنی دوستوں کے ساتھ بھرپور شرکت کرتی تھی پرائز بھی لیے۔

لیکچرار بننے کا خواب تھا۔ گریجویشن میں قدم رکھتے ہی جب میں نے والدین سے کہا میں نے شادی نہیں کرنی ڈھیر سارا پڑھنا ہے، آپ چھوٹی بہنوں کی شادی کردیں، ہم چار بہنیں تھیں بھائی کوئی نہیں تھا۔

بس ادھر سے میرا امتحان شروع ہوگیا۔ پیپر دے کر چھٹیوں میں ہم گجرات جھنگ روٹین میں ملنے گئے تھے، میری والدہ نے اپنی خالہ کے گھر پتا نہیں کب سے بات کی ہوئی تھی کراچی واپسی میں ایک ہفتہ تھا شادی کی ڈیٹ فکس کردی گئی۔

س: اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کی مرضی پر سر جھکایا؟

ج: رشتہ داری تھی لیکن میں ایک فیصد بھی نہیں جانتی تھی کبھی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ خالص امی کی پسند تھی امی اپنی خالہ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ یہ ان کی بڑھاپے کی اولاد تھی۔ ابو نے امی کا ساتھ دیا۔ مرحلہ بہت مشکل تھا میں نے صرف اپنے اللہ کو راضی کرنے کے لیے والدین کی رضا کے آگے سر جھکا دیا۔

س: ذہن میں جیون ساتھی کا کوئی تصور تھا نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں۔

ج: ہر لڑکی کی طرح میں بھی ایک مضبوط ساتھی، ایک چھوٹا سا اپنا گھر چاہتی تھی جسے ہم مل کر آئیڈیل گھر بناسکیں میرا آئیڈیل میرے والد تھے۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فون پر بات یا ملاقات وغیرہ؟

ج: منگنی تو پانچ چھ سال رہی لیکن میں بے خبر تھی ایک سال پہلے علم ہوا وہ عرصہ خود کو سمجھاتے اور دعائیں کرتے گزرا میں کراچی میں یہ پنڈی میں تھے ایسا کچھ نہیں ہوا۔

س: شادی سے پہلے آپ کے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟

ج: ان کے سب بہن بھائی عمر میں میرے والدین کے آگے پیچھے تھے۔ ان کو میں امی کے حوالے سے ماموں اور خالہ کہتی تھی یعنی احترام ہی احترام تھا۔ میرے ساس سسر ماشاء اللہ مومن انسان تھے۔

س: شادی کے لیے تعلیم چھوڑی یا کوئی قربانی دینا پڑی؟

ج: صرف تعلیم نہیں، میرا سب کچھ چھوٹ گیا۔ قربانی سے بڑی چیز ہجرت کی۔ کہاں کراچی کا وہ پراعتماد ماحول اور کہاں پنجاب کی روایتیں۔

س: شادی بخیر خوبی انجام پائی یا لین دین کی رسموں پر بدمزدگی ہوئی؟

ج: شادی تو مکمل نظم وضبط کے ساتھ شرعی طریقے سے ہوئی میری طرف سے میرے چچا، دادی، نانا جان امی کے تمام کزنز اور سسرال میں میرے شوہر کے والدین بہن بھائیوں کے ساتھ بھتیجوں بھانجوں نے خوب حصہ لیا البتہ میں نے رخصتی کے وقت اتنے آنسو بہائے کہ سارا میک اپ دھل گیا میرے خیال میں ایسا ریکارڈ کسی نے نہیں بنایا ہوگا۔

س: شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کیا کہا؟

ج: سب سے پہلے انہوں نے دو نفل نماز ادا کی سلام کیا اور اتنی بہترین سوبر گفتگو کی کہ میرے سارے خدشات ختم ہو گئے۔

س: شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج: سب کچھ بدل گیا جس گھر پر میری حکمرانی تھی۔ وہ سب پرایا ہو گیا آگے اپنی ذات، اپنی مرضی صفر ہوگئی۔ فرائض کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ مشغلے خیالات سب پیچھے رہ گئے۔ ایک ایک قدم سوچ کر اٹھایا کہ والدین کی تربیت پر کوئی حرف نہ آئے، میں اندر سے ٹوٹ گئی۔ سب کو راضی رکھنے کے چکر میں اپنی نیند کی قربانی سب سے زیادہ دی سسرال کا ماحول ٹوٹل چینج تھا۔ میرے ساتھ اللہ کی مدد اور میرے شوہر کا تعاون تھا۔

الحمدللہ نماز کی پابند تھی۔ سسرال میں میری ساس عملی طور پر مسلمان تھیں۔ دین سے، اللہ سے محبت میں نے اپنی ساس سے اور سالوں سیکھی لیکن یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ کسی بات کی تعریف نہیں ہوتی تھی۔ خامیاں ڈھونڈ کر نکالی جاتی تھیں۔ کسی نے نہیں سوچا کہ کم عمر ہے کس ماحول سے آئی ہے ہر بندہ امتحان لینے کے لیے تیار تھا اور پھر لفظوں کی مار، تنقید۔ جو باتیں والدین کے گھر میں آپ کی خوبیاں ہوتی ہیں وہ سسرال میں خامیاں بن جاتی ہیں۔

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج: ولیمے کی شام کو یا دوسرے دن اپنے شوہر اور ساس سسر کے کپڑے دھوئے کیونکہ سب اپنے گھر والے تھے شوہر نے اپنی جاب پر جانا تھا پنڈی۔ شادی جھنگ میں ہوئی تھی، جیٹھ کے گھر جہاں ساس سسر رہتے تھے۔

س: کیا میکے اور سسرال کے کھانے کے ذائقے میں فرق محسوس ہوا؟

ج: بہت زیادہ فرق تھا۔ اپنے گھر میں جہاں میں نے کوکنگ کے، پینٹنگ کے کورس کیے۔ امی اور چھوٹی بہن میری پسند کے کھانے بناتی تھیں۔ سسرال میں ساگ، زردہ، سوجی کا حلوہ ہر وہ چیز جو مجھے نہیں بنانی آتی تھی وہ سب کچھ یہاں بنتا تھا کچھ عرصے بعد میرے شوہر نے اور ساس نے وہ ساری چیزیں بنانی مجھے سکھادیں۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کن پر تنقید ہوئی؟

ج: تعریف کرنے کی ان کی عادت ہی نہیں تھی البتہ تنقید قدم قدم پر ہوئی۔ ان کے مزاج کے مطابق ڈھلنے میں پوری زندگی داؤ پر لگادی لیکن سامنے کسی نے تعریف نہیں کی۔ البتہ دوسرے لوگوں سے کرتے تھے۔ یہ بھی مقام شکر ہے۔

س: سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا گھریلو، خاندانی زندگی میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی؟

ج: ہرگز نہیں میرے آتے ہی ان کے بچوں کے رشتوں کا سلسلہ شروع ہوا کسی نے کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ میرے شوہر کو بلا کر علیحدگی میں بات ہوتی۔ ایک دوبار کوشش کی رائے دینے کی لیکن پھر جلد ہی توبہ کرلی خود کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں مگن کرلیا۔

سارے معاملات اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیے اسے اپنا دوست بنالیا۔ الہدیٰ میں ایڈمیشن لیا اپنے کام سے کام رکھا۔ الحمدللہ آج میرے ساتھ کوئی پچھتاوا نہیں۔

س: پہلے بچے کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی ہے اس موقع پر سسرال میں کوئی دشواری؟

ج: میری زندگی کا سب سے خوب صورت لمحہ میرے تمام صبر کا اجر دنیا میں جو ملا۔ وہ میرے پہلے بیٹے کی پیدائش ہے۔ کراچی امی سے ملنے گئی وہیں معلوم ہوا تو امی نے مجھے آنے نہیں دیا۔ اپنے شوہر کو میں پنڈی میں اپنا گھر بنانے میں مصروف کر آئی سارا زیور بچت لگا کر ایک چھوٹا سا پلاٹ لیا۔ ایک کمرہ کچن باتھ روم بنا کر جب اس گھر میں آئی تو میرا بیٹا چھ ماہ کا تھا۔ دو سال امی ابو کے پاس رہی۔ میرے ماموں نہیں تھے بھائی بھی نہیں تھا تو پہلے بیٹے ارسلان کی آمد اور دو سال بعد دوسرا بیٹا عمر پھر بیٹی آمنہ اور پھر بیٹا ہارون ان کے ساتھ میں بہت مضبوط اور اندر سے انتہائی عاجز بن گئی۔ یہ نعمتیں میرے والدین، ساس سسر کی خدمت دعاؤں کی بدولت ملی ہیں۔

س: آپ جوائنٹ فیملی میں رہنا پسند کرتی ہیں یا علیحدہ؟

ج: یہ لوگوں پر، ماحول پر ڈیپنڈ کرتا ہے اگر والدین حیات ہیں، بہن بھائی چھوٹے ہیں تو یہ آپ کے فرائض ہیں آپ سوچیں بھی مت علیحدہ ہونے کا، قربانی بھی آپ کو دینی ہے یہی تو امتحان ہیں ہاں اگر وہ شادی شدہ ہیں تو آپ علیحدہ ہو کر بھی ان سے پیار محبت سے ملتے رہیں۔ صلہ رحمی سب سے مشکل عمل ہے اسی کا اجر ہے دنیا میں بھی آخرت میں بھی، اگر یہ نہیں ہے تو آپ کی عبادت بھی قبول نہیں ہوگی۔

بھائیوں کو، بہنوں کو، جو آپ کے دیور جیٹھ ہیں اور نندیں ہیں، ان کو جوڑ کر رکھیں۔ ان کی زیادتیوں کو اگنور کرتے جائیں ان شاء اللہ بہترین صلہ ملے گا اللہ کی طرف سے۔

س: آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی، آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟

ج: میں نے عمل کر کے الحمدللہ مثال بنائی ہے میرے گھر میں دو بہوویں آچکی ہیں، بڑی نے اپنا ایم فل میرے گھر میں مکمل کیا۔ ایک پوتی ہے اسے بھی سنبھالتی ہوں، گھر کے کام جتنے میں کر سکتی ہوں مکمل خوشی سے کرتی ہوں۔ ان کی پسند ناپسند کا مکمل خیال کرتی ہوں۔ اپنی بیٹی سے زیادہ ان کے ساتھ سارے معاملات ڈسکس کرتی ہوں۔ آج میرا گھر ماشاء اللہ مثال ہے، میرے بیٹوں کے چہرے پر سکون ہیں۔ میری بیٹی کو بھابھیوں کی صورت میں بہنیں مل چکی ہیں۔ یہ سب کچھ آسان نہیں ہے بس اپنی انا کو قربان کر دیں فرائض یاد رکھیں حقوق چھوڑیں، اللہ سے دوستی مضبوط کریں۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ

"اور جو توفیق دی صرف اللہ نے دی میں نے اس پر توکل کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتی ہوں۔"

خودکشی

حال ہی میں برطانوی شاہی خاندان کے چھوٹے شہزادے ہیری اور ان کی اہلیہ نے امریکی ٹی وی اسٹار اوپرا ونفرے کو انٹرویو دیا تھا۔

مذکورہ انٹرویو کے لیے اوپرا ونفرے کے پروڈکشن ہاؤس کو سی بی ایس ٹیلی وژن نیٹ ورک نے 90 لاکھ امریکی ڈالر یعنی پاکستانی سوا ارب روپے کی رقم مہیا کی۔

اس انٹرویو میں میگن مرکل نے شاہی محل میں نسلی امتیاز اور وہاں پر قیدی کی طرح زندگی گزارنے سے اپنی ذہنی صحت پر پڑنے والے اثرات پر کھل کے بات کی تھی۔

اسی طرح شہزادہ ہیری نے بھی بتایا کہ وہ اور ان کی اہلیہ شاہی محل میں کس قدر مجبور تھے (کس قسم کی مجبوری؟)۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش سے قبل ہی شاہی محل میں یہ چہ میگوئیاں ہونا شروع ہوگئی تھیں کہ نہ جانے ان کے بچے کی رنگت کتنی سیاہ ہوگی۔

میگن مرکل نے بتایا کہ غلط خبروں اور شاہی محل میں نسلی امتیاز جیسی باتوں پر انہوں نے خودکشی کا بھی سوچا تھا (اوہو پریشانی کی کیا بات ہے، پاکستانی سسرالوں میں تو یہ عام بات ہے)۔

فیصلہ

درجنوں ڈراموں میں اداکاری کے ذریعے اپنی صلاحیتیں منوانے والی سینئر اداکارہ شائستہ جبیں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ انہوں نے بتایا کہ بچپن میں ہی کیوں کہ والد کا انتقال ہوگیا تھا لہٰذا کام کر کے وہ اپنی فیملی کو سپورٹ کرتی تھیں۔ شوبز انڈسٹری میں کام کرنے والی آج تک وہ اپنے خاندان کی پہلی اور آخری خاتون ہیں۔ انہیں خاندان میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا اور نہ ہی یہ بتایا جاتا تھا کہ شائستہ ان کی رشتہ دار ہیں۔ شاید اب تو خاندان میں کوئی انہیں اپنا رشتہ دار کہہ دیتا ہوگا لیکن پہلے تو ہرگز ایسا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کبھی انڈسٹری میں اپنے خاندان کا ذکر نہیں کیا کہ جب کوئی مجھے پسند نہیں کرتا تو میں کیوں ان کا ذکر کروں۔ شادی کے متعلق شائستہ جبیں کا کہنا ہے کہ اب تک شادی اس لیے نہیں کی کہ دوسروں کو دیکھ دیکھ کر عبرت حاصل ہوگئی ہے۔ آج تک میں نے بہت کم لوگوں کو خوش گوار زندگی گزارتے دیکھا ہے ورنہ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ شوہر خراب ہے تو بیوی رو رہی ہے اور اگر شوہر اچھا ہے اور بیوی خراب ہے تو شوہر رو رہا ہے (کہیں کہیں سب اچھا بھی ہے) حتیٰ کہ اپنے گھر میں، میں اپنے بھائی کو دیکھ کر کہتی ہوں کہ تم لوگ ہی ہو جن کو دیکھ کر میں نے شادی نہیں کی (یعنی؟)۔

اہمیت

ایمن خان شادی کے بعد سے اسکرین سے دور

ہیں۔ان کے مداح انہیں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ایمن خان فی الحال زندگی کو انجوائے کر رہی ہیں۔اداکاری سے متعلق ایمن کا خیال ہے کہ انہوں نے دو تین سال میں دن رات کام کیا ہے۔یعنی صبح اٹھے، میک اپ کیا شوٹ پر چلے گئے۔ واپس آئے، منہ دھویا اور سو گئے۔

ایمن کا کہنا ہے کہ میں وقت کو محسوس کر رہی ہوں، جان رہی ہوں کہ زندگی کیا ہے۔ میں بطور چائلڈ اسٹار بچپن سے کام کر رہی ہوں۔ ہماری عمر کی لڑکیاں جب اچھے اچھے بیگ لے کر یونی ورسٹی جا رہی ہوتی تھیں، ہم اس وقت بھی شوٹ پر جا رہے ہوتے تھے۔ہم نے دیکھا ہی نہیں زندگی کیا ہے (یہ کس کا قصور ہے ایمن!)۔اب جب تھوڑا وقت ملا ہے تو میں اسے انجوائے کرنا چاہتی ہوں، کام تو تھوڑا بہت چلتا رہتا ہے۔

ابھی تو میری بیٹی بہت چھوٹی ہے۔ مجھے اسے وقت دینا ہے۔ میرے لیے میری فیملی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے (لیکن کبھی کبھی وقت گزر بھی جاتا ہے)۔

مایوس

پاکستان میں نام نہاد عورت مارچ کی باتیں کی جاتی ہیں۔لیکن شاید اس میں شریک ہونے والے یا اس کی حمایت کرنے والے ہی سب سے زیادہ اسے متنازعہ بناتے ہیں۔

گزشتہ برس ماروی سرمد اور خلیل الرحمٰن قمر کے درمیان جو تنازع ہوا اس کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے (بلکہ سنائی جا رہی ہے)۔عائشہ عمر نے بھی خلیل الرحمٰن قمر کی مخالفت کرتے ہوئے خاصی برہمی کا اظہار کیا تھا۔

عائشہ عمر نے اس بارے میں اپنے حالیہ انٹرویو میں کہا ہے کہ "چاہے آپ فیمنزم کی بات کر رہے ہوں یا کسی اور چیز کی۔اس کا ایک ادب و سلیقہ اور طریقہ ہوتا ہے جس کی پیروی کرنی ہوگی۔ آپ کسی دوسرے کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتے۔ لوگوں کی بے عزتی نہیں کر سکتے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ واقعی غلط تھا۔ میں حیران تھی کیوں کہ میں خلیل الرحمٰن قمر صاحب کی بہت عزت کرتی ہوں (اور ماروی سرمد کی؟) اور جب انہوں نے ایسا کیا تو میں بہت مایوس ہوئی۔"

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆حمزہ علی عباسی نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کا پہلا ڈرافٹ مکمل کر لیا ہے۔ یہ کتاب وحدانیت اور خدا کے حوالے سے لکھ رہے ہیں۔

(جہانِ فن۔ اخبارِ جہاں)

☆

امتہ الصبور

قصہ کرشن اور اس کی گوپیوں کا 5.771 قبل مسیح

اس امر کا تعین شاید کبھی نہ ہو سکے کہ ہندو دیوتاؤں نے کب جنم لیا یا یہ کتنے قدیم ہیں۔ اس کی ایک سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ جب تک کائنات کی تخلیق کے درست سن و سال معلوم نہیں ہو پاتے، تب تک ان کی قدامت کا صحیح اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ہندوؤں کے ہاں متعدد ایسی اساطیری کہانیاں موجود ہیں جن میں دیوتاؤں کو کائنات اور اس سے منسلک اشیاء کی تخلیق میں مصروف دکھایا گیا ہے لیکن ہندوؤں کے عقائد اور ان دیو مالائی کہانیوں کے سوا، اس کے کوئی سائنسی شواہد موجود نہیں۔ کائنات کسی دیوتا کا شاہکار ہے یا اس کے کسی بھی جزو کی تخلیق میں کوئی دیو مالائی طاقت کارفرما رہی ہے۔

کرشن ہندو دیو مالا کا سب سے زیادہ دلفریب، محبوب اور پوجا جانے والا کردار ہے۔ اسے بھی دیوتا کا درجہ حاصل ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ وشنو کا آٹھواں روپ یا اوتار تھا۔ عرف عام میں کرشن کو ماکھن چور کہا جاتا ہے۔ جبکہ گوپیوں یعنی گوالنوں سے اس کی چھیڑ چھاڑ اور ایک مخصوص گوپی رادھا سے حد درجہ التفات ہندو دیو مالا کا پسندیدہ موضوع ہے۔ کرشن، بانسری بجانے کا ماہر تھا۔ چنانچہ وہ بانسری کی مدھر تانیں فضا میں بکھیرتا تو گوپیاں خود بخود اس کی طرف کھنچی چلی آتیں ہیں۔

کرشن کی کہانی کا آغاز متھرا نامی شہر سے ہوتا ہے جو آج بھی اسی نام سے ہندوستان میں موجود ہے۔ دریائے جمنا کے کنارے واقع یہ شہر یادیو خاندان کی حکومت کی راجدھانی تھا۔ یادیو بنیادی طور پر گلہ بان تھے لیکن رفتہ رفتہ اپنے علاقے کے حکمران بن گئے۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ کا نام اگرسین تھا، جسے اس کے بیٹے کنس نے اسے معزول اور قید کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اگرسین کے بھائی کا نام دیوک تھا جس کی ایک بیٹی کا نام دیوکی بتایا گیا ہے۔ بعض واقعہ نگاروں نے دیوکی کو کنس کی سگی بہن بتایا ہے۔ دیوکی کی شادی واسودیو نامی ایک شخص سے کی گئی جو سوریاسین کا بیٹا اور اگرسین کی طرح یادیو خاندان سے ہی تعلق رکھتا تھا۔

شادی کے بعد دیوکی اور واسودیو کو کنس اپنے شاہی رتھ پر بٹھا کر دلہا کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ جوں ہی وہ متھرا کی حدود میں داخل ہوا تو غیب سے ایک آواز سنائی دی جو کنس سے مخاطب تھی۔

"او بے وقوف بادشاہ! جس دلہن کو تم چھوڑنے جا رہے ہو۔ اسی کے آٹھویں بیٹے کے ہاتھوں تمہاری موت لکھی جا چکی ہے۔"

کنس نے فوری ردعمل کے طور پر رتھ روک دیا اور دیوکی کو پکڑ لیا تاکہ موقع پر ہی اس کا کام تمام کر دے لیکن بہنوئی درمیان میں آ گیا۔ اس نے کنس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ دیوکی کی جان بخشی کر دے تو وہ ہر پیدا ہونے والا بچہ اس کے حوالے کر دے گا۔ واسودیو کی منت سماجت پر کنس نے دیوکی کو چھوڑ دیا اور بظاہر مطمئن ہو کر دونوں کو ان کے گھر پہنچا آیا۔ لیکن کسی بھی متوقع خطرے سے نمٹنے اور حفاظتی اقدامات کے طور پر اس نے دونوں کو قید کر دیا اور اپنے وفادار سپاہیوں کو ان کی نگرانی پر متعین کر دیا۔

اب کنس نے وطیرہ بنالیا کہ دیوکی کے ہاں جونہی کوئی بچہ جنم لیتا وہ فوری طور پر اسے مار ڈالتا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے چھ معصوم بچے قتل کر دیے گئے۔ جب ساتویں دفعہ دیوکی حاملہ ہوئی تو معجزانہ طور پر بچہ اس کے رحم سے واسودیو کی دوسری بیوی روہنی کے جسم میں منتقل ہو گیا۔ روہنی، کنس کے ڈر کی وجہ سے دریائے جمنا کے دوسرے کنارے واقع قصبے گوکل (بعض واقعہ نگاروں نے اس کا نام گوکلم تحریر کیا ہے) میں مقیم تھی۔ چنانچہ دیوکی کے اس بیٹے نے روہنی کے بطن سے جنم لیا۔ یہی بلرام تھا۔

دیوکی آٹھویں بار حاملہ ہوئی۔ یہ آٹھواں بچہ بھی قید خانے میں پیدا ہوا۔ اس وقت نصف شب گزر چکی تھی۔ اچانک وشنو دیوتا کوٹھڑی میں نمودار ہوا اور چھوٹا سا کمرہ روشنی سے منور ہو گیا۔ دونوں میاں بیوی فوراً سمجھ گئے کہ پیدا ہونے والا بچہ معمولی نہیں بلکہ خود دیوتا نے انسانی روپ میں جنم لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ عین اس وقت جب دیوتا نے قید خانے میں جنم لیا۔ گوکل کے ایک شخص نندا کی بیوی یشودھا کے ہاں لکشمی دیوی ایک بیٹی کے روپ میں پیدا ہوئی۔

ابھی دیوکی اور واسودیو صورت حال پر غور ہی کر رہے تھے کہ واسودیو کو دیوتا کی آواز سنائی دی۔

”اپنے بچے کو جمنا کے پار گوکل لے آؤ اور اسے یشودھا کی بیٹی سے تبدیل کر لو۔ اس کے بعد تم فوری قید خانے میں لوٹ آؤ گے تاکہ لوگوں کو تمہارے آنے کے بعد پتا چلے کہ دیوکی نے آٹھویں بچے کو جنم دیا ہے۔“ واسودیو نے فوراً بچے کو اپنی بانہوں میں اٹھالیا (بعض روایوں میں ہے کہ ایک ٹوکری میں رکھ لیا) اور قید خانے کے دروازے کی جانب چل پڑا جو خود بخود اس کے لیے کھلتے چلے گئے۔ جب وہ باہر نکلا تو اس نے تمام محافظوں کو بھی گہری نیند میں پایا۔ واسودیو کسی مداخلت یا روک ٹوک کے بغیر جمنا کے کیچڑ زدہ کنارے تک پہنچ گیا۔ دریا بھی فوری طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور واسودیو درمیانی راستے سے گزر کر دوسری جانب چلا گیا۔ گوکل والے بھی گہری نیند میں تھے لہٰذا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور واسودیو نے اپنا بچہ یشودھا کے پہلو میں لٹایا اس کا بچہ اٹھایا اور متھرا لوٹ آیا۔

جونہی واسودیو نے یشودھا کی بیٹی کو اپنی بیوی کے پاس لٹایا قید خانے کے کھلے دروازے بند ہو گئے اور پہرے داروں کی آنکھ کھل گئی۔ دوسری جانب گوکل میں ایک جشن کا سماں تھا۔ قصبے کا ہر شخص نندا کے ہاں بیٹے کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ جشن کے گیارہویں دن رشیوں نے بنیادی رسومات ادا کیں اور بچے کا نام کرشن تجویز کیا۔

کہتے ہیں کہ بلرام کا رنگ گورا اور کرشن کا کالا تھا۔ بلرام قد آور اور گٹھیلا تھا جبکہ کرشن دبلا پتلا لیکن پھرتیلا شہ زور تھا۔ دونوں بھائی راجہ نگری کے علاقے کی گوپیوں کی جان تھے۔ کرشن تو بطور خاص انہیں پسند تھا۔ ان کی رسوئیوں میں رکھے برتنوں سے مکھن چرا لیتا۔ چوری چھپے دودھ پی جاتا اور بھینسوں کو عین اس وقت ان کو کھونٹوں سے کھول دیتا جب گوپیاں یا گوالے ان کا دودھ دوہنے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود گوپیاں، کرشن کی حرکتوں سے محظوظ ہوتی تھیں۔ اس کی شکایت کرنے یشودھا کے پاس بھی آتیں۔ وہ اسے بتاتیں کہ کرشن کس طرح ان کا مکھن اور دودھ چوری کر کے دوستوں کے ساتھ کھاتا پیتا ہے۔ برتن خالی ملیں تو توڑ ڈالتا ہے۔ اگر دودھ کے کٹورے رسیوں کے ساتھ چھت سے لٹکا دیے جاتے ہیں تو پتھر مار کر نیچے سے برتن توڑ ڈالتا ہے اور سوراخ سے گرنے والا دودھ ہتھیلیوں کا کٹورا بنا کر پی جاتا ہے۔ وہ یشودھا کو یہ بھی کہتیں کہ تم نے شرارتی بچہ پیدا کیا ہے۔

کرشن نے گوکل میں بڑی پرتعیش اور رنگین

زندگی گزاری۔ کہتے ہیں کہ کرشن بانسری بہت اچھی بجاتا تھا۔ چنانچہ جب اس کی بانسری کی مدھر تانیں فضا میں بکھرتیں تو گوپیاں خود بخود اس کی طرف کھنچی چلی آتیں۔ کرشن ان کے ساتھ خوش رہتا اور انہیں تنگ بھی کرتا۔ ہندو شعراء اور ادباء نے کرشن کی ان حرکتوں کو کرشن کی "راس لیلا" کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔ یوں تو کرشن تمام گوپیوں سے دل بہلایا کرتا تھا لیکن رادھا نامی گوپی اسے بے حد پسند تھی اور وہ اس پر خاص توجہ دیتا تھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ کرشن رادھا سے پیار کرتا تھا۔ دونوں کی محبت کے حوالے سے بھی کئی داستانیں ہندو ادب میں لکھی جاچکی ہیں۔

کرشن نے یشودھا کو بھی بے حد ستایا۔ کرشن کے ایک بھگت میرابائی نے اپنے گرو کی شرارتوں پر بہت سی نظمیں لکھیں۔ ان میں سے ایک نظم "میا موری، میں ناہی ماکھن کھایو" بے حد مشہور ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کرشن اپنی ماں یشودھا کے سامنے صفائی پیش کرتا ہے کہ وہ گوپیوں کے مکھن کی چوری کا ذمہ دار نہیں۔

کرشن کی کہانیاں گوکل سے نکل کر متھرا تک جا پہنچیں اور لوگوں کو پتا چل گیا کہ وہی دیوکی کا آٹھواں بیٹا ہے جس کے ہاتھوں کمس کی موت کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ لوگ کرشن کی شرارتوں کی کہانیاں سنتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب کرشن اپنے ہاتھوں کمس کو موت کے گھاٹ اتارے گا۔ کمس کو بھی اب یقین ہو چلا تھا کہ کرشن ہی اس کی موت کا ذمہ دار ہوگا چنانچہ اس نے ایک عظیم الجثہ بیل، پاگل گھوڑے اور دوسری بلاؤں کو کرشن کے پیچھے بھیجا لیکن کرشن نے ان سب کو مار ڈالا۔

ہر طرف سے ناکام ہو کر کمس نے ایک اور منصوبہ تیار کیا۔ اس نے متھرا میں ایک مقابلہ منعقد کرانے کا اعلان کیا۔ ہر شہری کو اس ٹورنامنٹ میں شریک ہونا تھا۔ کمس نے اپنے قاصد کرور کے ذریعے بلرام اور کرشن کو بھی ٹورنامنٹ میں بلایا۔

جونہی دونوں میدان میں داخل ہوتے ایک پاگل اور شہ زور ہاتھی انہیں اپنے پیروں تلے کچل ڈالتا۔ اگر دونوں بھائی اس سے بچ نکلتے تو چانور اور مشتیک نامی دو پہلوان انہیں مقابلے کی دعوت دیتے اور کشتی کے بہانے دونوں کو مار ڈالتے۔

اسٹیڈیم کے دروازے پر ایک بہت بڑی کمان رکھی گئی تھی جسے کرشن نے پلک جھپکنے میں اٹھا کر دو ٹکڑے کر دیا۔ محافظوں نے کرشن کو گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور دونوں بھائی فاتحانہ انداز میں اندر داخل ہوئے۔ منصوبے کے مطابق پہلے پاگل ہاتھی کو ان پر چھوڑا گیا۔ ہاتھی نے کرشن کو اپنی سونڈ میں جکڑ لیا بعد میں کرشن نے ہاتھی کا دانت توڑ کر اسی کے پیٹ میں گھونپ دیا جس سے وہ موقع پر ہی مر گیا۔ اس طرح کرشن اور بلرام نے دونوں پہلوانوں کو بھی بری طرح شکست دی۔ کمس اپنے منصوبے پر یوں پانی پھرتے دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے چلا کر حکم دیا کہ برینداون سے آنے والے تمام افراد کو گرفتار کر لیا جائے لیکن کرشن نے اپنی تلوار نکالی اور پھرتی سے وہاں پہنچ گیا، جہاں کمس کھڑا احکامات صادر کر رہا تھا۔ کرشن نے کمس کو بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا میدان میں لے آیا اور چشم زدن میں اپنی تلوار سے اس کی گردن کاٹ ڈالی۔

پیش گوئی پوری ہو گئی اور کمس دیوکی کے آٹھویں بیٹے کرشن کے ہاتھوں مارا گیا۔ اگر سین کی نظر بندی ختم کر کے اسے دوبارہ تخت پر بٹھایا گیا اور یادیو، رشنی، مادھو، اندھاک، دسر کاس اور کگر اقبائل کے جو لوگ کمس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر متھرا سے چلے گئے تھے، واپس آ گئے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

رمضان المبارک کے بابرکت مہینہ کا آغاز ہورہا ہے۔ رمضان المبارک میں خصوصی عبادات کے ساتھ کھانے پینے کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ افطار پارٹی پر ایک دوسرے کو بلایا جاتا ہے اور عام دنوں کی طرح سب سے بڑا مسئلہ کہ افطار میں کیا کیا بنایا جائے، مشکل ہوجاتا ہے۔ بہنوں کی اس مشکل کو آسان کرتے ہوئے ہم نے کوشش کی ہے کہ کچھ ایسی تراکیب بتائی جائیں جس سے آپ کو افطار بنانے میں آسانی ہو اور ساتھ ہی نت نئی تراکیب سے لطف اندوز بھی ہوسکیں۔

قیمہ بھرا پراٹھا

اشیاء:۔

قیمہ	آدھا کلو
چنے کی دال	آدھی پیالی
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ثابت لال مرچ	دس عدد
لہسن	آٹھ سے دس جوے
ادرک	حسب ضرورت

ترکیب:۔

قیمہ میں چنے کی دال، ثابت گرم مسالا، ثابت لال مرچ، لہسن اور ادرک ڈال کر ابال لیں اور پیس کر ایک طرف رکھ دیں۔

پراٹھے کے لیے:۔

سفید آٹا	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
گھی	دو کپ
نیم گرم پانی	حسب ضرورت

ترکیب:۔

آٹے میں نمک اور تیل ڈال کر مکس کریں اور اسے نیم گرم پانی سے گوندھ کر آدھے گھنٹہ کے لیے رکھ دیں۔ مناسب سائز کے پیڑے بنالیں۔ روٹی بیل کر تیار کی ہوئی قیمے کی فلنگ اس میں رکھ کر دوبارہ پیڑا بنالیں۔ اس کے بعد پراٹھا بیلیں اور توے پر گھی لگا کر پراٹھا فرائی کرلیں اور اچھی طرح سینک لیں۔ دہی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

چھولے چاٹ

اشیاء:۔

کابلی چنا	ایک پاؤ
آلو	ایک پاؤ
پیاز	آدھا پاؤ
ٹماٹر	ایک پاؤ
پیاز	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
املی کا پانی	آدھا کپ

ترکیب:۔

چھولوں کو رات کو بھگو دیں۔ سوڈا ڈال کر ابال لیں۔ آلو کو کاٹ کر تھوڑی ہلدی ڈال کر ابال لیں۔ آلو، ہرا مسالا، ٹماٹر باریک کاٹ لیں، پیاز چھلے کی شکل میں کاٹ کر علیحدہ رکھیں، باقی سب چیزیں ملالیں۔ تھوڑے آلو، تھوڑے ٹماٹر، پیاز اور ہرا مسالے سے سجا کر پاپڑی کے ساتھ پیش کریں۔

دال کی کچوری

اشیاء:۔

میدہ	دو پیالی
تیل	تلنے کے لیے
گھی	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

بھرنے کے لیے:۔

ابلی ہوئی چنے کی دال	ایک پیالی
ثابت لال مرچ	تین سے چار عدد
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:۔
ایک برتن میں میدہ، گھی اور نمک شامل کرکے گوندھ لیں۔ ابلی چنے کی دال، زیرہ، ثابت لال مرچ اور نمک شامل کرکے پیس لیں۔ اب گوندھے ہوئے آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنالیں اور اس میں پسی ہوئی چنے کی دال کا آمیزہ بھر دیں اور کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیں، اس کے بعد بیل لیں۔ ایک پین میں تیل گرم کریں اور ہلکی آنچ پر کچوریاں تل لیں۔ پھر نکال کر چٹنی کے ساتھ یا آلو کی ترکاری کے ساتھ مزے لے کر کھائیں۔

میٹ سموسے

اشیاء:۔

میٹ بنانے کے لیے:۔

میدہ	دو کپ
گھی	آدھا کپ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
پانی	حسب ضرورت
تیل	حسب ضرورت

بھرنے کے لیے:۔

آلو	آدھا کلو
ہرا دھنیا	آدھا کپ
ہری مرچیں	دو عدد
پیاز	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
بھنا زیرہ، دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
پسی کھٹائی	ایک چائے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
پسی ہلدی	چوتھائی چائے کا چمچہ

ترکیب:۔
میدہ چھان کر اس میں گھی، نمک، اجوائن شامل کردیں۔ پانی ڈال کر سخت آٹا گوندھ لیں۔ تھوڑی دیر ڈھک کر چھوڑ دیں۔
بھرنے کے لیے:۔
آلو ابال کر مسل لیں۔ آلو میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں، باریک پیاز، نمک، کٹی مرچ، زیرہ، کھٹائی، پسی ہلدی، تیل ملادیں۔ آٹے کے دو حصے کے پیڑے بنالیں اور باریک بیل لیں۔
اب چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ اس پر آلو کا آمیزہ رکھ کر مولڈ کردیں، سموسے بنالیں۔ اب دوسرے پیڑے کو بیل کر پٹیاں کاٹ لیں۔ اب سموسے پر پٹیاں لگائیں، کنارے دبا دیں۔ گرم تیل میں تل لیں، رمضان میں بہت مزا دیں گے۔

پوٹیٹو پیزا

اشیاء:۔

ڈو کے لیے:۔

ابلے ہوئے آلو	آدھا کلو
مکھن	پچیس گرام
بریڈ کرمبز	آدھا کپ
چکن کیوب	ایک عدد

ٹاپنگ کے لیے

چیڈر چیز	چوتھائی کپ
موزریلا چیز	آدھا کپ
کیچپ	آدھا کپ
ٹماٹر	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
کٹی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پیپریکا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:۔
آلو ابال کر چھیل لیں اور گرم گرم میش کرتے ہوئے چکن کیوب ملالیں۔ ساتھ ہی بریڈ کرمبز اور مکھن ملالیں۔ پیزا پین کو چکنا کریں۔ اس پر آلو کا آمیزہ پھیلالیں۔ آلو کے اوپر کیچپ پھیلا کر لگائیں۔ شملہ مرچ، پیاز، ٹماٹر کے ٹکڑے رکھیں، اوپر سے کٹی ہوئی لال مرچ، پیپریکا پاؤڈر، اجوائن چھڑک کر چیڈر چیز اور موزریلا چیز کدوکش کرکے ڈال کر پہلے سے گرم اوون میں پندرہ سے بیس منٹ تک بیک کریں۔

اوون نہ ہو تو توے یا دیگچی میں بنا لیں۔ مزیدار پوٹیٹو پیزا ــــ سرونگ ڈش میں نکالیں اور سلائس کاٹ کر پیش کریں۔

آلو کے منفرد پکوڑے

اشیاء:۔

آلو	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
بیسن	ایک کپ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:۔

آلو ابال کر کیوبز میں کاٹ لیں۔ اوپر تھوڑا سا نمک، پسی لال مرچ چھڑک کر ٹھنڈا کر لیں۔ بیسن میں نمک اور بقیہ لال مرچ ڈال کر گھول لیں۔ اب اس میں آلو ڈال کر مکس کر کے گرم تیل میں پکوڑے تل لیں۔

پائن ایپل سوفلے

اشیاء:۔

انناس کا رس	آدھا کپ
انناس کے ٹکڑے	ایک کپ
انڈے	تین عدد
کریم	چوتھائی کپ
جیلٹین	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
انناس کا ایسنس	حسب ضرورت

ترکیب:۔

کریم کو پھینٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔ ایک برتن میں پانی گرم کریں اور اس پر جیلیٹن کا برتن رکھ کر جیلیٹن کو پگھلا لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ انڈے کی سفیدی کو پھینٹ لیں، اس میں زردی اور چینی ڈال کر بیٹ کریں۔ اس کے بعد جیلیٹن، کریم اور انناس کے ٹکڑے رس سمیت شامل کر دیں۔ اچھی طرح فولڈ کر لیں۔ پیالے میں ڈال کر فریز میں رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو فریج سے نکال لیں، اس پر کریم کے پھول اور انناس کے ٹکڑے ــــ سجا دیں اور عید پر مہمانوں کو پیش کریں۔

بیف رائس میکرونی و مکس تھیپل

اشیاء:۔

گوشت کی بوٹیاں	آدھا پاؤ
گاجر	ایک عدد
ترئی	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
کٹی سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن کے جوے	دو عدد
تیل	تین کھانے کے چمچے
چاول	ایک کپ
ابلی ہوئی میکرونی	ایک کپ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

ایک برتن میں تیل گرم کریں۔ اس میں گاجر، ــــ ترئی اور لہسن ڈال کر تل لیں۔ اس کے بعد اس میں گوشت ڈال کر ہلکا سا تل کر چاول، میکرونی، نمک، سیاہ مرچ، سرکہ، سویا سوس ڈال کر مکس کر کے دو تک منٹ تک دم پر رکھیں اور پیش کریں۔

نمک پارے

اشیاء:۔

میدہ	ایک کپ
پسی کالی مرچ	ایک چوتھائی چمچہ
نمک	حسب ضرورت
کھانے کا سوڈا	دو چٹکی
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:۔

میدے میں نمک، سوڈا، کالی مرچ اور ایک چائے کا چمچہ تیل ڈال کر اچھی طرح گوندھ لیں۔ اب روٹی کی طرح پیڑا بنا کر بیلیں اور باریک ربن جیسی پٹیاں بنا کر ایک ایک انچ کے ترچھے ٹکڑے کاٹتی جائیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور یہ ٹکڑے ڈال کر فرائی کر لیں۔ بہتر ہو گا کسی ڈش میں ٹشو پیپر بچھا کر ان ٹکڑوں کو رکھتی جائیں تاکہ تیل جذب ہو جائے اور پھر پلیٹ میں نکال کر پیش کریں۔ ذائقہ دار، گھر کے بنے نمک پارے چائے کے ساتھ خوب مزا دیں گے۔ ☆

صحت منداور چمک دار بال

گھنے چمک دار اور تندرست و توانا بال شخصیت کو اجاگر کرنے اور اس کی خوب صورتی کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جسم کی طرح صحت مند بالوں کا انحصار بھی متوازن غذا پر منحصر ہے۔ اگر بالوں کی مناسب طریقے سے دیکھ بھال نہ کی جائے اور وہ بنیادی غذائی اجزا سے محروم رہیں تو ان کی افزائش کا عمل رک جاتا ہے اور وہ بے رونق و کمزور دکھائی دینے لگتے ہیں۔

☆بالوں کو چمک دار اور گھنا رکھنے کے لیے انہیں دھونے کے بعد کچے ناریل کا پانی لگائیں، تو بالوں میں ناقابل یقین چمک پیدا ہو جائے گی۔

☆روکھے اور مرجھائے ہوئے بالوں میں رونق لانے کے لیے چار کھانے کے چمچے دہی، دو کھانے کے چمچے مہندی اور ایک چائے کا چمچہ ناریل یا زیتون کا تیل ملا کر اچھی طرح بالوں میں لگائیں اور بیس منٹ بعد دھولیں۔ یہ عمل ہفتے میں دو تین مرتبہ ضرور دہرائیں۔ اس سے نہ صرف بال گھنے ہوں گے بلکہ ٹوٹنا اور گرنا بھی بند ہو جائیں گے۔

☆موسم گرما میں بال پسینے کی زیادتی اور گرد و غبار کی وجہ سے بہت جلدی خراب ہو جاتے ہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ بالوں کی صفائی کا خاص خیال رکھا جائے۔ ملتانی مٹی میں ذرا سا پانی ڈال کر گاڑھا سا پیسٹ بنالیں۔ اب اس میں ایک لیموں نچوڑ کر اس آمیزے کو بالوں کی جڑوں میں لگائیں اور تقریباً ایک یا دو گھنٹے بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔ اس سے نہ صرف گرمیوں میں سر کو ٹھنڈک کا احساس ہوگا، بلکہ بالوں میں موجود فالتو چکنائی بھی صاف ہو جائے گی۔

بالوں کے اکثر مسائل خشکی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، جس سے نہ صرف بال کمزور ہوتے ہیں، بلکہ تیزی سے جھڑنے بھی لگتے ہیں۔

☆اگر بالوں کو کھٹی لسی سے دھویا جائے تو اس سے نہ صرف بال نرم و ملائم ہوں گے، بلکہ خشکی بھی دور ہو جائے گی۔

☆لیموں کا رس اور ناریل کے تیل سے روزانہ بالوں کی مالش کرنے سے خشکی میں کمی واقعی ہوتی ہے۔

☆اگر خشکی یا کسی اور وجہ سے بال جھڑنا شروع ہو جائیں تو مکھن میں نمک ملا کر اچھی طرح سے سر کی مالش کریں اور پھر نیم گرم پانی سے دھوئیں، بال مضبوط اور گرنا بند ہو جائیں گے۔

☆گرتے ہوئے بالوں کو روکنے کے لیے میتھی کے بیج اور ماش کی دال کو پیس کر اس میں پانی ملائیں اور بالوں کی جڑوں میں لگائیں، یہ گرتے ہوئے بالوں کو روکنے کا بہترین آزمودہ ٹوٹکا ہے۔

☆بالوں کی خوب صورتی بڑھانے اور انہیں گھنا کرنے کے لیے بیری کے پتوں کو پانی میں پیس کر سر میں مساج کرنے سے بال گھنے ہونا شروع ہو جائیں گے۔

☆بالوں سے خشکی دور کرنے اور ان کی چمک میں اضافہ کرنے کے لیے ریٹھے کا استعمال بہترین مانا جاتا ہے۔

آدھا کپ ریٹھے کو رات بھر کے لیے نیم گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح اچھی طرح پیس کر اس کا پانی چھان کر نکال لیں۔ اب اس پانی کو براہ راست سر کی کھال پر لگا کر ہلکا ہلکا رگڑیں۔ 10 سے 15 منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر سر دھولیں، لیکن دھوتے وقت آنکھوں کو بچا کر رکھیں، کیوں کہ یہ آنکھوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔